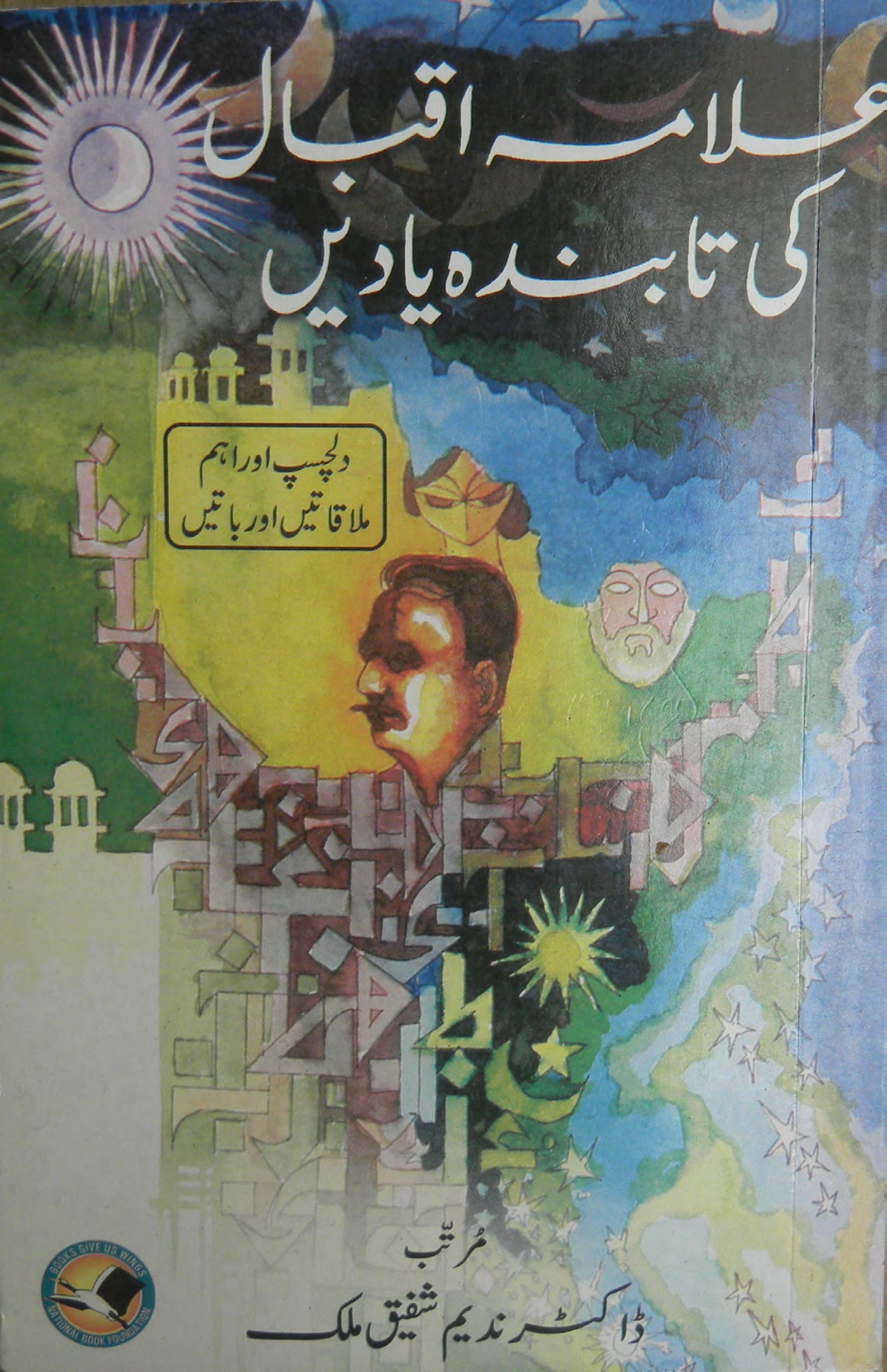
علامہ اقبال کی تابندہ یادیں



دلچسپ اور اہم
ملاقاتیں اور باتیں

مُرتّب

ڈاکٹر ندیم شفیق ملک

BOOKS GIVE US WINGS
NATIONAL BOOK FOUNDATION

فہرست

علامہ اقبال کی تابندہ یادیں

پیش لفظ

(۱)

حکیم الامت، شاعرِ مشرق اور مفکرِ پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ کا شمار اُن عالمی شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے فکری، نظریاتی اور علمی سطح پر اپنے انقلابی طرزِ احساس کے ذریعے تاریخ ساز کردار ادا کیا۔ ایک زمانہ اُن کی شاعری اور افکار کا آج بھی اسی طرح معترف اور مشتاق ہے جس طرح ان کی زندگی میں تھا بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اس رجحان میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔

حضرت علامہ کی شخصیت بلاشبہ ہمہ جہت تسلیم کی جاتی ہے جس کے بے شمار گوشے ان کے مدّاحوں کے لیے نہایت فکر انگیز محسوس ہوتے ہیں۔ کئی نامور اہلِ قلم اور دیگر اہم شخصیات نے اس باب میں اپنے تاثرات اور احساسات کا اظہار کیا جو اقبال شناسی کے حوالے سے نہایت قابلِ قدر ہیں۔

ڈاکٹر ندیم شفیق ملک نے ایسی ہی گرانقدر تحریروں کو ''علامہ اقبال کی تابندہ یادیں'' کے عنوان سے مرتب کیا جس کی اشاعت کا اہتمام نیشنل بک فاؤنڈیشن نے کیا ہے۔ اس تحقیقی کاوش کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ یہ علامہ اقبال کی شخصیت اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ اقبالیات کے شائقین اور مدّاحوں کی علمی پیاس بجھانے کے لیے بھی معاون ثابت ہوگی۔ ان مضامین کے مطالعے سے یہ حقیقت مزید اجاگر ہوتی ہے کہ علامہ اقبال اپنی ذات میں صرف انجمن ہی نہیں بلکہ ایک مکمل ادارہ اور مکتبِ فکر تھے۔

امیدِ واثق ہے کہ نیشنل بک فاؤنڈیشن کی یہ کوشش اس اعتبار سے بھی قبولِ عام کی سند حاصل کرنے میں کامیاب رہے گی کہ حضرت علاّمہ کی شخصیت، افکار اور تصوّرات کا ادراک کرنے کی آج بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی پہلے تھی۔ پاکستان سے محبت اور نظریاتی وابستگی کے اظہار کا ایک

اندازیہ بھی ہے کہ ان شخصیات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کی جائیں، جنہوں نے مملکتِ خداداد کی نظریاتی اور فکری اساس کو مستحکم اور معتبر بنایا۔

(۲)

میرے لیے یہ بات باعثِ طمانیت ہے کہ میری توقعات کے عین مطابق قارئین کی پذیرائی کے باعث اس کتاب کا پہلا ایڈیشن انتہائی قلیل مدت میں ختم ہوگیا ہے۔اب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا جارہاہےاور اُمید ہے کہ یہ بھی پہلے کی طرح مقبول ہوگا۔

(۳)

اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن شائع کرتے ہوئے مجھے اس بات کی خوشی ہورہی ہے کہ کتاب کلچر کے فروغ کے لیے این بی ایف کے ترتیب دیئے ہوئے منصوبوں کے بہترین نتائج نکل رہے ہیں۔مزید برآں اس مرتبہ یہ کتاب دو ہزار کی تعداد میں شائع کی جارہی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے استفادہ کرسکیں۔

پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق جاوید
(پرائڈ آف پرفارمینس)
مینیجنگ ڈائریکٹر

دیباچہ

تمام تر تعریفیں، حمد و ثنا اور بزرگی اللہ سبحانہ تعالیٰ کے لیے ہے جو بہت مہربان، نہایت رحم کرنے والا اور علم کا خالق ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے آخری اور محبوب پیغمبر حضرت سیدنا محمد ﷺ پر اپنی ابدی اور بے پایاں رحمتیں نازل فرمائے جو کائنات میں علم کے تقسیم کرنے والے ہیں۔

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال (۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء) کو ہماری ملی تاریخ میں ایک نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ ان کی کتب کے دنیا کی بہت سی زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔ خود حیاتِ اقبال پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مگر اب بھی ان کی زندگی کے بہت سے پہلو مخفی ہیں۔ یہ کتاب اسی کمی کو پورا کرنے کی ایک چھوٹی سی کاوش ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ علامہ اقبال کے رفقاء کی ان سے ملاقاتوں اور یادوں پر مشتمل ہے جن کا انتخاب مجلہ اقبالیات اردو، اقبال اکیڈمی لاہور، مجلہ اقبال، بزم اقبال لاہور، اور مجلہ اقبال ریویو، اقبال اکیڈمی، حیدرآباد دکن، میں چھپنے والے مضامین کا انتخاب ہے۔ میں تمام محبانِ اقبال کی جانب سے ان گرامی قدر مصنفین کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اپنی تابندہ یادوں میں ہمیں شریک کیا۔ ان مجلوں کے مدیران بھی ہمارے خراجِ تحسین کے مستحق ہیں جنھوں نے فکرِ اقبال کا چراغ روشن رکھا۔ مَیں بطورِ خاص پروفیسر محمد حنیف شاہد، ناظم بزم اقبال لاہور کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس کتاب کی تدوین کے لیے مجلہ اقبال کے پرانے شماروں کی فراہمی کو ممکن بنایا۔

ان مضامین کی تدوین کرتے ہوئے قرآنی آیات کی تصدیق اور حوالہ جات کے لیے ملک فہد قرآن کمپلیکس برائے طباعتِ قرآن کے نسخے سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ان آیاتِ مبارکہ کا ترجمہ امام احمد رضا خان کے ترجمۂ قرآن کنزالایمان سے لیا گیا ہے۔

علامہ اقبال کے کلام کے مستند متن اور حوالوں کے لیے درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے: محمد اقبال، کلیاتِ اقبال: اردو، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۷ء؛ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال: فارسی، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۴ء؛ محمد اقبال، کلیاتِ باقیات شعر اقبال: متروک اردو کلام، صابر کلوروی، مرتبہ، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۴ء؛ اور محمد اقبال، کلیاتِ اقبال فارسی: منظوم اردو ترجمہ، عبدالعلیم صدیقی، مترجم، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۲۰۰۵ء۔

تدوین کرتے وقت اِن مضامین میں شامل انگریزی الفاظ اور مختصر جملوں کی اردو میں صوتی نقل اور ترجمہ، عربی، فارسی، سرائیکی اور پنجابی الفاظ اور جملوں کا ترجمہ خطوطِ وحدانی میں شامل کیا گیا ہے۔ ہر مضمون کے مصنف کی اقبالیات پر تصانیف، اور مصنف اور موضوع سے متعلق دستیاب کتابیات کا بھی اضافہ کیا گیا ہے اور جہاں تک ممکن ہوا حوالہ جات کو یکساں طرز پر معیاری بنایا گیا ہے۔

آج زیرِ نظر مجموعہ کی تکمیل پر میرا دل جہاں اللہ رب العٰلمین کے حضور سجدہ ریز ہے، وہاں مجھ پر کئی محسنین کا شکریہ ادا کرنا بھی واجب ہے جنھوں نے اس ضمن میں میری دامے، درمے، سخنے مدد کی۔

اس کتاب کی تیاری میں مجھے اقبال اکادمی پاکستان کے کئی افسران اور عملے کے اراکین کا تعاون حاصل رہا۔ میں جناب محمد سہیل عمر کا ممنون ہوں جن کی ذاتی دلچسپی کے باعث اس کتاب کی تدوین ممکن ہوئی۔ میں جناب محمد نعمان چشتی اور جناب فہیم ارشد کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس تصنیف کی تیاری میں میری معاونت کی اور بہت سے نکات کی وضاحت کے لیے کتب خانہ اقبال اکادمی میں موجود مواد تک رسائی کے لیے میری رہنمائی کی۔ جناب محمد اسحاق بشیر، جناب محمد عثمان اکبر اور جناب میر محمد مبین نے نہایت احسن طریقے سے ٹائپ کاری کی اور جناب محمد شاہد حنیف نے اشاریہ مرتب کیا۔ میں ان تمام حضرات کا انتہائی شکر گذار ہوں۔

اس کتاب کی اشاعت کے لیے میں مینجنگ ڈائریکٹر نیشنل بک فاونڈیشن، جناب ڈاکٹر انعام الحق جاوید کا تہ دل سے ممنون ہوں جن کی میرے کام میں گہری دلچسپی اور مسلسل حوصلہ افزائی میرے لیے تحریک کا باعث بنی ہے۔ انھوں نے عنوان کے انتخاب، کتاب کی ترتیب، ابواب کو حتمی شکل دینے، اس کے مختلف مسودوں کا جائزہ لینے اور اسے پیش کرنے کے قابل بنانے میں میری بہت زیادہ رہنمائی کی جس پر میں ان کا بے حد احسان مند ہوں۔

آخر میں، مَیں اپنے والدین کریمین جناب حاجی ملک محمد رفیق صاحب اور جنابہ صفیہ رفیق مرحومہ و مغفورہ کے احسانات کا بھی اعتراف کرتا ہوں جنھوں نے مجھے تحصیلِ علم کی راہ پر لگایا اور ہمیشہ میری علمی کاوشوں کو سراہا۔ آج تک جو کچھ بھی میں حاصل کر سکا ہوں وہ انھی نفوسِ قدسیہ کی دعاؤں کی بدولت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بہترین جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

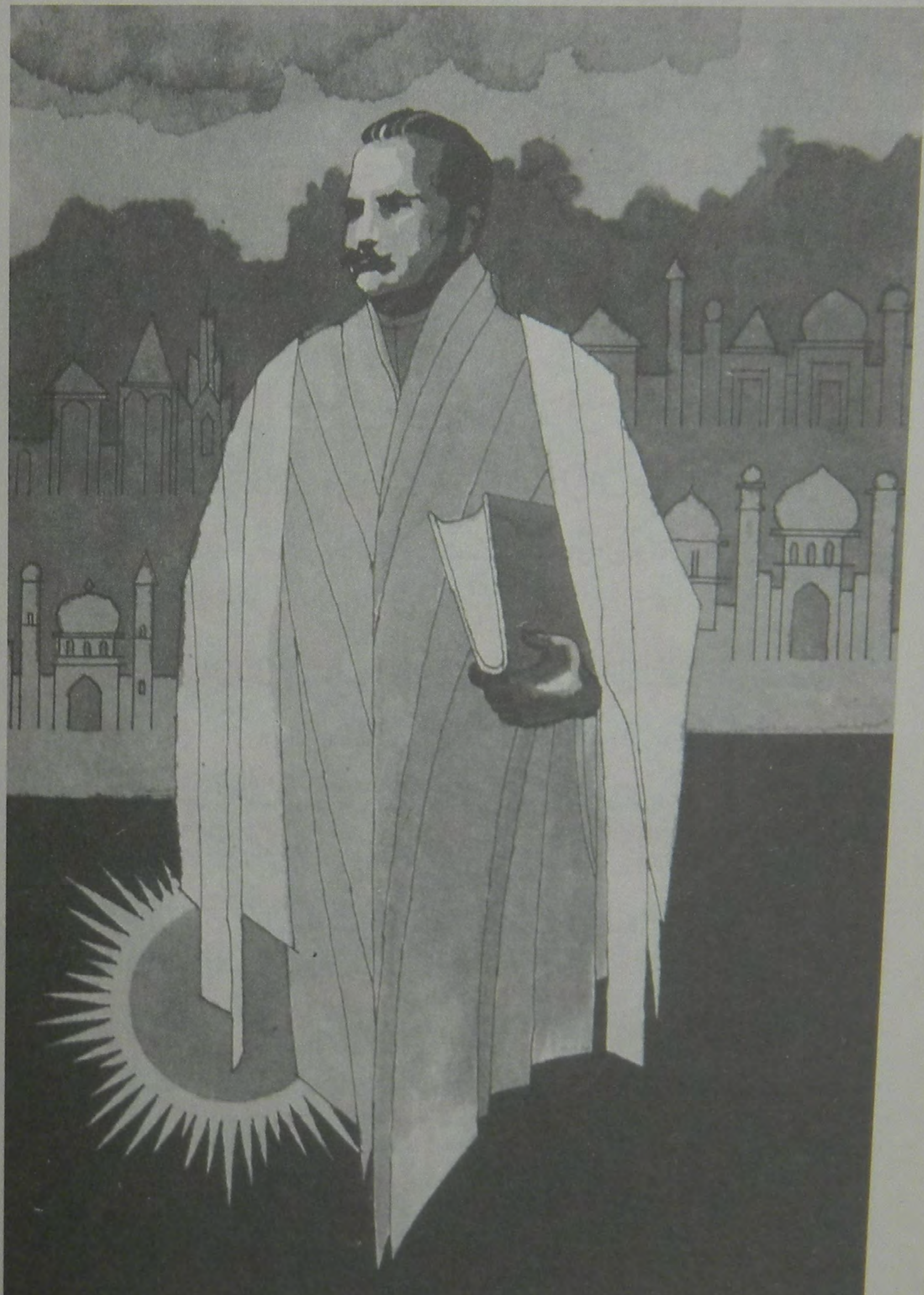
مزید برآں میں اپنی اہلیہ نادیہ ندیم اور دیگر اہلِ خانہ کا تہ دل سے احسان مند ہوں جنھوں نے دورانِ تحقیق و تدوین مجھے ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی اور ان کے خوش دلانہ تعاون کے بغیر اس تصنیف کی تکمیل ممکن نہ ہوتی۔ میرے بیٹے محمد انس مصطفیٰ، بھتیجے محمد اویس ملک اور بھتیجی ایمل فاطمہ کی مسکراہٹیں اور دلچسپ باتیں اس سارے سفر میں میری زادِ راہ رہیں۔ ان نعمتوں کے لیے میرا رواں رواں رب العزت کا شکر گزار ہے۔

ندیم شفیق ملک

۱۳- دسہرہ گراؤنڈ

راولپنڈی

nsmqq@hotmail.com



۱

علامہ اقبال اور سید سلیمان ندوی*

لاہور کی علمی مجالس کی ایک یادداشت

عبداللہ چغتائی

لاہور کی علمی سرگرمیوں کی جب کبھی مفصل تاریخ لکھی جائے گی اس میں انجمن حمایت اسلام لاہور کا حصہ بہت نمایاں ہو گا بلکہ ہر مجلس کے پس منظر میں یہی انجمن زیادہ تر جلوہ گر نظر آئے گی۔ مگر ایک بات افسوس سے کہنی پڑتی ہے کہ آج تک اس کے کارکنوں نے اس کی تاریخ کی تدوین کی طرف توجہ نہیں کی جو جلد از جلد ہونی چاہیے ورنہ تمام یادداشتوں کے جلد مٹ جانے کا امکان ہے کیونکہ انجمن ہذا میں نہ کوئی ایسا نظام ہے اور نہ اس کی خواہش نظر آتی ہے اور نہ ریکارڈ کو سنبھال کر رکھنے کا خیال ہے بہرحال ہمیں یہاں محض یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ ہندوستان کے ہر کونہ سے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں علوم و فنون کی مایہ ناز ہستیاں ہمیشہ اس کی سٹیج [چبوترہ] پر جلوہ گر ہوتی رہی ہیں اور اپنے کلام و ملفوظات سے عام و خاص کو مستفید کرتی رہی ہیں اس طرح مرحوم علامہ اقبال بھی ان درخشندہ ستاروں ہی سے ایک ہیں اور اہل علم یہیں سے زیادہ تر ان کے کلام سے اور ان کی شخصیت سے متعارف ہوئے اور انھوں نے جس قدر بھی اپنی بڑی بڑی نظمیں لکھی ہیں وہ تمام کی تمام سب سے اول اسی انجمن کی سٹیج کی مرہون منت

* سہ ماہی، اقبال، لاہور، بزم اقبال، جلد ۴، شمارہ ۴، اپریل ۱۹۵۶ء۔

ہیں جہاں آپ نے انھیں اپنی قوم کے سامنے پیش کیا۔

اسی طرح ہمیں بالوضاحت پتہ ملتا ہے کہ انجمن ہذا کے اراکین مرحوم علامہ سید سلیمان ندوی کو کئی سالوں سے اس کے سالانہ جلسہ میں شرکت کی دعوت دیتے رہے اور ان دعوت ناموں میں موضوع تقریر بھی طے ہوتا رہا جیسا کہ علامہ اقبال کا ایک خط بنام سید سلیمان ندوی سے بھی واضح ہے:

> لاہور ۵ ستمبر ۱۹۲۴ء۔ انجمن حمایت اسلام کا صدر مجھے انتخاب کیا گیا ہے مگر میں نے بعض وجوہ سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ کونسل میں اختلاف ہے اور عام حالت اس انجمن کی اچھی نہیں ہے۔ بعض ارکان ذاتی اغراض سے اس میں داخل ہیں اور ان کے نزدیک انجمن ان اغراض کے حصول کا ذریعہ ہے اور بس۔ اس وقت وہی جماعت جلسے کی تیاریاں کر رہی ہے مگر آپ ضرور تشریف لائیے۔ یہاں کے لوگوں کو 'ختم نبوت' کے مسئلے میں بڑی دلچسپی ہے اور آپ کی تقریر انشاءاللہ بے حد توجہ سے سنی جائے گی۔ اس کے علاوہ میں ایک مدت سے آپ کی ملاقات کا اشتیاق رکھتا ہوں میرے ہی غریب خانہ پر ٹھہریے۔ یہاں سے انجمن کا جلسہ گاہ کچھ دور نہیں، موٹر پر چھ منٹوں [لمحوں] کی راہ ہے۔۔۔

مگر تعجب ہے کہ قبلہ سید صاحب اس مرتبہ تشریف نہیں لائے۔ آخر آپ نے ۱۹۲۷ء کے جلسہ میں شرکت کی جو اپریل کے مہینہ میں ۱۵، ۱۶، ۱۷ تاریخوں میں اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ [میدان] میں مغرب کی جانب والی دیوار کے ساتھ ہوا جس میں راقم نے بھی شرکت کی تھی۔ یہ انجمن حمایت اسلام کا بیالیسواں جلسہ تھا۔

چنانچہ جب آپ لاہور اپریل ۱۹۲۷ء میں تشریف لائے تو آپ دہلی دروازہ کے باہر جہازی بلڈنگ میں مولانا ظفر علی خاں کے ہاں زمیندار کے دفتر میں مہمان ہوئے۔ حُسنِ اتفاق سے علامہ اقبال کے خطوط بنام علامہ ندوی اپریل ۱۹۲۶ء سے لے کر مارچ ۱۹۲۸ء کے درمیان کوئی خط بھی نظر

نہیں آیا جس سے ہمیں اس دفعہ بھی لاہور میں آنے کے متعلق کوئی اطلاع مل جاتی۔

لاہور میں یہ وہ زمانہ تھا جب علامہ اقبال مرحوم ابھی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں رہتے تھے۔ میں ۱۵ اپریل کی صبح حسب معمول ان کے ہاں حاضر ہوا تو میرے آپ کو سلام کرنے سے پیشتر ہی آپ نے فوراً دور سے حسب عادت پوچھا ''ماسٹر[مدرس] صاحب تشریف لے آیئے، آج کیا خبر ہے''۔ راقم کے ساتھ ابتدا سے لے کر تادم آخر یہی دستور ہمیشہ رہا اور میں نے بھی ہمیشہ یہ کوشش کی کہ میں آپ کو سلام پہلے کروں مگر مجھے شاید ہی کامیابی ہوئی ہو۔ جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے ہمیشہ علامہ نے خود ہی اول خیریت پوچھنے میں اقدام [پہل کی] کیا۔

آپ نے فوراً علی بخش کو پکارا کہ ڈرائیور سے کہو کہ گاڑی (موٹر) نکالے۔ اس زمانہ میں ایک شخص علم الدین موٹر ڈرائیور تھا جو باغبانپورہ میں رہتا تھا اور میاں فیملی میں بھی ڈرائیور رہ چکا تھا آج کل بھی وہ اومنی بس سروس والوں کے ہاں ملازم ہے۔ مجھے فرمانے لگے کہ آؤ چلیں۔

آپ کی موٹر ایک فرنچ [فرانسیسی] کمپنی کی بنام 'جیجو' تھی اور اس پر ایک شتر مرغ دھات کا ڈھلا ہوا آگے لگا تھا۔ یہ گاڑی علامہ نے والٹر لاک کمپنی لاہور والوں کے ہاں سے سیکنڈ ہینڈ خریدی تھی جس میں مرحوم سید افضال حسن حسینی کا پورا دخل تھا۔ جب اس کی پہلی بار خرید سے پیشتر آزمایش کی گئی تو میں بھی منشی طاہر الدین[1] مرحوم اور علامہ کے عزیز لدھیانہ والی اہلیہ کے بھائی ڈاکٹر غلام محمد مرحوم کے ہمراہ تھا۔ سید افضال حسن حسنی مرحوم ہمیں میاں میر چھاؤنی کے بلند پل کے دوسری طرف تک لے گئے تھے اور میرا

[1] حکیم شیخ طاہرالدین مرحوم علامہ اقبال کے پیشہ وکالت میں عمر بھر منشی رہے۔

خیال ہے کہ یہی موٹر آخر تک آپ کے پاس رہی۔ البتہ میکلوڈ روڈ [شاہراہ] والی کوٹھی میں آنے سے پیشتر علامہ کے پاس انارکلی والے مکان مین ایک گگ بھی ہوتی تھی جسے وہ خود بھی کبھی گھوڑے کی باگ ہاتھ میں لئے چلاتے ہوئے چیف کورٹ [عدالت العالیہ] آتے جاتے نظر آتے تھے۔

چنانچہ راقم اور علامہ مرحوم ہم دونوں زمیندار کے دفتر صبح قریب ۱۰۔۹ بجے پہنچے۔ اخبار زمیندار کا یہ وہ زمانہ تھا جب کہ وہاں سے مولانا غلام رسول مہر صاحب اور مولانا عبدالمجید سالک صاحب زمیندار کو چھوڑ کر الگ اپنا اخبار انقلاب اسی مہینے میں جاری کر چکے تھے۔ مکان کی اوپر کی منزل میں پہنچے تو مولانا سید سلیمان ندوی الگ کمرہ میں فروکش تھے۔ جہاں مولانا اختر علی صاحب نے رہنمائی کی اور اتفاق سے مولانا ظفر علی خاں صاحب مدظلہ العالی کسی اور کام میں اس وقت مصروف تھے۔ یہ دونوں پیکر اخلاق وعلم و عرفان نہایت تپاک و مسرت سے ملے۔ راقم کا بھی نہایت عمدگی سے علامہ اقبال نے سید صاحب سے تعارف کرایا۔ ہم وہاں قریب ایک گھنٹہ تک رہے اور تمام وقت علم و دین و فلسفہ اسلام کے موضوع پر گفتگو رہی جو زیادہ تر امام رازی کی مباحث مشرقیہ کے متعلق تھی کیونکہ اس وقت علامہ اقبال کے سامنے بحث مکان و زمان ایک خاص موضوع مطالعہ تھا جس کے لیے اکثر علماء وفضلا سے استصواب بھی کر رہے تھے۔ یعنی مرحوم ڈاکٹر ضیاء الدین وائس چانسلر [نائب امیر جامعہ] مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ، مرحوم علامہ سید محمد انور شاہ رحمۃ اللہ شیخ الحدیث دیوبند جیسوں سے خط و کتابت ہو رہی تھی جس کا ثبوت یہ ہے کہ جب علامہ اقبال نے لاہور میں اورینٹل کانفرنس [مجلسِ شرقیہ] ۱۹۳۸ء کے موقع پر اس کے شعبۂ فلسفہ میں خطبۂ صدارت دیا تو ان دونوں حضرات سے اس مسئلہ پر جو خط و کتابت کے ذریعہ استفادہ کیا تھا اس ضمن میں ذکر کیا اور یہ خط و کتابت کسی قدر راقم کے ذریعہ بھی ہوئی تھی جس کا ذکر ذیل میں آئے گا۔

اس معمولی سی ملاقات اور صحبت میں علامہ نے قبلہ سید سلیمان ندوی کو

اپنے ہاں دعوت طعام بعد نماز مغرب بھی دی جو آپ نے قبول فرمائی اور ساتھ ہی ان کے میزبان قبلہ مولانا ظفر علی خاں کو بھی مدعو کیا۔ جب ہم وہاں سے چلنے لگے تو ہم سید صاحب کو اسی موٹر میں بٹھا کر انجمن حمایت اسلام کے جلسہ گاہ تک یعنی اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ تک لے آئے۔ علامہ اقبال نے جلسہ میں شرکت نہیں کی اور وہ اپنی گاڑی میں ہمیں (سید صاحب اور راقم کو) چھوڑ کر اپنے گھر چلے گئے اور ہم دونوں نے جلسہ میں شرکت کی اور ادھر سید صاحب کی تقریر کا وقت بھی قریب تھا۔ یہ جلسہ بہت ہی پر رونق تھا اور شایقین و سامعین سے تمام جلسہ گاہ قریب قریب بھری ہوئی تھی۔ سید صاحب کی تقریر کا موضوع: 'عہد رسالت ﷺ میں اشاعت اسلام' تھا جس کا خلاصہ انجمن حمایت اسلام کی جلسہ کی روئیداد ۱۹۲۸ء میں صفحہ ۳۲ پر بعنوان 'مولانا سید سلیمان ندوی کی تقریر' طبع ہو چکا ہے۔ یہ تقریر ایک گھنٹہ سے زائد رہی اور سامعین نے نہایت دل جمعی سے اسے سنا۔ اس مرتبہ اشاعت اسلام جلسۂ انجمن کا خاص موضوع تھا کیونکہ رانا نصراللہ خاں نو مسلم نے جلسہ کی صدارت کی تھی۔

دوران تقریر سید صاحب میں جلسہ میں موجود رہا۔ اب آپ کو واپس آپ کے مستقر پر چھوڑ کر آنا میرے ہی فرائض میں تھا۔ چنانچہ جب جلسہ برخاست ہوا تو میں سید صاحب کی رہنمائی کے لیے آگے بڑھا مگر ملنے والوں کا بے حد ہجوم تھا۔ ملاقاتوں کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ میں نے جناب سے چلنے کے لیے خواہش کی اور وہ خود بھی یہی چاہتے تھے اور سواری وہاں سے ہر حالت میں سڑک پر پہنچ کر ہی میسر آ سکتی تھی۔ چنانچہ ہم نے ریلوے روڈ والے کالج کے دروازہ کی طرف رخ کیا۔ اس دروازہ سے قریب دو سو قدم پر مرحوم پروفیسر [معلم] حافظ محمود خان شیرانی فلیمنگ روڈ پر رہتے تھے۔ میں سید صاحب کو بغیر کسی قبل اطلاع اور تعارف کے اور اسی طرح ادھر قبلہ شیرانی صاحب کو بھی بغیر خبر کیے ہوئے سید صاحب کو

خراماں خراماں ان کے مکان پر سیدھا لے گیا۔ پروفیسر شیرانی مرحوم ایک ایسی ہستی تھی جو کبھی بھی ایسے جلسوں میں شرکت نہیں کرتی تھی۔ اس لے یہ یقینی امر تصور کرتے ہوئے کہ وہ ضرور گھر پر ہوں گے میں بغیر کسی رسمی آواز کے ہی سیدھا ان کو اوپر بالا خانہ میں لے گیا۔ اس دوران میں ایک مرتبہ قبلہ سید صاحب نے بطور استفسار اشارہ بھی کیا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ میں نے جواب میں کہا کہ ایک صاحب سے ذرا مل لیں۔ جب ہم اوپر گئے تو میں نے دیکھا کہ شیرانی صاحب حسب عادت مخلا بالطبع ہو کر فرش پر حسب عادت بیٹھے ہیں اور ان کے گرد میٹرک[درجہ ثانویہ] کے فارسی کے پرچوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں جس کے وہ ممتحن اعلیٰ تھے اور حسن اتفاق سے ان کے پاس اس وقت مولانا تاجور بھی بحیثیت ممتحن بیٹھے تھے۔ ایک امر کی وضاحت لازمی ہے کہ آج تک ان تینوں حضرات کی ایک دوسرے سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اور نہ کسی کو پہچانتے تھے۔ جب میں بغیر اطلاع شیرانی صاحب کے سر پر جا پہنچا اور وہ میری طرف دیکھنے لگے تو میں نے فوراً سلام کے بعد کہا کہ 'قبلہ سلیمان ندوی' اور ان کی طرف دیکھ کر عرض کیا کہ 'پروفیسر شیرانی'۔ یہ دونوں فاضل اور محقق ہستیاں ایک دوسرے کی طرف تعجب سے دیکھنے لگیں اور مجھے حیرانی سے دونوں خشمگیں نگاہوں سے کہا کہ اللہ کے بندے پہلے بتا تو دیتے۔ اتنے میں مولانا تاجور کی طرف سید صاحب کی جو نظر پڑی تو میں نے کہا 'مولانا تاجور'۔ سید صاحب مرحوم نے ذرا مسکراتے ہوئے فوراً کہا کہ ہم تو آپ کو 'تاجور' ہی سمجھتے رہے۔ یہ مجلس تھی تو چند منٹ کی مگر بہت ہی پرلطف۔ پروفیسر شیرانی مرحوم نے حسب عادت فوراً ٹھنڈے شربت سے تواضع کی اور اس کے بعد سید ندوی صاحب کو ہمرا لے کر ان کے مستقر دفتر زمیندار چھوڑ آیا اور اسی شب علامہ سر اقبال کے ہاں قبلہ

سید صاحب کی دعوت بھی تھی۔ بعد دوپہر میں نے علامہ اقبال کو جب یہ تمام واقعہ سنایا تو بہت ہی ہنسے اور فرمانے لگے کہ یہ ملاقات بھی حالات کے اعتبار سے لازمی تھی، بہت اچھا ہوا۔

یہاں ایک امر کی وضاحت لازمی ہے کہ پروفیسر شیرانی لاہور میں ۱۹۱۹ء میں آئے اور آتے ہی فارسی ادب و تاریخ کے مطالعہ کی طرف احباب کو رغبت دی اور انھوں نے شعرالعجم مولفہ مرحوم علامہ شبلی کی تنقید کا سلسلہ شروع کیا اور یہ سلسلہ بصورت مضامین بالاقساط رسالہ اردو مرتبہ قبلہ مولوی عبدالحق مدظلہ العالی میں برابر ۱۹۲۲ء سے جنوری ۱۹۲۷ء تک چھپتا رہا یہ ایک بڑا علمی کارنامہ دراصل شبلی سکول [آف تھاٹ: مکتبۂ فکر] کے خلاف تھا اگرچہ کوئی تنقیص مقصود نہ تھی اور یہ محض علمی خدمت تھی اور علمی حلقوں میں اس معرکۃ الارا علمی کارنامہ کا بہت چرچا تھا۔ اس پر بعض جوابی مضامین بھی لکھنے کی کوششیں کی گئیں مگر شیرانی کے لوہے کے آگے کسی کی نہیں چلتی تھی۔ شیرانی صاحب کا یہ علمی کارنامہ بصورت کتاب بھی طبع ہو چکا ہے۔ غرضیکہ اس وجہ سے کسی قدر طبائع میں یہ جذبہ علمی جدوجہد شخصی شکر رنجی تک بھی تجاوز کر چکا تھا[2] اور لازمی ہو گیا تھا کہ جب کبھی بھی قبلہ سید صاحب لاہور تشریف لاتے اور شیرانی سے روشناس ہوئے بغیر لاہور سے چلے جاتے یہ ناممکن تھا اس لیے میں نے یہ عمل اختیار کیا کہ اس میں خوشگواری پیدا ہو۔

---

[2] اس ضمن میں میں نے خود ایک دو خط مولانا عبدالحق انجمن ترقی اردو اور مرحوم شیرانی کے پاس نواب حسین علی بلگرامی عماد الملک اور مرحوم نواب صدر الصدور حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے دیکھے ہیں جن میں اس علمی کارنامہ کی تو بہت تعریف کی گئی ہے مگر لہجہ تحریر ناپسند کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تنقید بصورت کتاب شائع ہوئی تو شیرانی صاحب کو کہنا پڑا کہ 'تنقید ہذا مولانا شبلی مرحوم کی فضیلت علمی کی منقبت نہیں بلکہ محض احتجاج ہے'۔

ممکن تھا کہ سید صاحب کی ملاقات شیرانی صاحب سے لاہور کے دوران قیام میں کسی اور موقع پر بھی ہو جاتی مگر یہ ملاقات جو ہر دو کے بغیر کسی پیشتر توقع اور اطلاع کے وقوع میں آئی اور پھر شیرانی کے اپنے مکان پر ہمیشہ یاد رہنے والا امر ہے اور اس کے بہتر نتائج ہوئے یعنی اس کے بعد یہ ملاپ اسی طرح بصورت علم دوستی اور اتفاق میں تبدیل ہو گیا۔[3] میرے خیال میں اس سے وہ ہمہ گیری اور علمی گہما گہمی اور قدر درخشاں نظر آتی ہے جس سے تمام علمی طبقوں میں اس زمانہ میں ایک زندگی نظر آتی ہے اور اس میں زیادہ تر تو ہماری علمی ہستیوں کا جس میں مرحوم علامہ اقبال اور ان کی صحبت میں بیٹھنے والے مولوی عبدالحق مدظلہ العالی اور ان کے رفقا کار وغیرہ کا حصہ ہے بلکہ ان میں سب سے زیادہ قبلہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی علوم سے بلند پایہ واقفیت، ہمہ گیر شخصیت اور اس سے بڑھ کر خدا داد قابلیت کا سب سے زیادہ حصہ ہے اور اس کے ساتھ سید صاحب میں جو حوصلہ افزا طبیعت قدرت نے نوجوانوں کو ابھارنے کی عطا کی تھی جو زیادہ تر مرحوم نے اپنے استاد مرحوم علامہ شبلی سے ورثہ میں لی ہے۔ اس نے بھی اس زمانہ میں ایک خاص جماعت پیدا کر کے علمی ماحول کو چار چاند لگا دیے بلکہ یوں کہنا بجا ہو گا کہ اعظم گڑھ، اورنگ آباد اور لاہور میں ظاہراً سینکڑوں میلوں کا فاصلہ تھا مگر اس زمانہ کے علمی ماحول سے اس قدر مملو تھا کہ کوئی خلا نظر ہی نہیں آتا۔ جس کے برعکس آج خلا ہی خلا نظر آتا ہے۔

---

[3] اس کے بعد شیرانی مرحوم ایک مرتبہ لکھنؤ تشریف لے گئے اور وہاں ندوہ میں مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی کے ہاں مہمان تھے اور حسن اتفاق سے وہیں قبلہ سید سلیمان ندوی بھی تشریف لے آئے۔ چنانچہ شیرانی کی بہت پر تکلف دعوت کی۔ شیرانی اس دعوت کو جسے وہ 'ملاپ شوق' کے نام سے تعبیر کرتے تھے ہمیشہ ذکر کرتے رہے۔

چنانچہ اس شب مولانا سید سلیمان ندوی کی علامہ اقبال کے مکان پر ایک دعوت ہوئی جس میں میرے خیال میں مرحوم چودھری محمد حسین، مولانا ظفر علی خاں مدظلہ العالی، راقم، خواجہ سلیم، مولانا غلام رسول مہر، تاثیر مرحوم، مولانا عبدالمجید سالک شامل تھے اور یہ دعوت حسب معمول معیارِ اقبال بہت ہی پر تکلف اور بہت کامیاب تھی۔ کافی دیر تک مذاکرہ علمی ہوتا رہا، جس میں زیادہ تر علامہ عنایت اللہ مشرقی کی تالیف تذکرہ کا ذکر اور بحثِ مکان و زمان اور شعر و شاعری پر مذاکرہ ہوتا رہا۔ چودھری محمد حسین مرحوم نے بالخصوص بعض نئے نئے مسائل پر بھی گفتگو کی اور پنجاب کی علمی سرگرمیوں کو خوب سراہا گیا۔ خاص کر چلتے وقت امام رازی کی کتاب مباحث مشرقیہ میں سے بحث مکان و زمان پر آ کر مجلس کا اختتام ہوا اور رات کو ہم علامہ کی گاڑی میں مہمان اور ان کے میزبان مولانا ظفر علی خاں کے ہمراہ واپس ہوئے۔

اسی دعوت میں قبلہ سید صاحب کو خواجہ محمد سلیم نے اپنے مکان واقعہ کوچہ کوٹھی داراں کشمیری بازار پرانی کوتوالی کے قرب میں دعوت طعام دی جو خاص کر اتوار کے دن ۱۷ اپریل طے ہوئی۔ اس دعوت سے خاص طور پر سید صاحب کو چند علمی مخطوطات سے روشناس کرانا مقصود تھا جو خواجہ محمد سلیم (حال پروفیسر لسان انگریزی، گورنمنٹ کالج لاہور) کے مجموعہ علمی نوادرات میں تھے۔ یہ دعوت کئی حیثیتوں سے لاہور میں ایک یادگار ہے۔ اس دعوت میں ذیل کے حضرات شامل تھے:۔ پروفیسر شیرانی صاحب، مرحوم، پروفیسر اقبال مرحوم،[4] ملک محمد امین ایڈوکیٹ [وکیل]، ملک لطیف (حال سٹیشن ماسٹر [منتظم اقامت گاہ]، لاہور) مولانا ظفر

---

[4] آج یہ حضرات مرحوم ہیں۔

علی خان، چودھری محمد حسین، سید عبداللہ، مسٹر [جناب] بشیر بمبئی بوٹ ہاؤس ڈبی بازار، ملک لال دین قیصر، مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالمجید سالک، بابو عبدالماجد صاحب، علامہ سر اقبال، سید سلیمان ندوی، شیخ عبدالرشید اور سید واجد علی شاہ ایڈوکیٹ شامل تھے۔

کھانا بہت ہی پر تکلف، لذیذ اور مختلف انواع پر مشتمل تھا جو بہت ہی عمدگی سے کھایا گیا اور اسے لاہور کے مشہور باورچی فضل دین (پھجو) مرحوم کشمیری بازار نے زیر ہدایت میزبان اور مسٹر بشیر نے تیار کیا تھا۔ یہ دعوت علاوہ پر تکلف اور لذیذ ہونے کے علمی اعتبار سے بہت ہی قابل یاد ہے۔ کافی لطیفے ہوئے جو کسی قدر مختصر طور پر یاد ہیں۔ مولوی ظفر علی خاں صاحب نے فرمایا کہ اخبار زمیندار میں لطائف و حقائق بعنوان 'افکار و حوادث' لکھے جاتے تھے جو عام طور پر سالک لکھتے تھے اور وہ اس عنوان اور اس حصہ اخبار کو اپنے نو جاری کردہ انقلاب میں اختیار کر چکے ہیں اس لیے اب زمیندار میں یہی رسم و روایات کسی اور عنوان سے جاری رہنی چاہئیں۔ چنانچہ بہت بحث ہوئی اور اسی بنا پر کافی لطائف بھی ہوئے۔ آخر قبلہ سید صاحب نے بعض اخبارات ممالک اسلامی کو مد نظر رکھ کر اور سب سے بڑھ کر مقصد تحریر کو مد نظر رکھ کر ایک عنوان 'فکاہات' تجویز کیا جو میرے خیال میں اس وقت سے لے کر آج تک برابر جاری ہے۔ باتوں باتوں میں موضوعات اور ضعیف راویوں پر گفتگو بھی ہوئی جس پر علامہ نے کہا کہ ہمارا راوی (دریائے راوی) اب بہت ضعیف ہو گیا ہے۔ لطیفہ و لطائف الفاظ پر دوران گفتگو میں سید عبداللہ نے ملا علی بن حسین واعظ کاشفی کی کتاب لطائف الطوائف کہہ کر فرمایا ہاں: ملا علی بن حسین واعظ کاشفی کو لطائف الطوائف کی کیا خبر ورنہ وہ ضرور اس ضمن میں بھی کچھ نہ کچھ لکھتا۔ جس پر کافی قہقہے ہوئے۔ یہ پر لطف مجلس کافی دیر تک رہی اور کافی دیر بعد تک اس کی یاد احباب میں رہی۔ خواجہ محمد سلیم کے مملوکہ نسخہ، رباعیات عمر خیام، کا عام طور پر بہت چرچا ہو چکا تھا، جسے بغداد میں کاتب فرج اللہ نے ۸۶۸ھ میں لکھا تھا۔ سید صاحب کو اس کے دیکھنے کا اشتیاق تھا اور اس کے علاوہ ان کے ہاں اور بھی بہت بلند پایہ علمی مخطوطات تھے جن کو

خواجہ محمد سلیم صاحب نے ایک لوہے کے ٹرنک میں سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ لوہے کا ٹرنک ان کے سامنے لا کر رکھ دیا گیا اور آپ نے نہایت عمدگی سے ان کا لطف اٹھایا جس کا وہ خود بھی 'شذرات' معارف مئی ۲۷ء مندرجہ ذیل میں ذکر کرتے ہیں۔

دوران قیام قبلہ سید صاحب نے لاہور کے مختلف ادارے دیکھے اور کافی حضرات سے ملاقاتیں کیں جن کا ذکر بھی خود قبلہ سید صاحب نے معارف کے مندرجہ ذیل شذرات میں کیا ہے۔ آپ اس دوران میں دفتر انقلاب میں بھی گئے تھے جس کا ذکر نہ معلوم کہیں نہیں کیا گیا مگر انقلاب میں ضرور ذکر ہے:

> ۱۷پریل ۲۷ء کو حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے دفتر انقلاب کو شرف سعادت بخشا۔ اتوار کا دن تھا، دفتر میں تعطیل تھی مولانا عبدالمجید خاں سالک نصیب دشمنان اضمحال طبیعت کی وجہ سے دفتر میں تشریف نہیں لائے تھے۔ آقا مرتضیٰ میکش وطن تشریف لے گئے تھے دیگر کارکن تعطیل کی وجہ سے حاضر نہ تھے۔ خاں محمد شفاعت اللہ خاں مرحوم اور چودھری غلام رسول مہر صاحب نے مولانا ممدوح کا استقبال کیا۔[5]

دفتر انقلاب سے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی خواجہ کمال الدین مرحوم کی خدمت میں تشریف لے گئے۔ وہاں اتفاق سے ڈاکٹر سیف الدین کچلو صاحب بھی تشریف فرما تھے اور وہیں ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب مرحوم بھی تشریف لے آئے تھے۔ خواجہ کمال الدین کی طبیعت علیل تھی لیکن اس وقت نسبتاً بہتر تھی۔ سیرۃ النبی [ﷺ] کے مطبوعہ پانچویں حصہ کے متعلق گفتگو ہوئی۔ کچھ دیر مذاکرہ علمی ہوتا رہا اور یہ مجلس بہت ہی پرلطف رہی۔ یہ ایسے لوگوں پر مشتمل تھی شاید ہی پھر کبھی ان کا ایسا اجتماع ہوا ہو۔

---

[5] [روزنامہ]، انقلاب، لاہور، ۲۰اپریل ۲۷ء۔

اس کے بعد حضرت سید سلیمان ندوی صاحب دفتر زمیندار جہاں وہ بحیثیت مہمان مقیم تھے تشریف لے گئے جہاں مولانا ظفر علی خاں صاحب سے ملاقات بھی ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد چودھری غلام رسول مہر صاحب اور خاں شفاعت اللہ خاں صاحب جو مولانا سید صاحب کے ہمراہ اپنے دفتر سے ہو گئے تھے یہاں پہنچ کر واپس چلے گئے۔

۱۶ اپریل ۱۹۲۷ء کو انجمن حمایت اسلام کے جلسہ عام میں علامہ سر اقبال کی ایک انگریزی تقریر بعنوان 'The Spirit of Islamic Culture' [روح ثقافتِ اسلامیّہ] بعد نمازِ مغرب ساڑھے سات بجے ہوئی جس کا خلاصہ روئداد جلسہ میں غالباً چھپا ہو گا۔اسی جلسہ میں میاں سر شفیع مرحوم کی تقریر بھی ہوئی۔

دوران قیام لاہور علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم جس مجلس میں بھی گئے انھوں نے دارالمصنّفین کے ذکر اور اس کی علمی خدمات کی طرف لوگون کو متوجہ کر کے اس کی اعانت کے لیے آمادہ کیا۔ چنانچہ متذکرہ بالا دعوت جو خواجہ سلیم کے مکان پر ہوئی تھی اس میں ایک خاص سکیم [منصوبہ] تجویز ہوئی کہ کس طرح عام علمی حضرات وہاں کی مطبوعات کو حاصل کر سکتے ہیں جس سے دارالمصنّفین کو بہت تقویت ہو۔اس ضمن میں ہمارے محترم بابو عبدالماجد صاحب قابل ذکر ہیں جنھوں نے اس سکیم میں سب سے اول اقدام کیا۔

قبلہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے خود بھی لاہور سے واپسی پر اعظم گڑھ پہنچ کر معارف مئی ۲۷ء کے 'شذرات' میں اپنے تاثرات لاہور کو مختصر طور پر مگر اپنے مخصوص انداز میں قلمبند کیا ہے۔ان مندرجہ ذیل شذرات سے سید صاحب کی تمام مصروفیات لاہور اور یہاں اس وقت کی علمی جدوجہد اور

مجالس کی زندگی کا نقشہ مل جائے گا۔

'شذرات'، معارف، مئی ۱۹۲۷ء:

پچھلے دس برسوں میں میں نے ہندوستان کا گوشہ گوشہ چھان ڈالا مگر یہ کس قدر تعجب انگیز ہے کہ اس عرصہ میں پنجاب جانا نصیب نہ ہوا۔ پنجاب کے احباب نے بار ہا تقاضا کیا اور اصرار کیا لیکن مجبوریاں تعمیل سے مانع رہیں۔ حمایت اسلام لاہور کے کارفرما ہر سال یاد فرماتے رہے مگر عدم تعمیل کے لیے ہر سال کوئی نہ کوئی حیلہ ہاتھ آتا رہا۔ امسال مزید بہانہ جوئی کے لیے کوئی چیز ہاتھ نہ آئی اور وسط اپریل میں لاہور جانا ہوا۔

لاہور آج سے سترہ اٹھارہ برس پہلے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد گیا تھا اور پھر اب گیا۔ اس لیے انجمن کی تقریر میں، میں نے کہا۔ لاہور پہلے اس وقت آیا تھا جب میرا آغاز شباب تھا اور اب آیا ہوں جب انجام شباب ہے کہ عمر کا توسن مرحلۂ اربعین سے بھی دو تین قدم آگے بڑھ گیا ہے۔ انجمن میں میری تقریر کا موضوع 'عہد رسالت[ﷺ] میں اشاعت اسلام' تھا۔ تقریر کا خلاصہ بعض اخبارات میں چھپ چکا ہے۔

لاہور ہندوستان کا صدر دروازہ ہے۔ وہاں کی حرکت و جنبش، چہل پہل، رونق و گرم بازاری، جوش و خروش، ہر چیز دلوں کے عزم اور ہاتھ پاؤں کی قوت کو ظاہر کرتی ہے۔ [انجمن] حمایت اسلام اس وقت نہ صرف پنجاب بلکہ تمام ہندوستان کی اسلامی انجمنوں میں سے سب سے زیادہ باعمل اور کارکن جماعت ہے۔ نقائص اور کمزوریوں پر نہ جایئے کہ ان سے تو کوئی انسانی کام کبھی خالی نہیں رہ سکتا۔ جو اس نے نہیں کیا اس کا گلہ کیجیے۔ مگر جو اس نے کیا ہے اس کا شکریہ بھی ادا کیجیے۔ اس وقت وہ ایک بڑا کالج، چند ہائی سکول، متعدد پرائمری سکول، زنانہ مدرسے اور ایک یتیم خانہ چلا رہی ہے۔ اس کے اردو اور فارسی نصاب کی کتابوں نے تمام ملک میں مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ تبلیغ کا صیغہ بھی اس میں ہے۔ اور بھی رفاہ عام کے کام وہ انجام دے رہی ہے۔ اس کا آغاز چند محنتی اور غریب عملی مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہوا اور اب وہ اُمرا اور ذی اثر اشخاص کے حصول عزت کا سامان ہے۔ یہی اس

کی کامیابی کی بڑی دلیل ہے۔

تمام مسلمانان پنجاب عموماً اور مسلمانان لاہور خصوصاً مبارک باد کے مستحق ہیں کہ وہ ہر سال اس کے کاموں کے لیے ہزار ہا روپے فیاضی کے ساتھ دیتے ہیں۔امسال اس کے کالج کا یا خود اس کا میزانیہ (بجٹ) دس لاکھ کا تھا۔ اس میں پانچ لاکھ کی کمی تھی جس کا قوم سے مطالبہ تھا۔ جلسہ میں شاید پچیس تیس ہزار کا چندہ ہو گیا ہو گیا۔ گو یہ رقم اس کے مطالبہ سے بہت کم ہے تاہم آج کل 'آل انڈیا' مجلسوں سے لے کر معمولی مجالس تک کے سالانہ جلسے صرف اسی کو کامیابی سمجھتے ہیں کہ جلسوں میں حاضرین کی کافی تعداد آ جائے۔ سالہا سال سے ہمارے قومی، تعلیمی اور مذہبی جلسے چندہ کی پکار سے تھک کر خاموش ہو گئے ہیں۔ اس لیے اس قدر رقم کا جمع ہو جانا بھی ہمارے لے تعجب کا باعث ہوا۔ یہ بھی دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انجمن کے ارکان اور ہمدرد اس موقع پر خود کچھ دیتے ہیں یا اپنی محنت سے دوست احباب سے وصول کر کے کچھ لاتے ہیں۔

اس کے ماننے میں کچھ تامل نہ ہو گا کہ مدت سے لاہور اردو مطبوعات اور اخبارات و رسائل کا مرکز رہا ہے۔اب تو اور صوبوں نے بھی کچھ کام شروع کیا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ نصف صدی تک صرف لاہور نے تنہا اس خدمت کو انجام دیا ہے۔اور اب بھی وہ سب سے آگے ہے اور بھلا برا جو کام بھی اس سے بن آیا اس نے کیا اور دوسروں کے لئے تقلید کا نمونہ پیش کیا۔

اصحاب علم اور ارباب علم و ادب کی جمعیت کے لحاظ سے بھی وہ آج کل ہندوستان کی سب سے بہتر مجلس ہے۔ *ڈاکٹر سر اقبال، *شیخ عبدالقادر، *پرنسپل [صدر کلیہ] عبداللہ یوسف علی، *پروفیسر محمود شیرانی، *پروفیسر اقبال، *پروفیسر محمد شفیع، *پروفیسر سراج الدین آذر، *مولوی محمد علی ایم۔اے، *خواجہ کمال الدین، * پروفیسر سید عبدالقادر، مولوی ظفر علی خاں اور متعدد ایسے باکمال اصحاب کی سکونت کا اس کو فخر حاصل ہے جن کے یکجا مرقع کے مثال کسی اور شہر میں نظر نہیں آتی۔ پرانے لوگوں میں *سید ممتاز علی

* آج یہ سب حضرات مرحوم ہیں۔

صاحب، *منشی محبوب عالم صاحب، اور *مولوی انشاء اللہ خان اپنی بہاریں گزار چکے تاہم ان کی خزاں بھی بہار کی یادگار ہے۔

انشاء پردازوں، ادیبوں اور شاعروں کی محفل بھی وہاں کچھ کم رونق ہیں۔ سالک، مہر، *تاجور، ابوالاثر حفیظ، غلام ربانی، تاثیر*، حکیم یوسف حسن (نیرنگ خیال)، مولانا عبداللہ چغتائی، سید امتیاز علی تاج، *اختر شیرانی (بہارستان) اور کئی متعدد اہل قلم آگے بڑھنے کے لے مصروف عمل ہیں اور مستقبل ان کی کامیابی کا منتظر اور ان کے خیر مقدم کو تیار ہے۔ اور ان میں سے بعض تو آگے بڑھ کر پہلی صف کے قریب پہنچ چکے ہیں۔

یہ لکھنے میں میرا دل خوشی اور مسرت سے لبریز ہے کہ لاہور کے اہل علم اور اہل قلم نے اپنی برادری کے اس کمترین ممبر [رکن] کو خوش آمدید کہنے میں پوری فیاضی کا ثبوت دیا۔ مولوی ظفر علی خاں نے تو اپنے گھر مہمان ہی اتارا۔ اور یہ نامناسب بھی نہ ہوا کہ ایک 'دہقانی' ایک 'زمیندار' کا مہمان بنا۔ ڈاکٹر اقبال سے یہ میری پہلی ظاہری ملاقات تھی اور مراسلت کی باطنی ملاقات تو ۱۹۱۴ء سے قائم ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کرم کیا کہ ملنے میں پیش دستی فرمائی۔ قیام گاہ میں آئے۔ متعدد صحبتوں میں ساتھ رہے اور پھر خود اپنے کاشان میں ہمیں مدعو کیا جس کو وہ 'دارلفقر' اور میں 'دارالاقبال' کہوں گا۔

مولانا توجور نے اپنے ہاں چند ہندو مسلمان نوجوان ادیبوں کو میری عزت افزائی کے لیے چائے پر بلایا۔ پروفیسر آذر نے چند عشاق کتب کو مجھے اپنا قلمی کتب خانہ دکھانے کے بہانے سے یکجا کیا۔ خواجہ محمد سلیم صاحب نے ممتاز اہل علم اور نوجوان دلدادگان فن کو اپنے 'خوان نعت' پر جمع کیا اور ایک غریب الدیار کی عزت بڑھائی۔ خضر نسواں مولوی سید ممتاز علی صاحب نے جو 'تہذیب' قدیم و جدید کے مجموعہ ہیں اپنے ادب کدہ میں یاد فرمایا۔ افسوس ہے کہ وقت کی قلت کے سبب میں وہاں کے مشہور کتب خانوں کو نہ دیکھ سکا۔ وہاں کی پبلک لائبریری [عوامی کتب خانہ] اور یونیورسٹی لائبریری [کتب خانۂ جامعہ] کی بڑی تعریف سنی ہے۔ تاہم قلمی کتابوں کے دو گنج کے

ذخیرے دیکھے۔ پہلا ذخیرہ سراج الدین آذر کے شوق اور محنت کا نتیجہ ہے۔ کئی سو قلمی کتابیں ہوں گی۔ اور یہ کل کی کل صرف پنجاب کے حدود کے اندر سے جمع کی گئی ہیں۔ اس ذخیرہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف فارسی کتابیں ہیں۔ فارسی تذکرے، دواوین، مثنویاں، تاریخیں، بیاضیں اور اسی قسم کی چیزیں ہیں۔ فارسی ادبیات کا اتنا بڑا نادر ذخیرہ شاید کتب خانہ حبیب گنج (نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کا کتب خانہ) کے سوا اور کہیں نہ ہو گا۔ کتب خانہ حبیب گنج میں بھی شاید اتنے دواوین اور مثنویاں اور نظموں کے مجموعے تو ہوں مگر اتنے تذکرے اور تاریخیں نہ ہوں گی۔ میں نے اس کا نام 'آذر کدہ' تجویز کیا۔ پروفیسر آذر کا بیان ہے کہ یہ کل کمائی چند سال کی ہے۔ وہ کالج کی چھٹیوں میں باہر نکل جاتے ہیں اور چند دنوں کی محنت میں اچھا خاصا شکار کر لاتے ہیں۔ مزید یہ کہ وہ خود ہی ان میں سے زخمی اور مجروح کتابوں کی مرہم پٹی بھی کرتے ہیں۔[6]

دوسرا ذخیرہ خواجہ محمد سلیم کے پاس نظر آیا۔ کتابیں ایک ٹرنک میں تھی زیادہ تر عربی کی، بعض فارسی اور ایک دو اردو کی تھی۔ عربی کتابوں میں علم النفس (سائیکالوجی) پر چند رسائل کا نادر مجموعہ تھا جو کہ میں نے دیکھا۔ اس میں ایسے مباحث معلوم ہوئے جو اب تک اس موضوع کی عربی کتابوں میں نظر نہیں آئے۔ مصنف کا نام نہیں۔ فارسی کتابوں میں رباعیات خیام کا نسخہ ۸۶۸ء کا لکھا ہوا تھا جو رباعیات کے بوڈلین لائبریری والے سب سے پرانے نسخہ کے دو برس بعد لکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر اقبال ان تمام صحبتوں میں شمع محفل تھے۔ انھوں نے تو 'شمع اور شاعر' لکھا ہے لیکن میں نے تو لاہور میں خود 'شاعر کو شمع' دیکھا۔ اور قدر شناسوں کو اس کا پروانہ پایا۔ ان کی صحبت لاہور کے نوجوانوں کی دماغی سطح کو بہت بلند کر رہی ہے۔ ان کے فلسفیانہ نکات، عالمانہ افکار، شاعرانہ خیالات ان کی آس پاس کی دنیا کو ہمیشہ متاثر رکھتے ہیں۔ ان کی 'زمزمہ پردازیوں' کا نیا مجموعہ زبورِعجم کے نام سے عنقریب سامعہ نواز ہونے والا ہے۔ میں نے کہا کہ فلسفہ عجم کے دشمن کو مناسب بھی یہی تھا کہ عجم کے ہاتھ میں زبور

یہ تمام مجموعہ اس وقت پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں منتقل ہو چکا ہے۔

دے کر ان کے خیالی فلسفہ کو مزامیر داؤد کی دعاؤں سے بدل دے اور ان کے کانوں کو زبور کا 'پردہ' رکھ کر قرآن کی نغمہ سنجیوں سے مانوس کر دے۔

لاہور سے جانے کے بعد علامہ سید سلیمان ندوی صاحب کے نام علامہ مرحوم کا جو پہلا خط ملتا ہے وہ پورے ایک سال کے بعد مورخہ مارچ ۲۹ء کا ہے اور اس زمانہ میں علامہ مرحوم زمان کی حقیقت فلسفہ اسلام کی تاریخ میں بہت استغراق سے مطالعہ کر رہے تھے اور کئی علماء کو خطوط بھی لکھے گئے۔ بعض نے التفات بھی کیا مگر بعض نے نہ معلوم کیوں جواب نہیں دیا۔ ان خطوط کے لکھنے میں راقم کا بھی حصہ ہے اور دوران قیام لاہور سید سلیمان صاحب نے جو تقریر علامہ کی انجمن حمایت سلام کے جلسہ میں ۱۶ اپریل ۲۷ء کی شب کو سنی، اس کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں "اقبال مرحوم کو اس بحث سے بڑی دلچسپی تھی۔"

میں نے اس پر لاہور میں ان کی ایک تقریر بھی سنی تھی اور اس خط کے جواب میں سید صاحب مرحوم نے امام رازی کی کتاب مباحث مشرقیہ کا ذکر کیا تھا اور وہ اس وقت لاہور میں دستیاب نہیں ہوتی تھی جیسا کہ ۱۸مارچ ۲۷ء کے علامہ کے خط سے بھی واضح ہے مگر اس وقت آپ کی تجویز پر یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن کو لکھ کر منگوا لی گئی تھی مگر علامہ نے سید صاحب سے درخواست کی تھی کہ اس کتاب کے خاص ضروری حصہ کا خلاصہ قلمبند کر کے ارسال کر دیں۔ مگر جب سید صاحب کی طرف سے خط کے آنے میں ذرا دیر ہوئی تو میں نے علامہ کے ایما سے آپ کو یاد دہانی کرائی[7] جس کے جواب میں آپ نے دسنہ بہار اپنے

[7] راقم نے خود علامہ مرحوم کے فرمانے پر مولانا محی الدین اجمیری کو بھی لکھ تھا کیونکہ اس زمانہ میں

وطن مالوف سے ۲۷ مارچ ۲۸ء (شوال ۴۶ھ) کو مجھے لکھا:

میں اس وقت مرکز سے دور ہوں، ڈاکٹر صاحب کے دو والا نامے میرے پاس بھی آئے ہیں۔ میں یکم اپریل کو اعظم گڑھ پہنچ سکوں گا۔ ڈاکٹر صاحب امام رازی کی مباحث مشرقیہ کا خلاصہ طلب فرماتے ہیں اس کی تعمیل بھی وہیں سے ہو سکے گی۔ ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دے دیجیے۔۔۔ دوسرا کارڈ بھی آپ کا ملا میں انشاء اللہ کل پٹنہ جاؤں گا۔۔۔۔۔

یہاں یہ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب لاہور میں امام رازی کی کتاب مباحث مشرقیہ آ گئی تو میں سیدھا علامہ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا۔ چونکہ یہ ذرا کسی قدر فاضلانہ معیار عربی میں تھی اس لیے آپ نے ادھر ادھر سے دیکھ کر کہا کہ کسی طرح اس کتاب کے ضروری حصص کا ترجمہ اردو میں ہو جائے تو بہت بہتر ہو گا چنانچہ میں نے اسے اپنے میزبان، عزیز دوست مولوی سعید احمد اکبر آبادی (مدیر برہان، پرنسپل مدرسہ کلکتہ) جو ان دنوں لاہور میں اپنی اعلیٰ تعلیم کے ضمن میں مقیم تھے سے اس کے ضروری حصہ کے ترجمہ کی خواہش کی۔ چنانچہ یوں ہوا کہ ہم دونوں مل کر بیٹھ جاتے اور وہ املا کراتے اور میں لکھتا اس عمل سے خاصہ حصہ ترجمہ ہو گیا اور اس کو علامہ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ چنانچہ علامہ نے پھر ۱۸ اگست ۱۹۳۳ء کے خط میں لکھا ہے کہ ''امام رازی کی مباحث مشرقیہ آج کل دیکھ رہا ہوں''۔ یعنی پانچ چھ سال تک آپ ایک ہی مسئلہ کے ضمن میں تحقیق کر رہے تھے۔ اگرچہ اس وقت آپ کے لیکچرز [خطبات] کا مجموعہ یورپ و ہندوستان میں طبع ہو چکا تھا اور آپ ہمیشہ یہی سید سلیمان ندوی صاحب کو لکھتے رہے کہ دار المصنفین کی طرف سے ہندوستان کے حکمائے اسلام پر ایک کتاب نکلی چاہیے اس کی سخت ضرورت ہے۔

معقولات اسلامی میں یہ بہت بڑے عالم شمار ہوتے تھے آپ مولوی فضل حق خیر آبادی متوفی ۱۲۷۸ھ کے تلمیذ تھے۔

اس کے بعد سید سلیمان ندوی صاحب اپریل ۱۹۳۳ء میں لاہور میں ادارہ معارف اسلامیہ لاہور کے جلسہ کے موقع پر تشریف لائے اور آپ نے ایک طویل مقالہ بعنوان ''لاہور کا ایک مہندس خاندان جس نے تاج اور لال قلعہ بنایا'' زیر صدارت علامہ سر اقبال پڑھا۔ یہ جلسہ لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کے سینیٹ ہال [ایوانِ بالا] میں منعقد ہوا تھا جس میں بڑے بڑے اہل علم نے شرکت کی تھی۔ جس کی روئیداد باقاعدہ طبع ہو چکی ہے۔

جب علامہ اقبال کا ۲۱اپریل ۳۸ء کو لاہور میں انتقال ہوا تو تمام عالم میں ماتمی جلسے ہوئے اور سید صاحب نے بھی معارف کے شذرات میں آپ کی وفات پر درد ناک الفاظ میں لکھا۔ مگر میں اسی زمانہ میں علامہ کی وفات سے دو تین روز قبل یورپ سے واپس آیا تھا۔ میں اکثر احباب سے کہا کرتا ہوں کہ پروردگار کو یہ سانحہ حائلہ راقم کی موجودگی میں وقوع میں لانا مقصود تھا تاکہ آخری ملاقات اور شرکت جنازہ کا موقع مل جائے چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی اپنے ایک خط مورخہ ۲ مئی ۳۸ء میں راقم کو لکھتے ہیں:

> آپ کی بخیریت واپسی پر مبارک۔۔۔ میری اور آپ کی ملاقات مرحوم ڈاکٹر اقبال کے ذریعہ ہوئی تھی اس لیے آپ کے اور میرے خطوں کے تبادلہ میں اس سانحہ عظیم کا ذکر ضروری ہے۔ مرحوم کی وفات پر چند رسمی غمگیں لفظوں کا اظہار ناکافی ہے۔ یہ وہ غم ہے جس کے اظہار کے لیے الفاظ کافی نہیں۔۔۔

علامہ سید سلیمان ندوی جون ۱۹۵۰ء میں پاکستان میں ہجرت کر کے آ گئے تھے اور یہیں کراچی میں آپ کا انتقال ۲۲نومبر ۱۹۵۳ء کو ہوا۔

۲

اقبال کی زندگی کا ایک ورق*

شیخ اعجاز احمد[1]

اقبال کے کلام یا ان کے فلسفے کے متعلق میرا کچھ کہنا چھوٹا منہ اور بڑی بات ہوگی۔ آپ سے خطاب کرنے کے لئے میرا انتخاب غالباً اقبال سے اس قرابت کی وجہ سے ہوا ہے جس پر مجھے فخر ہے۔* اس قرابت کی وجہ سے مجھے انھیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ ان کے متعلق بہت سی باتیں مجھے یاد ہیں جو میرے مشاہدے میں آئیں اور جن سے ان کے کردار کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں سے آج ایک کا ذکر کروں گا۔ شاید آپ کی دلچسپی کا باعث ہو۔

---

* سہ ماہی، اقبالیات اردو، جلد ۱، شمار ۴، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، جنوری ۱۹۶۱ء۔

[1] شیخ اعجاز احمد کے علامہ اقبال کے بارے میں تاثرات، یاداشتوں، تخلیقات اور اُن پر نقد و نظر کے لیے دیکھئے:
شیخ اعجاز احمد، ''اقبال کی زندگی کا ایک ورق''، مشمولہ، منتخب مقالات، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۳ء ؛ ، مظلوم اقبال، کراچی، اعجاز احمد، ۱۹۸۵ء؛ ______، ''علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش''، مشمولہ، علامہ اقبال کی تاریخ ولادت (ایک مطالعہ)، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۹۴ء؛ ______، ''علامہ اقبال کی تاریخ و سنِ ولادت'' (اردو) (انگریزی) اور اقبال احمد صدیقی ''شیخ اعجاز احمد سے ایک مصاحبہ''، مشمولہ، وحید قریشی + زاہد منیر عامر، مرتبہ، علامہ اقبال کی تاریخ ولادت (ایک مطالعہ)، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۹۴ء ؛ ______ ''مظلوم اقبال''، مشمولہ، اکبر رحمانی، مرتبہ، آموز گارِ اقبال، جلگاؤں، ایجوکیشنل اکادمی، ۱۹۹۵ء؛ وحید عشرت، ''مظلوم اقبال (شیخ اعجاز احمد)''، مشمولہ، اقبال ۸۶ء، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۰ء؛ ''اقبال کے قریبی لوگ: شیخ اعجاز احمد...''، عبدالمجید خان ساجد، اقبال' حیات عصر، ملتان، ادارہ تحقیق و ادب، ۱۹۹۴ء۔

* مصنف علامہ اقبال کے برادرِ بزرگ شیخ عطا محمد کے بیٹے ہیں۔ [مرتب]

چچا جان کو ملازمت سے ایک قسم کا تنفر سا تھا۔ ایم اے ہونے کے بعد کچھ عرصے تک وہ پہلے اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ، فلسفہ اور سیاست مدن کے لیکچرار [مدرس] اور اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر [معاون معلم] رہے۔ انگلستان سے واپس آنے کے بعد انھوں نے لاہور میں بیرسٹری [وکالت عدالت العالیہ] شروع کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ عرصہ تک وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے اعلیٰ پروفیسر بھی رہے۔ کالج کی ملازمت کی وجہ سے وہ صبح کے وقت کچہری نہ جا سکتے تھے۔ گورنمنٹ [حکومت] نے خاص طور پر ہائی کورٹ [عدالتِ عالیہ] سے یہ انتظام کرایا تھا کہ ان کے تمام مقدمات دن کے پچھلے حصہ میں پیش ہوا کریں چنانچہ قریباً ڈیڑھ سال تک اس پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ اس زمانے میں انڈین ایجوکیشنل سروس میں پنجاب میں غالباً کوئی ہندوستانی نہیں تھا اور یہ سروس زیادہ تر انگریزوں کے لئے مخصوص تھی۔ گورنمنٹ نے انھیں اس سروس کی پیشکش کی۔ لیکن انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور بیرسٹری کے آزاد پیشے کو پسند کیا۔ چچا جان اوروں کو بھی جہاں تک ہو سکے ملازمت سے گریز کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ جولائی ۱۹۱۹ء میں جب میں نے بی اے کا امتحان پاس کیا تو میری آئندہ تعلیم کا مسئلہ گھر والوں کے سامنے آیا۔ میری خواہش تھی کہ ایم اے میں داخل ہو جاؤں۔ چچا جان کی رائے تھی کہ مجھے لا کالج میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے داخل ہونا چاہئے۔ اس مسئلے کے متعلق کئی خطوط میں نے انھیں اور انھوں نے مجھے لکھے اور آخر مجبور ہو کر میں نے لا کالج میں داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ستمبر کی چھٹیوں میں جب چچا جان چند دنوں کے لئے سیالکوٹ آئے تو میں نے اس معاملے کو پھر چھیڑا لیکن انھوں نے اپنی رائے تبدیل نہ کی۔ یہ بات مجھے ناگوار ہوئی اور میں نے اس کے اظہار کا یہ طفلانہ طریق اختیار کیا کہ اپنے

کمرے میں بند ہو کر بھوک ہڑتال کر دی۔ دوپہر کے کھانے کے وقت تک تو گھر میں کسی کو اس بھوک ہڑتال کا شاید علم نہ ہوا۔ لیکن جب دوپہر کے کھانے کے لئے میں کمرے سے نہ نکلا تو والدہ صاحبہ نے کسی کو بلانے کے لئے بھیجا۔ میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا جو باوجود کھٹکھٹائے جانے کے نہ کھولا۔ پھر تو ایک تانتا بندھ گیا۔ والدہ صاحبہ اور دیگر رشتے دار مستورات یکے بعد دیگرے دروازہ کھلوانے کی کوشش کرتی رہیں لیکن اندر سے صدائے نہ برخواست [کوئی آواز نہ اٹھی] والا معاملہ رہا۔ آخر اس بات کی رپورٹ [اطلاع] چچا جان کو پہنچی۔ وہ نفسیات کے ماہر تھے انھوں نے مستورات سے کہا کہ میری بھوک ہڑتال کو کوئی اہمیت نہ دیں۔ اس کے بعد رات ہو گئی مگر کسی نے ہماری خبر تک نہ لی۔ آنتیں قل ھو اللہ پڑھنے لگیں۔ رات کے کھانے کے وقت جی چاہتا تھا کہ کوئی بھولے سے بھی دروازہ کھٹکھٹائے تو کھول دیں لیکن کوئی دروازے کے قریب تک نہ آیا۔

جب سب لوگ سونے کے لئے چھت پر چلے گئے تو والدہ صاحبہ نے دروازے پر دستک دے کر کہا کہ کھانا دروازے کے باہر پڑا ہے بھوک لگے تو کھا لینا۔ یہ کہہ کر وہ بھی چھت پر تشریف لے گئیں۔ کچھ وقت کے بعد یہ اطمینان کر کے کہ سب لوگ اوپر جا چکے ہیں، میں نے دروازہ کھولا۔ دروازے کے قریب ایک کشتی میں کھانا رکھا تھا۔ میں بھوک سے بے حال ہو رہا تھا۔ خوب سیر ہو کر کھایا اور پھر دروازہ بند کر کے کمرے میں ہی سو گیا۔ گرمیوں کا موسم تھا رات بے آرامی میں کٹی۔ صبح ناشتے کے وقت سے کچھ پہلے چچا جان دروازے پر آئے۔ دروازے کے اوپر والے حصے میں شیشے لگے ہوئے تھے جن میں سے میں نے انھیں دیکھ لیا اور فوراً اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ اس موسم میں گھر پر وہ اکثر دھوتی اور بنیان پہنے رہتے اس وقت بھی یہی لباس تھا۔ لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ کمرے میں داخل ہوئے اور

مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے معلوم نہ تھا کہ تم گاندھی کے چیلے بن گئے ہو''۔ میں نے ندامت سے سر جھکا لیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں والدہ صاحبہ ان کے لئے ناشتہ لے کر آئیں۔ ہمارے بازار میں ایک حلوائی تھا اس کے ہاں کا حلوہ پوری بہت مشہور تھا۔ چچا جان بھی جب سیالکوٹ تشریف لاتے تو کبھی کبھی اس سے شوق فرماتے۔ والدہ صاحبہ خاص طور پر ان کے لئے اس کا اہتمام فرماتیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن بھی ان کے لئے ناشتے میں چاء کے ساتھ وہی حلوہ پوری تھا۔ وہ ناشتے کے ساتھ ساتھ مجھ سے باتیں بھی کرتے رہے۔ ایل۔ایل۔بی میں داخلے کے خلاف میرا اعتراض صرف یہ تھا کہ وکالت میں کامیابی کے لئے میرے خیال میں تقریر کا ملکہ ضروری ہے۔ اور چونکہ مجھے یہ ملکہ حاصل نہیں لہٰذا میری طبیعت اس پیشے کی طرف راغب نہیں ہوتی۔ انھوں نے فرمایا کہ بڑی بڑی تقریروں کی ضرورت صرف اعلیٰ درجہ کے قانونی کام کے لئے ہوتی ہے جو فی الحال پنجاب میں ہے ہی نہیں۔ اور وکالت کے کام کے لئے طبعی لگاؤ کی اس قدر ضرورت نہیں جس قدر کہ محنت اور تجربے کی ہے۔ کہنے لگے کہ پریکٹس [مشق] سے آدمی وکالت کے سب پہلو سیکھ جاتا ہے اور اگر ایل۔ایل۔بی کے بعد تم پریکٹس شروع کروگے تو میں خود تمہیں کام سکھا دوں گا۔ آخر میں فرمایا کہ مجھے یقین ہے کہ اگر تم ایل۔ایل۔بی کی ڈگری حاصل کر لو تو آئندہ زندگی میں بہت فائدے اٹھاؤ گے۔ اور پریکٹس نہ بھی کرو تو عمدہ ملازمت ملنے میں سہولت ہوگی۔ میں نے پروفیسروں کی زندگی کے علمی ماحول کا ذکر کیا تو فرمایا: ہندوستانی کالجوں کی پروفیسری [معلّمی] میں علمی کام تو ہوتا نہیں البتہ ملازمت کی ذلتیں ضرور سہنی پڑتی ہیں۔ اپنی گورنمنٹ کالج کی پروفیسری کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک مرتبہ طالب علموں کی حاضری کے متعلق پرنسپل

نے مجھ سے کچھ اس طرح گفتگو کی جیسے کوئی اپنے کلرک سے کرتا ہے۔ اس دن سے ملازمت سے طبیعت کچھ ایسی بیزار ہوئی کہ ارادہ کر لیا کہ جہاں تک ہو سکے گا ملازمت سے پرہیز کروں گا۔ اگرچہ میری آئندہ تعلیم کے متعلق وہ اپنی رائے پر پختگی سے قائم تھے لیکن آخری فیصلہ مجھی پر چھوڑا۔ میں نے ہتھیار ڈال دیے اور لا کالج میں داخل ہونے پر رضامند ہو گیا۔ اس گفتگو کے دوران میں وہ ناشتہ ختم کر چکے تھے۔ تولیہ سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ والدہ صاحبہ سے مخاطب ہو کر مسکراتے ہوئے فرمایا: ''پوریاں بہت لذیذ تھیں اعجاز کو بھی کھلایئے۔ کل سے فاقہ کر رہا ہے۔'' رات کے کھانے کے خالی برتن کمرے میں ایک طرف رکھے تھے لیکن وہ ان کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے باہر چلے گئے۔ مجھے ایک عرصہ بعد معلوم ہوا کہ رات کا کھانا انھیں کی ہدایت کے بموجب دروازہ پر رکھا گیا تھا اور انھیں علم تھا کہ سب کے چھت پر چلے جانے کے بعد میں نے چپکے سے اٹھ کر کھانا کھا لیا تھا۔

۱۹۲۱ء میں میں نے ایل۔ایل۔بی کی ڈگری حاصل کر لی۔ پہلے چچا جان کا خیال تھا کہ میں چکوال ضلع جہلم میں پریکٹس شروع کروں۔ اس ضلع کا کام اکثر ان کے پاس آتا تھا اور وہاں کے مقدمے باز حلقوں میں ان کی کافی شہرت تھی۔ لیکن اپنے بعض احباب سے مشورہ کر کے آخر انھوں نے فیصلہ کیا کہ میں چار پانچ سال اپنے شہر سیالکوٹ میں پریکٹس کروں۔ چنانچہ میں نے وہاں کام شروع کر دیا۔ وکالت کا پیشہ ایک صبر آزما پیشہ ہے اور مبتدیوں کو ابتدائے کار میں بہت ہی ہمت شکن حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مجھے اس پیشے سے پہلے ہی سے بے رغبتی سی تھی لہٰذا چند مہینوں کے بعد جب ایک دوست سے یہ معلوم ہوا کہ انکم ٹیکس کے محکمہ میں انکم ٹیکس آفیسر کی چند

آسامیاں خالی ہیں تو میں نے درخواست دینے کا ارادہ کر لیا۔ چچا جان کو جب اس بارے میں تحریر کیا تو انھوں نے درخواست دینے کی اجازت دیتے ہوئے لکھا کہ ''وکالت کے پیشے کے متعلق جو تم نے لکھا ہے وہ موجودہ صورت میں درست ہے۔ اور ابتدا میں واقعی بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ مگر آئندہ زمانہ میں اس پیشے کے لئے ترقی کے بہت سے امکانات ہیں بشرطیکہ گورنمنٹ نے مزید اصلاحات منظور کر لیں۔'' ان دنوں محکمہ انکم ٹیکس کے کمشنر [منتظم] مسٹر ڈارلنگ تھے۔ وہ چچا جان سے انگلستان کے زمانے سے واقف تھے اور ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ میں نے جب چچا جان کو اس کے متعلق لکھا تو انھوں نے جواب دیا کہ ''ملازمت وغیرہ کے معاملے میں انگریزوں سے دوستی پر اعتماد کرنا ٹھیک نہیں مسلمانوں کو آج کل کسی قدر شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور وہ وقت دُور نہیں جب اس شک میں ہمارے ہم وطن بھی انگریزوں کے ساتھ شریک ہو جائیں گے۔'' مزید فرمایا کہ ''اس وقت تو بالعموم انہی مسلمانوں کو ملازمت کے لئے پسند کیا جاتا ہے (خاص کر اعلیٰ ملازمتوں کے لئے) جن کی اسلامیت حکومت کے خیال میں کمزور ہو اور اس کمزوری کا نام وسعت خیال یا لبرل ازم رکھا جاتا ہے۔'' آخر مجھے انکم ٹیکس آفیسر [افسر] مقرر کر کے چھ ماہ کی ٹریننگ کے لئے بھیج دیا گیا۔

انکم ٹیکس آفیسر صاحب، جن سے مجھے ٹریننگ لینا تھی، ایک ایسے ہندو خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو عیسائی ہو گیا تھا۔ ان کے تعصب کی کافی شہرت تھی۔ کچھ وہ سخت گیر تھے کچھ میں ناتجربہ کار اور رسم چاکری سے ناواقف۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ رہائش کے لئے ویسا انتظام نہ ہو سکا جس کا میں عادی تھا۔ اس جسمانی اور ذہنی کوفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اختلاج کی معمولی سی شکایت ہو گئی۔ چچا جان کو خبر ملی تو وہ متردد ہوئے اور مجھے لکھا کہ ''اپنا

مفصل حال لکھو۔ تو تمہارے لئے کوئی نسخہ تجویز کراؤں۔ یہ بھی فرمایا کہ اس قسم کی شکایت مجھے بھی طالب علمی میں ہو گئی تھی۔ گھبرانا نہیں چاہئے، اللہ تعالیٰ شفا دے گا۔"

میں نے جواب میں لکھا کہ صحت کے متعلق کوئی فکر کی بات نہیں البتہ انکم ٹیکس آفیسر کا رویہ ہمدردانہ نہیں۔ انھوں نے جواب میں جو خط لکھا اس کا اقتباس یہ ہے:

تمہارا خط ملا الحمد للہ کہ کوئی خاص شکایت تم کو نہیں۔ مجھے اس کا بڑا تردد ہو رہا تھا۔ کوئی فکر نہ کرنا اگر تم کام کر سکتے ہو تو کرو ورنہ کچھ پروا نہیں۔ آخر تمہارے ہاتھ میں ایک مفید پیشہ ہے جس سے تم فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ رزق انسان کا عمر و زید کے ہاتھوں میں نہیں، خدا کے ہاتھ میں ہے۔

رزق از حق جو ، مجو از زید و عمر
مستی از حق جو ، مجو از بنگ و خمر[2]

[کلیات فارسی[3]، ص ۷۳۱]

- تمام معاملات کو اللہ کے سپرد کرنا چاہئے اور ہر قسم کی فکر دل سے نکال دینا چاہئے۔ خدائے تعالیٰ کارساز ہے اور انسان کی فکر اس کے لئے باعث آزار ہے۔ بالفرض اگر تم کو اپنی موجودہ مہم میں کامیابی نہ ہوئی تو پھر کیا۔ خدائے تعالیٰ رزق کا کوئی اور سامان پیدا کر دے گا۔ اس میں بھی کوئی نہ کوئی حکمت ہے۔

---

[2] ترجمہ:

رزق اپنا مانگ حق سے، ایرے غیرے سے نہ مانگ
اپنی مستی مانگ حق سے، نشہ دے سے نہ مانگ

محمد اقبال، کلیاتِ اقبال فارسی: منظوم اردو ترجمہ، مترجم، عبدالعلیم صدیقی، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۲۰۰۵ء، ص ۱۴۰۱۔ (بعد ازاں کتاب میں اس کو مختصراً 'صدیقی' لکھا گیا ہے۔ مرتب)

[3] محمد اقبال، کلیاتِ اقبال: فارسی، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۴ء، ص ۷۳۱۔ (بعد ازاں کتاب میں اس کو مختصراً 'کلیات فارسی' لکھا گیا ہے۔ مرتب)

غرض یہ ہے کہ انسان کو اپنی صحت و حالت کے مطابق اپنے فرائض ادا کرنے میں کوتاہی نہ کرنا چاہئے اور نتائج خدا کے سپرد کر دینے چاہئیں۔

اس خط سے میرے دل کو بہت اطمینان ہوا۔ میں نے تندھی سے اپنے فرائض منصبی کو پورا کرنے کی کوشش جاری رکھی لیکن انکم ٹیکس آفیسر صاحب کا رویہ بدستور غیر ہمدردانہ رہا۔ میں نے پھر چچا جان کو خط لکھ کر مشورہ طلب کیا تو جواب میں ایک پوسٹ کارڈ پر صرف یہ شعر لکھا ہوا موصول ہوا۔

از غلامی فطرتِ آزاد را رُسوا مکن
تا تراشی خواجہ از برہمن کافر تری[4]

میرے لئے یہ شعر اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہو گیا۔ میں نے اسی دن ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور سیالکوٹ واپس آ گیا۔

ایک اچھی ملازمت کو میرے یوں ترک کر دینے کا ابا جان کو بہت افسوس ہوا۔ انھوں نے چچا جان کو اس کے متعلق لکھا ہوگا کیونکہ میں نے ان کا جواب ابا جان کے نام دیکھا جس میں لکھا تھا کہ ملازمت سے استعفیٰ ان کے مشورے سے دیا گیا ہے۔ وہ بد دل نہ ہوں اللہ تعالیٰ ضرور کوئی بہتر صورت پیدا کر دے گا۔

میں نے سیالکوٹ واپس پہنچ جانے کی اطلاع دی تو مجھے بھی خط لکھا جس کا کچھ حصہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ اس کا اقتباس سنئیے۔

ا۔ ترجمہ:

غلامی سے اپنی آزاد فطرت کو رسوا نہ کر
جب تک معبود گھڑتا رہے گا، برہمنوں سے بڑھ کر کفر کرے گا

مترجم: محمد سہیل عمر

تمہارا خط ملا۔امید ہے تمہاری صحت جلد اچھی ہو جائے گی اور جو تکلیف تم کو ملازمت پر جانے آنے میں ہوئی ہے وہ بعد کی کامیابی سے نسیاً منسیا ہو جائے گی۔ تلخ تجربات سے گھبرانا نہ چاہئے۔زندگی پر ان کا بھی ریسٹرینگ انفلوینس [محدود کرنے والا اثر] ہوتا ہے۔اگرچہ پہلے ان کی تلخی کا احساس ہوتا ہے اور روح کو ایذا پہنچتی ہے تاہم بعد میں فائدہ معلوم ہوتا ہے اور انسان اس بات کے لئے شکر گزار ہوتا ہے کہ اس کو اس قسم کے تجربات ہوئے۔جرمنی کے پیغمبری شاعر گوئٹے نے اپنے معاصر جوانوں کے روحانی اضطراب اور بے چینی کا مشاہدہ کر کے ان کو یہ پیغام دیا تھا:

[آرٹ سٹل ہیز ٹرتھ – ٹیک ریفیوج دیئر: فن میں ابھی تک سچائی ہے: اس میں پناہ لو]

اس وقت اسلامی دنیا کی وہی حالت ہے جو نپولین کے وقت میں جرمنی کی تھی اور میرا پیغام بھی مسلمان نوجوانوں کے نام وہی ہے جو گوئٹے نے دیا۔صرف اس قدر فرق ہے کہ میں نے آرٹ [فن] کی جگہ لفظ ریلیجن[مذہب] رکھ دیا ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔

آرٹ میں اطمینان ضرور ہے مگر قوت نہیں ہے۔مذہب میں اطمینان اور قوت دونوں چیزیں ہیں۔

یہ خط ۱۰ جون ۲۲ء کا لکھا ہوا ہے۔آج تقریباً ۳۳ سال بعد اگرچہ اسلامی دنیا کی وہ حالت نہیں جو ۲۲ء میں تھی لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں کو اس پیغام پر عمل پیرا ہونے کی اس سے زیادہ ضرورت نہیں جتنی ۱۹۲۲ء میں تھی۔اپنی زندگی میں اقبال نے اس پیغام کو مختلف انداز میں بار بار اپنے کلام میں دہرایا ہے۔آج ان کے انتقال کے بائیس سال بعد میں نے اس پیغام کو مسلمان نوجوانوں کے افادے کی خاطر اقبال کی اپنی اسی سیدھی سادی نثر میں دھرایا ہے جس میں انھوں نے یہ پیغام مجھے اس وقت دیا جب میں جوان تھا۔اور مصافِ زندگی میں شامل ہوتے ہی پہلے قدم پر ایک ناکامی سے دوچار ہوا تھا۔

چچا جان سے متعلق ان نجی واقعات کو آپ کے لئے بارِ سماعت نہ بناتا لیکن بقول اقبال:

بر آور ہر چہ اندر سینہ داری
سرودی ، نالہ ئی ، آہی فغانی[5]

[کلیات فارسی، ص ۲۱۲]

---

۵ ترجمہ:

جو بھی تیرے سینے کے اندر نہاں ہے، فاش کر
نغمہ و بانگ و سرود و نالہ و آہ و فغاں

[صدیقی، ص ۳۵]

۳

حیاتِ اقبال کا ایک گمشدہ ورق*

صالحۃالکبریٰ عرشی و عطاء الرحمان

یوں تو علامہ اقبال کے کلام کی تفسیر و توضیح اور اس کی ترویج و اشاعت کی خاطر ہندوستان اور پاکستان کے مختلف رسائل میں مضامین کی بھرمار ہے اور ان موضوعات پر مستقل کتابوں کا بھی روز بروز اضافہ ہو رہا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ علامہ اقبال کی زندگی کے نشیب و فراز اور ان کی حیات کے شب و روز سے، جو رنگ و نور سے روشن و تابندہ ہیں، لوگ بے پرواہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ چند ہی سال ایسے ہیں جن میں وہ ہستیاں ہمارے درمیان موجود ہیں جنھیں علامہ اقبال سے شرف ملاقات حاصل رہا ہے۔ ابھی ایسی آنکھیں باقی ہیں جنھوں نے اس عظیم شاعر کو دیکھا ہے اور ابھی وہ لب و گوش قوتِ سماعت اور طاقت گویائی رکھتے ہیں جنھوں نے اس محبوب اور محترم شخصیت سے گفت و شنید کا لطف اٹھایا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے تمام بزرگوں سے پُر زور درخواست کی جائے کہ وہ علامہ اقبال کی حیات کی ایسی بے شمار کڑیوں کو ملانے میں مدد دیں جو ان کی زنجیر ایام سے غائب ہیں۔ یہ لوگ نہ رہیں گے تو پھر ہمارے سارے ذرائع کمزور اور سارے وسیلے ایک حد تک یقین کی اس بلندی سے نیچے اتر آئیں گے جن پر وہ آج ہیں۔ اس لئے علامہ اقبال پر کام کرنے والے افراد اور ان کے

---

* سہ ماہی، اقبالیات اردو، جلد ۲، شمار ۴، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، جنوری ۱۹۶۲ء۔ یہ مقالہ بعد ازاں منتخب مقالات: اقبال ریویو، مرتبہ، وحید قریشی، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۳ء میں بھی شائع ہوا۔ (مرتب)

ساتھ ہی ساتھ اداروں پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ زیر بحث کام میں عملی دلچسپی لیں۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ شخصیت پر لکھنے والوں کو خصوصیت سے گفتنی اور ناگفتنی کی رسمی اور مذموم قید کو توڑ کر لکھنا چاہئے اور درج گزٹ [جریدہ] ہر وہ بات ہونا چاہئے جو اس شخصیت کو یا اس کے کارناموں کو سمجھنے میں کسی نہج سے بھی کارآمد اور مفید ہو سکتی ہو۔ اس موقعے پر حضرت یزداں میں بھی چپ نہ رہنے والے بندۂ گستاخ کی مثال جرأت پیدا کرنے میں ضرور مددگار ثابت ہوگی چاہے وہ خود اسی زہر ہلاہل کو قند نہ کہہ سکنے والے سے متعلق ہی کیوں نہ ہو۔

ہاں تو ہم سب کو چاہئیے کہ ان اصحاب کو اس اہم کام کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اگر یہ حضرات لکھنے پر آمادہ نہ ہوں تو ان سے باقاعدہ ملاقاتیں کی جائیں اور سوالات کے ذریعے وہ سب کچھ معلوم کرنے کی سعی کی جائے جس کے بارے میں یہ اندیشہ ہے کہ وہ ان کے سینوں میں ایک راز کی صورت ان کے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا۔

اسی جذبے کے تحت ایک بے حد دلچسپ اور بیش قیمت تاثراتی تحریر کے ساتھ میں بزم اقبال ریویو میں حاضر ہو رہی ہوں۔ یہ تحریر علامہ اقبال کے ایک شاگرد اور میرے والد (امتیاز علی عرشی صاحب) کے ایک عزیز اور قریبی دوست میاں عطاء الرحمٰن کی ہے، جو لاہور کے مشہور صاحب علم و ثروت خانوادے (میاں سر محمد شفیع باغبان پورہ) کے ایک فرد تھے۔ انھوں نے جیسا کہ خود انھوں نے لکھا ہے علامہ اقبال کو اس عالم میں دیکھا جس میں کم لوگوں نے دیکھا ہوگا۔

میاں صاحب کی یہ تحریر رام پور رضا انٹر کالج کی طرف سے منعقد کیئے گئے یوم اقبال کی ایک نشست (منعقدہ سنہ ۱۹۴۵ء) میں پڑھی گئی تھی جس کی صدارت مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین خان نے کی تھی۔ اس جلسے کی

دوسری اور تیسری نشست جس میں کلام اقبال سے متعلقہ تفسیری تصاویر کی نمائش بھی شامل تھی، رشید احمد صدیقی اور خواجہ غلام السیدین کے زیر صدارت ہوئی تھیں۔ یہ تصاویر رام پور کے دو مصوروں عظمت اللہ خاں اور اویاما کی کاوشوں کا نتیجہ تھیں۔

میاں صاحب مرحوم کے اس مضمون کی نقل میرے پاس محفوظ تھی جس کے محفوظ رہنے میں علامہ اقبال اور چچا عطاء الرحمان-دونوں سے عقیدت اور محبت کو دخل رہا ہے۔ امید ہے کہ میاں صاحب کی یہ تحریر ذوق و شوق کے ساتھ پڑھی جائے گی اور علامہ اقبال کی شخصیت کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے کچھ اور بھی پُرکشش ہوگی۔

مضمون نگار (میاں عطاء الرحمان مرحوم) کے بارے میں بھی یہ عرض کر دوں کہ وہ سالہا سال رام پور میں مقیم رہے اور ریاست کے محکمہ فنانس [مالیات] کے علاوہ بھی بہت سے شعبوں کے منتظم رہے اور آخر میں ہز ہائی نس [عالی مرتبت][1] کے پرائیویٹ سکریٹری [ذاتی معتمد] بھی۔ وہ بڑے خوش مزاج، زندہ دل اور پُر خلوص آدمی تھے۔ انھیں ادب سے نہ صرف لگاؤ تھا بلکہ دخل بھی تھا۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ لاہور سے شائع بھی ہوا تھا۔ تقسیم سے پہلے وہ واپس لاہور چلے گئے تھے اور وہیں انتقال ہو گیا۔

مضمون اور مضمون نگار کے تعارف کی رسم کے بعد مجھے رخصت کی اجازت دیجئے اور اصل تحریر ملاحظہ فرمائیے۔

> مجھے کالج چھوڑے ہوئے آج تیس برس سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ گو ایسا اتفاق کبھی کبھار ہوتا ہے لیکن جب بھی مجھے کسی ایسے مجمع میں شمولیت کا موقع ملتا ہے جیسا آج ہے تو شاید گرد و نواح کی فضا کے اثر سے میرے

---

[1] یہاں مراد نواب رام پور ہیں۔ (مرتب)

جسم میں خون ایک نئی طرح سے حرکت کرنے لگتا ہے۔اور میں اپنے دماغ میں اس قسم کے محسوسات گردش کرتے ہوئے پاتا ہوں جو کبھی ہوا کرتے تھے۔جب آتش جواں تھا۔

علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ پر بے شمار چیزیں شائع ہو چکی ہیں اور ہوتی رہیں گی لیکن ان کے کسی شاگرد نے بحیثیت شاگرد کے اپنے محسوسات بیان نہیں کئے اور مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے مہینوں مسلسل ان کے قدموں میں بیٹھ کر ان سے انگریزی کی وہ نظمیں پڑھیں جو اس زبان میں اپنی نوع کی بہترین تخلیقات خیال کی جاتی ہیں۔اور اس مطالعہ میں وہ لطف حاصل کیا ہے جو مشرق کے سب سے بڑے شاعر کی زبان سے مغرب کے سب سے بڑے شعراء کا کلام پڑھنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

اقبال کی یاد میں غالباً ان موقعوں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جب پہلے پہلے میں نے انھیں دیکھا۔ میاں شاہ نواز بیرسٹر ایٹ لا[وکیل عدالت العالیہ]مرحوم سے ان کے ہمیشہ خاص تعلقات رہے۔ان دونوں کی آپس میں بے انتہا بے تکلفی تھی۔اور آخر تک بھی یہ دونوں جب بھی ملتے گفتگو کا وہی پرانا رنگ شروع ہو جاتا۔ میرے چچا میاں سر محمد شفیع مرحوم اور میاں شاہ نواز ان دنوں لاہور ہائی کورٹ کے پہلو میں ایک ہی احاطے کی دو کوٹھیوں میں رہتے تھے۔ غالباً سنہ ۱۹۰۴ء یا ۱۹۰۵ء کا ذکر ہے جب میری عمر بھی تیرہ چودہ برس کی تھی۔ چچا سر شفیع کے یہاں میرا آنا جانا اکثر ہوتا تھا۔کیونکہ وہاں میرے دو ہم عمر رفیق رہتے تھے۔ مجھے خواب کی طرح لیکن صاف یاد ہے کہ جس کمرے میں ہم لڑکے بیٹھا کرتے تھے، اس کے برابر والے کمرہ میں ان زندہ دل جوانوں کی بے تکلفانہ محفل جما کرتی تھی۔ ہمیں اس میں شمولیت کی اجازت تو ہو ہی نہ سکتی تھی لیکن ہم دروازوں کے روزنوں میں سے اور کسی کھلے دروازے کے باہر دیوار سے لگ کر ان کی باتیں سنا کرتے تھے۔ اور جہاں اندر سے کسی بزرگ کے باہر نکلنے کی آہٹ ہوتی بھاگ کر چھپ جایا کرتے تھے۔اقبال ان دنوں محفل کے روح و رواں تھے۔اور ہم تو یہی سمجھتے تھے کہ حد درجہ کے رند مشرب ہیں۔ان کی آواز سب سے زیادہ

بلند ہوتی اور باتوں میں کھلا مذاق جس کے لئے پنجابی زبان خاص طور پر موزوں ہے۔

اسی زمانہ میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے انجمن کی پرانی شیرانوالہ دروازہ والی عمارت میں ہوا کرتے تھے۔اور چونکہ ان جلسوں میں اکثر اوقات دلچسپی کا کافی سامان ہوا کرتا، ہم بھی کئی کئی دنوں کا پروگرام[منصوبہ] ہونے کے باجود جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا شمولیت سے ناغہ نہیں کرتے تھے۔ خصوصاً ان دنوں میں جب اس وقت کے نوجوان شعر باز، جن میں سے خان احمد حسین خان اور اقبال خاص طور پر ممتاز تھے، اپنا کلام سنانے والے ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ اقبال ایک خوش وضع جوان کی صورت، ہلکی پھلکی سی عینک لگائے، گلے کا بٹن کھلا ہوا شلوار پہنے اسٹیج پر آیا کرتے تھے۔اور ان کے آتے ہی وہ ہنگامہ جو چندہ جمع کرنے اور خشک و بے لذت تقریر کرنے والوں کی وجہ سے تمام ہال[ایوان] میں برپا رہا کرتا تھا، تالیوں میں تبدیل ہو جاتا اور پھر وہ نغمے فضا میں گونجنے لگتے جن کے سننے کی آرزو میں ہم بھیڑ بھاڑ میں دھکے کھاتے ہوئے داخل ہو کر صبح سے چاروں طرف کے دباؤ کے جھونکے برداشت کئے ہوئے بیٹھے ہوتے تھے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ ہماری سمجھ میں آتا تھا یا نہیں کہ شاعران نکتہ سنج کیا کہہ رہے ہیں۔ بہرحال اقبال کے دلکش ترنم میں وہ مزا آ جاتا تھا جو شاید کسی محفل رقص و سرود میں بھی نہ آتا۔ اور ان کے اشعار کی داد اس بے تکلف دل سے نکلے ہوئے جوش کے ساتھ دی جاتی جو پنجاب والوں ہی کا حصہ ہے۔ ان جلسوں میں ہندوستان کی اسلامی دنیا کے بڑے بڑے آدمی شرکت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ مولوی نذیر احمد، شبلی نعمانی اور حالی جیسی ہستیوں کو پہلے پہلے میں نے وہیں دیکھا یا سنا۔ مولانا حالی بہت ضعیف تھے اور آواز اتنی نہ تھی کہ تمام حاضرین سن سکتے۔ لاؤڈ سپیکر [آلہ مکبرِ صوت] کا زمانہ نہ تھا۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ مولانا حالی اپنی نظم کے ایک دو اشعار پڑھ کر بیٹھ گئے اور مسودہ اقبال کو دے دیا جو انھوں نے اپنے مخصوص طرز میں سنایا۔ اور نظم پڑھنے سے قبل ایک فی البدیہہ رباعی کہی جس کے

قافیہ ردیف نام حالی کلام حالی تھے۔ الفاظ مجھے یاد نہیں۔ اس کے بعد اقبال ولایت چلے گئے اور ہم تعلیم کے جھمیلوں میں پھنس گئے۔ اور کئی سال تک سوائے اس کے کہ اقبال کی کوئی نئی غزل مخزن میں نکلی اور ہم نے جھٹ اپنی بیاض میں نقل کر کے اسے یاد کرنا اور گانا شروع کر دیا، ان کا سامنا نہ ہو سکا۔ ولایت سے واپس آنے کے بعد ان کے تغزل کے رنگ میں بھی فرق آتا گیا اور اس میں کم از کم اس وقت ہمارے لئے وہ رندانہ کیف نہ رہا جو ان کی ولایت سے بھیجی ہوئی اس مشہور غزل کے مقطع میں ہے:

نہ پُوچھ اقبالؔ کا ٹھکانا، ابھی وہی کیفیت ہے اُس کی
کہیں سر رہ گزر بیٹھا ستم کشِ انتظار ہو گا

[کلیات اردو[2]، ص 168]

اقبال کے ولایت سے آ جانے کے بعد غالباً سنہ ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء میں جب میں اسکول [مدرسہ] سے کالج میں پہنچ چکا تھا، انجمن حمایت اسلام کا جلسہ ہوا۔ جلسے سے پہلے یہ خبر اُڑائی گئی تھی کہ اقبال اپنی کوئی خاص نظم پڑھنے والے ہیں۔ بس پھر کیا تھا، وقت سے دو گھنٹے پہلے کالج سے بھاگ لئے اور ابھی چونکہ پنڈال اچھی طرح بھرا ہوا نہ تھا، عین ڈائس [منبر] کے کنارے جس کے اوپر بڑے لوگوں کے لئے کرسیاں بچھی تھیں، پاؤں نیچے لٹکا کر جم گئے۔ کالج کے چار یا پانچ نوجوان کہیں تہیہ کر کے بیٹھ جائیں تو انھیں کوئی رعب یا دھمکی دے کر اٹھا تو لے۔ خصوصاً ایسے پبلک [عوامی] جلسے میں جس میں اقبال نئی نظم پڑھنے والے ہوں۔ دو چار قانون اور حفظ امن کے چوکیدار آئے اور ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا لیکن یہاں وہ ''زمین جنبد نہ جنبد گل محمد'' [زمین ہل جائے مگر گل محمد اپنی جگہ سے جنبش نہیں کرتا: کاہل]

محمد اقبال، کلیاتِ اقبال: اردو، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص ۱۶۸۔ (بعد ازاں کتاب میں اس کو مختصراً 'کلیات اردو' لکھا گیا ہے۔ مرتب)

والا تہیہ کر کے بیٹھے تھے۔ کسی سے مذاق کسی سے پھبتیاں، کسی سے کامل خاموشی بلا حرکت کی سیاسی پالیسی [حکمتِ عملی] برتی گئی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ جب وقت کم رہ گیا اور جگہ کی قلت پیدا ہوئی تو ایک ہی ہلے میں ڈائس کے چاروں طرف کے کنارے پاؤں لٹکائے ہوئے نوجوانوں سے بھر گئے۔ اور کسی سینے پر کپڑے کا پھول لگا کر اکڑنے والے کی دال نہ گلی۔

غرض یہ کہ اقبال ڈائس پر آئے۔ چاروں طرف سے اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ بلند ہوا اور حسب معمول ڈائس پر تھوڑی بہت کھسر پھسر کے بعد وہ اپنی نظم پڑھنے کے کھڑے ہوئے۔ باوجود سامعین کے بے حد اصرار کے اقبال نے نظم کو ترنم سے پڑھنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ترنم سے پڑھنا نظم کے مضمون سے مناسبت نہیں رکھتا۔ معلوم ہوا کہ نظم کا عنوان 'شکوہ' ہے۔ اقبال پہلا بند پڑھنے لگے۔

کیوں زیاں کار بنوں، سُود فراموش رہوں
فکرِ فردا نہ کروں محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بُلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا مَیں بھی کوئی گُل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے، خاکم بدہن، ہے مجھ کو

[کلیات اردو، ص 190]

ہزاروں کے مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ کیا مجال کہ کسی کے سانس لینے کی آواز تک سنائی دے جائے۔ دوسرا بند شروع ہوا۔

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصۂ درد سُناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
ساز خاموش ہیں، فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم
اے خدا! شکوۂ اربابِ وفا بھی سُن لے

خُوگرِ حمد سے تھوڑا سا گِلا بھی سُن لے

[کلیات اردو، ص 190]

جوں جوں اقبال نظم پڑھتے جاتے تھے، سامعین کا جوش بڑھتا جاتا تھا اور ہر بند کے بعد تالیوں اور نعروں کا ایک طوفان برپا ہو جاتا تھا، جس کے خاموش ہونے تک اقبال کو بار بار رُکنا پڑتا تھا۔ اسی ہنگامہ پرور شان کے ساتھ یہ نظم شروع سے آخر تک پڑھی گئی اور نئے اسلامیہ کالج لاہور کے میدان میں آج تک انجمن حمایت اسلام کے یا دوسرے جتنے بھی جلسے ہوئے ان میں مجھے یاد نہیں کہ کسی میں اس قدر جوش و خروش کا اظہار کیا گیا ہو جس قدر اس قابل یادگار موقع پر ہوا۔

'شکوہ' کے شائع ہونے کے بعد چاروں طرف سے جوابوں کی بوچھاڑ شروع ہوئی۔ کھلے خطوط میں، اخباری مضامین میں، نثر میں، نظم میں، درجنوں پمفلٹ [کتابچے] شائع ہوئے۔ کچھ مولویوں نے اقبال کو بُرا بھلا کہا لیکن اقبال بالکل خاموش رہے۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد ان کی نظم شمع و شاعر نکلی۔ لیکن یہ قدرے مشکل زبان میں لکھی گئی تھی اور مقصد اور خیالات زیادہ تر سیاسی ہیں۔ سوائے اعلیٰ تعلیم یافتہ اسلامی پبلک کے اس کا لطف کوئی نہیں اٹھا سکتا۔ اس لئے گو اس کی شہرت بہت ہوئی لیکن عام نہیں۔

اس سے بھی چند ماہ یا شاید ایک سال بعد جنگ بلقان کے دوران میں خبر ملی کہ اقبال نے خود شکوہ کا جواب لکھا ہے، جو عنقریب کسی جلسہ میں پڑھا جائے گا۔ اس پر جوشِ امید ہر طرف پھیل گیا اور شاید اسی سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے مولوی ظفر علی خاں زمیندار والوں نے لاہور موچی دروازہ کے باہر باغ میں ایک عظیم الشان جلسہ کا اہتمام کیا اور مشہور ہوا کہ اس میں اقبال کی نظم ہوگی۔ شائقین کا ایک جم غفیر باغ کے پنڈال میں جمع ہوا۔ میں خود اس جلسہ میں موجود تھا۔ اقبال نے نظم اسی طرح ہر طرف سے داد کی بوچھاڑ میں پڑھی۔ ایک ایک شعر نیلام کیا گیا اور ایک گراں قدر رقم بلقان فنڈ [چندہ] کے لئے جمع ہو گئی۔

یہ نظم کئی لحاظ سے شکوہ کی نسبت بہت زیادہ بلند ہے اور اس میں پہلے مسلمانوں کو یہ بتا کر کہ ان کا شعار اسلامی نہیں رہا، وہی سبق دیا گیا ہے جو اقبال کی طرف سے اہل اسلام کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ یعنی یہ کہ زمانہ گذشتہ کی یاد میں رونے دھونے سے کچھ حاصل نہیں، اسلام فنا نہیں ہو سکتا۔ اگر کوشش کرو تو سب کچھ ممکن ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کوشش کرنے والوں ہی کے ساتھ ہے۔ چند بند سن لیجئے تاکہ اقبال کے دردِ قومی کے خلوص کا اندازہ ہو سکے۔ اللہ سے شکوہ کے بعد دیکھئے جواب کس طرح شروع ہوتا ہے۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پَر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے
قُدسی الاصل ہے، رفعت پہ نظر رکھتی ہے
خاک سے اُٹھتی ہے، گردُوں پہ گزر رکھتی ہے
عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا
آسماں چِیر گیا نالۂ بے باک مرا
آئی آواز، غم انگیز ہے افسانہ ترا
اشکِ بے تاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا
آسماں گیر ہُوا نعرۂ مستانہ ترا
کس قدر شوخ زباں ہے دلِ دیوانہ ترا
شکر شکوے کو کیا حُسنِ ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے
ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے، رہرو منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے، جوہرِ قابل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی، یہ وہ گِل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

[کلیات اردو، ص ۲۲۷-۲۲۸]

یہاں تک تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اقبال کے شکوہ کا جواب تھا۔ اب پیغام سنئے:

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی
کوکبِ غُنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گُلستاں خالی
گُل بر انداز ہے خُونِ شُہدا کی لالی
رنگ گردُوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سُورج کی اُفُق تابی ہے
مثلِ بُو قید ہے غُنچے میں، پریشاں ہوجا
رخت بردوش ہوائے چمنستاں ہوجا
ہے تنک مایہ تو ذرّے سے بیاباں ہوجا
نغمۂ موج سے ہنگامۂ طُوفاں ہوجا!
قُوّتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے

[کلیات اردو، ص 236]

انجمن کے جلسوں میں بعض اوقات حاضرین اور منتظمین کے درمیان بڑی دلچسپ نوک جھونک ہوا کرتی تھی۔ منتظمین میں عام طور پر اردو کے رِندوں [میں] غالباً سب سے زیادہ مقبول اخبار پیسہ اخبار کے ایڈیٹر[مدیر] مولوی محبوب عالم صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی عبدالعزیز پیش پیش ہوا کرتے تھے۔ لڑکے خوش طبعی سے انھیں پیسہ اور دھیلا کہا کرتے تھے۔ گو اس سے کسی قسم کی تحقیر مقصود نہ تھی لیکن عبدالعزیز صاحب خصوصاً چونکہ انجمن کے

جلسوں میں چندہ جمع کرنے کے لئے سب سے زیادہ پروپیگنڈا [تشہیر] کیا کرتے تھے۔ اس معاملہ میں ان کی اور حاضرین کے درمیان خصوصیت تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ جہاں کسی پسندیدہ شاعر کی نظم یا اچھے مقرر کی تقریر کا وقت آیا عبدالعزیز صاحب ڈائس پر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ آپ فلاں صاحب کی نظم سننے کے لئے بے چین ہیں، وہ موجود ہیں اور سنانے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن چندہ کی رقم مثلاً ساڑھے چار ہزار روپیہ تک پہنچ گئی ہے پانچ سو اور دلوایئے تو نظم شروع ہوگی۔ ورنہ جب تک پانچ ہزار روپیہ نہ ہوں گے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ اس پر لوگ جلدی جلدی دوڑتے اور رقم پوری کر دی جاتی تو نظم شروع ہوتی۔ اس کا جواب، حاضرین کو موقع مل جاتا تھا تو اس طرح دیا جاتا تھا کہ ڈاکٹر اقبال کی اگر کسی جلسے میں کوئی نظم نہیں ہوئی اور حاضرین میں موجود ہیں تو ایک صاحب کھڑے ہو گئے اور کہا کہ آج تو چندہ دیتے دیتے تھک گئے ہیں۔ آپ نے ہماری دلچسپی کا کوئی سامان مہیا نہیں کیا۔ لہٰذا علامہ اقبال سے ان کے چند غیر مطبوعہ اشعار سنوا دیجئے۔ اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو چندہ بھی نہیں ہوگا۔ تمام حاضرین تہیہ کر کے بیٹھ جاتے کوئی ایک پیسہ نہیں دیتا۔ چنانچہ منتظمین مجبور ہو جاتے اور علامہ کی منت سماجت کر کے اشعار پڑھواتے۔ ایک ایسا موقع مجھے یاد ہے کہ اقبال مسکرا کے اٹھے اور ایک فی البدیہہ رباعی مزاحیہ شان میں پڑھی۔ ٹھیک الفاظ مجھے یاد نہیں، کچھ اس طرح تھے: پلندہ باقی۔ بہت ہے چندہ باقی۔ اور ابھی تو رہتا ہے بندہ باقی وغیرہ۔ اور یہ سنا کر بیٹھ گئے۔ حاضرین نے پہلے تو خوب تالیاں بجا کر داد دی۔ اس کے بعد ایک صاحب اٹھے اور کہنے لگے کہ اس رباعی کا بہت بہت شکریہ۔ لیکن شوق پورا نہیں ہوا۔ حسرت رہی جاتی ہے۔ چنانچہ علامہ پھر اٹھے اور پھر چند اشعار سنا کر چندہ کی گاڑی کو دوبارہ چلتا کر دیا۔

ٹھیک تاریخیں یاد نہیں لیکن سنہ ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء کا ذکر ہے جب میں لاہور گورنمنٹ کالج میں بی۔اے میں پڑھتا تھا۔ اقبال کتنی مرتبہ اس کالج میں پڑھانے پر مامور ہوئے لیکن ہمیشہ فلسفہ کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اس مرتبہ شائد پرنسپل کی غیر موجودگی یا کسی اور وجہ سے ہماری جماعت کو انگریزی نظم کا

سبق دینا ان کے فرائض میں شامل ہو گیا اور ہماری بے حد خوش قسمتی تھی کہ ہم نے انگریزی زبان کے بہترین شعراء کی چند بہترین نظمیں ان سے پڑھیں۔ ان میں جہاں تک مجھے یاد ہے ملٹن کی 'پینسروسو'، 'للیجیسو' اور 'لیسڈاس' اور کیٹس کی 'اسابیلا' ڈرائڈن کی 'ماک ہیکنوئی' اور غالباً کولوج کی 'انسینٹ مرنر' شامل تھیں۔ 'گریز ایلیجی' کے علاوہ شیلے کی 'اڈونائس' جس کا میں خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں کیونکہ بلا مبالغہ یہ انگریزی زبان کی چند سب سے بلند نظموں میں سے ایک ہے۔ شیلے کا تخیل ہمارے مشرقی شعراء کی طرح گہرا اور پُر معنی ہوتا ہے۔ اور جس طرح ہمارے شعراء ایک ہی شعر میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں، اسی طرح شیلے کے ایک بند میں خیالات کا ہجوم ہوتا ہے، جن کو علیحدہ علیحدہ کر کے پوری طرح سمجھنے کے لئے قدرے محنت درکار ہوتی ہے۔ اس خاص نظم (Adonais) [اڈونائس] کے متعلق میں ذرا تفصیل سے کام لینا چاہتا ہوں کیونکہ اس کے بغیر استاد کی استادانہ حیثیت کی حقیقت کا اظہار نہیں ہو سکے گا۔ آپ کے معلمین تو جانتے ہوں گے لیکن آپ میں سے شاید ہی کوئی طالب علم ایسا ہو جسے معلوم ہو کہ یہ نظم شیلے نے اپنے دلی دوست اور مشہور شاعر (Keats) [کیٹس] کے مرثیہ کے طور پر لکھی تھی جس کا صرف چوبیس برس کی عمر میں، نقادوں کے نہایت بے رحمی سے اس کی بعض نظموں پر اعتراضات کرنے کے صدمہ سے انتقال ہو گیا تھا۔ یہ تمام نظم صحیح معنوں میں درد و غم کے اثرات سے معمور ہے اور ہر مصرع میں ایک زخم خوردہ دل کے خون کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ عجیب بات ہے، نظم کے آخری تین چار بندوں میں اس انتہائی مایوسی اور شدت غم کے ذکر کے ساتھ جو کیٹس کی جدائی سے شیلے پر چھا گیا تھا، شیلے کی اپنی موت کا جو اس نظم کے لکھنے سے تین چار سال بعد واقع ہوئی ہو بہو نظارہ موجود ہے۔ گویا یہ ایک قسم کی پیش گوئی تھی کہ میری موت اس طرح واقع ہونے والی ہے۔ گویا اول تو لکھنے والا شیلے، دوسرے اس کی وہ نظم جو انتہائی جذبے کی حالت میں لکھی گئی، اور تیسرے پڑھانے والا ڈاکٹر محمد اقبال جو خود گہرے تخیل کا بادشاہ ہے، اس مجموعہ

سے شاگردوں کی جماعت کے ان افراد پر جو حساس دل رکھتے تھے، وہ اثر کیا کہ تمام عمر فراموش نہیں ہو سکتا۔

اس نظم کے پچپن بند ہیں اور ڈاکٹر صاحب پینتالیس منٹ کے ایک کالج کے گھنٹے میں نو، نو مصرع کا ایک بند ہی روزانہ پڑھاتے تھے۔اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کو پڑھانے میں اور جماعت کو پڑھنے میں کتنا لطف حاصل ہوتا ہوگا۔جب شیلے کے خیالات کوعلامہ اقبال جیسا آدمی سمجھانے کی غرض سے واضح کرے اور ہر خیال کے ساتھ مقابلہ یا موازنہ کے طور پر اپنے اور اردو شعراء کے خیالات بھی پیش کرے تو سامعین کی خوش قسمتی کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ایک دریا تھا جو بہتا چلا آتا تھا۔علامہ کے منہ سے پھول جھڑتے تھے اور دل یہی چاہتا تھا کہ وہ اسی طرح پڑھاتے جائیں اور ہم دن بھر خاموش بیٹھ کر سنا کریں۔کالج کا گھنٹہ جو عام طور پر طالب علم کے لئے محنت سے چھٹکارے کی مسرت انگیز خبر لئے ہوئے آتا ہے، اس گھنٹہ کے ختم ہونے سے دل پر چوٹ کی شکل میں لگتا تھا اور با دل ناخواستہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلے جاتے تھے۔

میں چاہتا ہوں کہ شیلے کی (Adonais) سے مثال کے طور پر ایک چیز پیش کر دوں جس سے آپ کو مندرجہ بالا گھنٹوں کی کیفیت کا اندازہ ہو سکے۔

اس کے دوسرے بند کی آخری سطور میں شیلے کہتا ہے کہ ان کی قبر پر اُگے ہوئے پھولوں کی طرح جو دفن شدہ انسان کی بے ثباتی اور نفرت انگیز صورت پر ہنستے ہیں، کیٹس نے اپنی آنے والی ہولناک موت کو اپنے آخری نغموں سے اس طرح سجا کر چھپا رکھا تھا کہ وہ نظر نہیں آتی تھی۔

کسی قبر پر اُگے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر شیلے کے دل میں یہ خیالات پیدا ہوئے کہ ایک تو وہ پھول انسان کی بے ثباتی پر ہنستے ہیں، دوسرے وہ انسانی لاش کے ڈراؤنے پن کو اپنے حسن سے چھپا دیتے ہیں۔اس کے مقابلہ میں مرزا غالب فرماتے ہیں:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ان میں قبر کے پھولوں کو دیکھ کر غالب کے دل میں یہ خیالات پیدا ہوئے کہ یہ پھول ان دل فریب صورتوں کا ایک حصہ ہیں جو اس خاک میں دفن ہیں اور جنھیں ان کے حسن کی طاقت نمو نے مٹی کے باہر ظاہر کر دیا ہے۔

علامہ اقبال کا انگریزی تلفظ کچھ اچھا نہ تھا۔ شیلے کو شیلی کہتے تھے اور اردو فارسی بھی حد درجہ پنجابیت لئے ہوئے لہجے میں بولتے تھے۔ یعنی قاف کو کاف ہی کہتے تھے اور حقہ کو حکہ۔ اسی بنا پر مولانا نیاز فتح پوری نے اپنی مشہور ڈائری [روزنامچہ] میں اقبال کی صورت شکل اور طرزِ گفتگو کو نہایت غیر شاعرانہ بیان کیا ہے۔ لباس کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ یہاں تک کہ کالج یا ہائی کورٹ میں انگریزی سوٹ [پوشاک] پہن کر جاتے تھے تو وہ بھی ڈھیلا ڈھالا بغیر استری کے۔ ٹائی ٹیڑھی ہے تو ٹیڑھی ہی سہی۔ عام طور پر بندھی بندھائی بو چپکا لیا کرتے تھے۔ بوٹ میلے ہیں تو کچھ پرواہ نہیں۔ بالوں کی مانگ نہیں نکالتے تھے پیچھے کو برش کر لیا کرتے تھے۔ پہلے ہمیشہ ترکی ٹوپی پہنا کرتے تھے بعد میں بالدار سیاہ ٹوپی اختیار کر لی۔ باوجود اس کے کہ ہماری اس سال کی بی۔اے کی جماعت جو شروع سنٹرل ماڈل اسکول سے ہی اپنی شرارت پسندی کے لئے مشہور چلی آتی تھی۔ اور خصوصاً بُرے تلفظ والے پروفیسر کا تو ناک میں دم کر دیا کرتی تھی، ان کے گھنٹہ میں اس قدر خاموش ہو کر بیٹھ جاتی تھی کہ ایک تنکا بھی زمین پر گرے اور اس کی آواز سنائی دے جائے۔ مجھے یاد نہیں کہ اقبال نے کبھی کسی لڑکے کو کسی قصور پر سزا دی ہو بلکہ دھمکی تک کبھی نہیں دی۔ حیرت کی بات ہے کہ مجھے اب علم ہوا ہے کہ ان کی داہنی آنکھ بیکار تھی۔ جماعت میں ہمیشہ ان سے قریب بیٹھتا تھا لیکن میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ صرف ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ میں نے علامہ کو سگریٹ یا سگار پیتے کبھی نہیں دیکھا۔ گو سنا ہے کہ حقہ کے بہت شوقین تھے۔ کالج میں تو بغل میں ایک آدھ کتاب یا کلاس کا رجسٹر لئے، سر جھکائے کبھی کچھ گنگناتے ہوئے اِدھر اُدھر جاتے دکھائی دیتے تھے۔ کسی سے بات چیت نہ کرتے تھے۔

ان دنوں کالج میں ایک سوسائٹی [انجمن] بزم سخن کے نام سے تھی، جس

کے جلسے عام طور پر پندرھویں یا مہینے میں ایک بار ہوا کرتے تھے۔ لیکن زندہ دل پروفیسر شیخ نور الٰہی صاحب اس کے مستقل صدر تھے۔ ہر جلسہ میں اپنے کالج کے علاوہ دوسرے کالجوں کے اتنے طالب علم جمع ہو جایا کرتے تھے جتنے کمرے میں سما سکتے۔ اس بزم میں کالج کے لڑکے اپنا منظوم کلام جو زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہوتا سنایا کرتے تھے۔ بعض اوقات 'طرح' مقرر کر دی جاتی تھی جس پر سب مشق سخن کرتے تھے۔ اور چونکہ ہمارے صدر، میں پہلے عرض کر چکا ہوں، زندہ دل تھے، وہ متبذل قسم کی عریانی کے سوا ہر قسم کی بات کہہ لینے دیا کرتے تھے۔ آج کل کی طرح اس وقت شعراء میں اتنی عریاں پسندی بھی نہ تھی۔ لیکن مذاق اور پھبتیوں میں کالج کے کسی نہ کسی رنگ میں ممتاز طالب علموں اور پروفیسروں تک کو شعر میں باندھ لیا جاتا تھا، جس سے جلسہ کی دلچسپی روز افزوں تھی۔ خدا جانے اب تک وہ بزم قائم ہے یا نہیں۔ بہرحال اس وقت بہت کوشش کی گئی لیکن صدر بننا تو درکنار علامہ اقبال کبھی اس کے ایک جلسہ میں بھی شریک نہیں ہوئے۔ البتہ (College Day) [کالج ڈے: یوم کلیہ] کے موقع پر ہر سال کسی بھلے آدمی نے بہترین اردو نظم کے لئے ایک مستقل انعام مقرر کر رکھا تھا۔ اس مقابلہ میں جو لڑکے نظمیں بھیجتے ان کے جج [منصف] علامہ اقبال ہی ہوا کرتے یہاں تک کہ جب وہ کالج میں پڑھاتے بھی نہ تھے، تو یہ نظمیں فیصلہ کے لئے انھیں کے پاس بھیج دی جایا کرتی تھیں۔ بعد میں وہ نظمیں جو اول، دوم اور سوم درجہ پر رہتیں کالج ڈے کے دن تمام لڑکوں کے سامنے ان کے مصنف پڑھ کر سناتے اور انعام حاصل کرتے تھے۔ ویسے عام طور پر بھی علامہ ویسے نوجوانوں کے شعر کہنے کے خلاف تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ان کی پروفیسری کے دنوں میں جب وہ ہمیں پڑھاتے تھے، ہم ان کی کلاس کے دو تین لڑکے اپنی اپنی غزلیں لے کر ایک دن اکٹھے ان کے پاس گئے اور عرض کیا کہ ہم آپ کے شاگرد ہیں اور شعر کہنے کا شوق رکھتے ہیں۔ اگر کبھی کبھی آپ ہماری ناچیز کوشش دیکھ کر تھوڑی بہت اصلاح فرما دیا کریں تو بڑی عنایت ہوگی۔ فرمایا کہ بھائی میں کبھی کسی کے اشعار پر اصلاح نہیں دیا

کرتا۔ جو تمہارے دماغ میں آئے لکھو۔ لیکن اگر میری نصیحت مانو تو شعر کہنا چھوڑ دو۔ یہ مشغلہ اچھا نہیں۔

اقبال کے ملنے والے عام طور پر کہتے ہیں کہ اپنے گھر میں بہ فراغت بیٹھے ہوئے بھی جب کبھی بات چیت کے دوران کوئی اچھے اشعار پڑھے جاتے تو ان کے آنسو نکل آتے تھے۔ اور یہ تو مشہور ہے کہ شعر کہتے وقت اکثر اوقات زار و قطار رویا کرتے تھے۔ اور یہ بھی کہ ان سے عندالطلب شعر نہیں کہلوائے جا سکتے تھے، جب تک ان پر وہ خاص کیفیت طاری نہ ہو اور طاری ہو تو بیسیوں اشعار ایک وقت میں کہہ جاتے تھے۔ اس سے مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا ہے، حالانکہ وہ پڑھاتے وقت کتاب کے مضمون ہی سے سروکار رکھتے تھے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ سبق چھوڑ کر گویا جماعت سے باتیں کرنے لگے۔ جو نظم وہ پڑھا رہے تھے اس میں ایک مصرع کے یہ معنے تھے کہ شاعر کے لئے زبان کے الفاظ اظہارِ خیالات کو کافی نہیں ہوتے۔ اقبال کتاب کی طرف سے نگاہ اٹھا کر جماعت سے مخاطب ہو گئے اور فرمایا کہ آپ لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ شاعر کے دماغ میں جس وقت آمد ہوتی ہے تو اس کی کیا حالت ہوتی ہے۔ خیالات ایک طوفان کی طرح اُمڈے چلے آتے ہیں، اس کو ہر خیال کے لئے پہلے الفاظ تلاش کرنا پڑتے ہیں پھر عروض اور قافیہ ردیف کے مرحلوں کو طے کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ایک شعر بنتا ہے۔ اس وقت تک درجنوں ایسے خیالات بھول کر ضائع ہو جاتے ہیں جو اگر شعر میں آ جاتے تو اس مخصوص شعر سے شاید کہیں بہتر ہوتے۔ شاعر بعض اوقات سخت بے چین ہوتا ہے اور تڑپتا ہے کہ اظہارِ خیال کے لئے اسے الفاظ نہیں ملتے یا ملتے ہیں تو اس خاص بحر یا قافیہ یا ردیف میں ادا نہیں ہو سکتے جس میں نظم یا غزل لکھی جا رہی ہے۔

۴

ملفوظاتِ اقبال*

یوسف سلیم چشتی[1]

---

* سہ ماہی، اقبالیات اردو، جلد ۵، شمار ۲، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، جولائی ۱۹۶۴ء۔

[1] یوسف سلیم چشتی کی علامہ اقبال کے بارے میں تخلیقات کے لیے دیکھئے:

یوسف خان سلیم چشتی دہلوی، مولانا سید حسین احمد مدنی کے بارے میں اپنے سابقہ گستاخانہ اور توہین آمیز رویے پر اعترافِ تقصیر و اظہارِ ندامت اور علامہ اقبال مرحوم کے اشعار متعلقہ مولانا سید حسین احمد مدنی کی ضروری وضاحت، لاہور، جامعہ مدنیہ؛ ____________، محکماتِ عالم قرآنی، لاہور، مجلس تعمیر ملت، ۱۳۶۹ھ [۱۹۴۹ء]؛ ، "پیش لفظ"، شاہ محمد عبدالغنی، قرآنی تصوف اور اقبال، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۶۱ء؛ ________، علامہ اقبال مرحوم ، لاہور، خدام القرآن، ۱۹۷۷ء؛ ________، "اقبال اور فلسفۂ مغرب"، مشمولہ، سلیم اختر، مرتبہ، اقبالیات کے نقوش، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۷ء؛ ________، "اقبال اور سید حسین احمد مدنی"، مشمولہ، قاضی افضل حق قرشی، مرتبہ، اقبال کے ممدوح علما، لاہور، مکتبۂ محمودیہ، ۱۹۷۷ء؛ ________، "اقبال اور سلطان ٹیپو شہید"، مشمولہ، طاہر تونسوی، مرتبہ، اقبال اور عظیم شخصیات، لاہور، تخلیق مرکز، ۱۹۷۹ء؛ ، "اقبال کا تصورِ فقر"، مشمولہ، بہار اللہ آبادی، مرتبہ، تفسیرِ اقبال، سری نگر، گلشن پبلشرز، ۱۹۸۲ء؛ ، "اقبال کے بعض ملفوظات"، مشمولہ، منتخب مقالات، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۳ء؛ ________، شکوہ. جواب شکوہ مع شرح، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۷ء؛ ________، "ضربِ کلیم اور قادیانیت"، مشمولہ، تحسین فراقی ، مرتبہ، نقد اقبال. حیات اقبال میں، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۹۲ء؛ ________، "ملفوظات اقبال"، مشمولہ، جعفر بلوچ، مرتبہ، مجالس اقبال، لاہور، دارالتذکیر، ۲۰۰۲ء؛ ________، "مسافر"، مشمولہ، محمد اکرام چغتائی، مرتبہ، اقبال. افغان اور افغانستان، لاہور، سنگِ میل، ۲۰۰۴ء؛ ________، "اقبال اور رومی"، مشمولہ، محمد اکرام چغتائی، پیر رومی و مرید ہندی، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء؛ ________، "ضربِ کلیم اور قادیانیت" اور "علامہ اقبال اور ان کے نقاد"، مشمولہ، محمد متین خالد، مرتبہ، علامہ اقبال اور فتنہ قادیانیت، ملتان، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ، ۲۰۰۵ء؛ اسرار احمد + یوسف سلیم چشتی + نذیر نیازی، اقبال اور ہم، لاہور، مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، ۱۹۹۵ء۔

تمہید

علامہ اقبال مرحوم سے میری ملاقاتوں کا سلسلہ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۸ء تک جاری رہا۔ ان سے ملاقات کی تقریب اس طرح پیدا ہوئی کہ اس زمانے میں مجھے فلسفہ، الٰہیات اور علم کلام کے مسائل سے بڑی دلچسپی تھی۔ ان تینوں علوم میں ہستیٔ باری کا مسئلہ بنیادی اور سر فہرست ہے لیکن کانٹ نے اپنی 'تنقید عقل خالص' میں اثبات واجب الوجود پر جس قدر اولہ حکماء اور متکلمین نے قائم کی ہیں، سب کا ابطال کر دیا ہے اس لئے میں حضرت علامہ سے ملنے گیا اور ان سے عرض کی کہ کیا آپ کے ذہن میں اثبات واجب پر کوئی ایسی دلیل ہے جو ناقابل رد ہو؟ انھوں نے کہا کہ عقل انسانی اس معاملے میں عاجز ہے۔ خدا کی ہستی کا یقین دلائل عقلیہ سے پیدا نہیں ہو سکتا اس کے لئے مشاہدۂ باطنی درکار ہے۔ عقل یہ تو بتا سکتی ہے کہ اس کائنات کا کوئی خالق یا صانع ہونا چاہئے لیکن اس کا اثبات نہیں کر سکتی کہ یہ بات اس کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہے۔ اس لئے حکماء کی تقلید کے بجائے اربابِ کشف و شہود یعنی صوفیائے کرام کی پیروی کرو بالفاظِ دگر رازی کو چھوڑ کر رومی کو اپنا راہنما بناؤ۔

اس ملاقات کے بعد ان سے رسم و راہ کا سلسلہ قائم ہو گیا اور کچھ عرصے کے بعد میں نے ان کے کلام کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اس مطالعے کی بدولت مجھے ان کی شخصیت سے بڑا لگاؤ پیدا ہو گیا۔ اور جہاں تک ممکن ہو

یوسف سلیم چشتی کی حیات و خدمات کے لیے دیکھئے:
تسکینہ فاضل، ''یوسف سلیم چشتی بحیثیت شارح اقبال''، مشمولہ اقبالیات کا تنقیدی جائزہ، سری نگر، اقبال انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۹۷ء؛ اختر النساء، مرتبہ، مقالات یوسف سلیم چشتی، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۹۹ء؛ ''یوسف سلیم چشتی بحیثیت شارح اقبال''، تسکینہ فاضل، اقبال کے نقش ہائے رنگا رنگ، سری نگر، فاضل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء۔

سکا میں نے ان سے استفادہ کیا۔ چونکہ وہ یہ بات پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کے ارشادات ان کے سامنے بیٹھ کر قلم بند کروں اس لئے گھر واپس آ کر جو کچھ ذہن میں محفوظ رہتا تھا اسے ایک ضخیم نوٹ بک [بیاض] میں لکھ لیا کرتا تھا۔ ۱۹۵۵ء میں دریائے راوی کے سیلاب کا پانی میرے گھر میں بلائے بے درماں کی طرح داخل ہوا اور صدہا کتابوں کے ساتھ وہ نوٹ بک بھی برباد ہو گئی۔ یہ ملفوظات جو میں ذیل میں درج کر رہا ہوں ان متفرق کاغذات اور پاکٹ بکس [جیبی کتب] میں مندرج تھے جو ایک ٹرنک [صندوق] میں محفوظ تھیں۔

ا۔ ۱۹ مارچ ۱۹۳۰ء۔ ۶ بجے شام۔ میکلوڈ روڈ

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کی کہ یاجوج اور ماجوج سے کون اشخاص مراد ہیں؟ فرمایا کہ یہ عربی زبان کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ بابلی زبان کے الفاظ گاگ اور میٹ گاگ کا معرب ہیں۔ بابل (عراق) میں دو طبقے آباد تھے۔ ایک وہ جس کے پاس زمین تھی دوسرا وہ جو اس سے محروم تھا۔ جدید اصطلاح میں جاگیردار اور مزدور طبقہ کہہ سکتے ہیں۔

پھر میں نے حکیم اسپنوزا کا تذکرہ چھیڑا تو علامہ نے فرمایا کہ میری رائے میں اس کی اخلاقی تعلیمات، جناب مسیح کی تعلیمات سے برتر ہیں۔ یہودی قوم میں صرف دو آدمی پیدا ہوئے جن کا نام قیامت تک زندہ رہے گا یعنی جناب مسیح اور حکیم اسپنوزا۔ پھر فرمایا کہ حکیم اسپنوزا ایک اونچی قسم کی وحدۃ الوجود کا قائل تھا۔

جناب مسیح کی ولادت بھی عام انسانوں کی طرح ہوئی تھی۔ میرا یہی خیال ہے مذہب کی بنیاد عقل پر نہیں ہے بلکہ باطنی تجربے پر ہے۔ لیکن جب کوئی شخص اپنے تجربے کو دوسروں کو سمجھانا چاہتا ہے تو وہ عقل سے کام لے

سکتا ہے یعنی ہم عقل کی مدد سے اپنے تجربے کو دوسروں کے لئے قریب الفہم بنا سکتے ہیں۔

مذہب کی غائت 'حضور' ہے اور یہ کیفیت شعور کی گرفت میں نہیں آ سکتی۔ انسان اس کیفیت کو بذریعہ الفاظ بیان نہیں کر سکتا۔

خدا کا کامل طور پر ادراک کر لینا، عقل کے بس کی بات نہیں ہے۔ انسانی ذہن خدا کا کامل تصور نہیں کر سکتا۔ وہ صرف اس کے مظاہر کا تصور کر سکتا ہے یعنی خدا کا ظہور جس طرح فطرت میں ہوتا ہے بس اس کا ادراک کر سکتا ہے۔

۲۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۳۰ء۔ میکلوڈ روڈ

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بقائے روح کے مسئلہ پر گفتگو میں فرمایا ''انسان کو اس کے حصول کے لئے جدوجہد کرنی لازم ہے۔ یہ وہ نعمت ہے جو مفت نہیں ملتی۔ صرف وہ لوگ اس نعمت کو حاصل کر سکیں گے جو اس کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں گے۔ سکرات الموت میں بھی کوئی مصلحت ضرور پوشیدہ ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی بدولت خودی میں یہ طاقت پیدا ہو جائے کہ وہ انتشار سے محفوظ رہ سکے۔''

پھر فرمایا ''شوپن ھاور کا نظریہ یہ ہے کہ آرزو منبعٔ شر ہے لیکن میری رائے میں یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ خواہشات کو فنا مت کرو بلکہ ان کو احکام شرع کے تابع کر دو۔''

۳۔ یکم اکتوبر ۱۹۳۰ء۔ میکلوڈ روڈ

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وحدۃالوجود کے مسئلے پر گفتگو میں فرمایا ''ایک صوفی جب اپنے باطنی واردات کا بیان کرتا ہے تو اسے وحدت وجود

سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ ذاتِ واحدہ کائنات کی اصل ہے۔

دُنیا کا کوئی مذہب تصوف کے عنصر سے خالی نہیں ہے حتیٰ کہ سائنس[آزمودہ علم] میں بھی تصوف کا رنگ جھلکتا ہے۔

"اسپنوزا، فلسفی تھا صوفی نہیں تھا کیونکہ صوفی وہ ہے جو وراء العقل ذرائع سے علم حاصل کرتا ہے۔ اسپنوزا عقلی اعتبار سے حلول (Pantheism) کا قائل تھا۔ لیکن شیخ اکبر ابن عربی حلول کے قائل نہیں تھے کیونکہ یہ نظریہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔"

ختم نبوت کے عقیدے پر گفتگو میں انھوں نے فرمایا کہ "ختم نبوت کے عقیدے کی ثقافتی قدر و قیمت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ہمیشہ کے لئے اعلان فرما دیا کہ آئندہ کسی انسان کے ذہن پر کسی انسان کی حکومت نہیں ہوگی۔ میرے بعد کوئی شخص دوسروں سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری بات کو بلا چون و چرا تسلیم کر لو۔ ختم نبوت ایسا عقیدہ ہے جس کی بدولت انسانی علم کے دائرے کو وسعت نصیب ہو گئی۔

علی محمد باب کی دریافت یہ ہے کہ:

۱۔ جہاد منسوخ ہو گیا

۲۔ صاحب الہام کے لئے کسی گرامر (صرف و نحو) کی پابندی لازمی نہیں ہے۔ یعنی الہام ایسی عبادت میں بھی ہو سکتا ہے جو گرامر کے لحاظ سے غلط ہو۔

پھر فرمایا "حقیقت کا علم انسان کو کئی طریقوں سے حاصل ہو سکتا ہے مثلاً مشاہدات جسمی یا مشاہدہَ باطنی (وارداتِ قلبی)

میں نے کبھی ایسا کوئی شعر نہیں کہا جسے میں نے اپنے قلب میں محسوس نہ

کیا ہو اور محض عقل کے زور سے کہہ دیا ہو۔یعنی میرے اشعار میں فکر اور جذبہ دونوں کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

۴۔ ۳؍اکتوبر ۱۹۳۰ء۔ میکلوڈ روڈ

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔عرض کی کہ مذہب کا دار و مدار عقل پر ہے یا جذبات پر؟ یہ سوال اس لئے کیا تھا کہ چند روز پہلے ایک جرمن عالم الٰہیات شلائر میخر کی کتاب میں پڑھا تھا کہ مذہب کی بنیاد عقل کے بجائے جذبے (فیلنگ) پر ہے۔یہ سن کر علامہ نے فرمایا:

یہ سوال ہی غلط ہے۔حقیقت حال یہ ہے کہ جب ایغو (خودی) اپنے گرد و پیش کی دنیا کا جائزہ لیتی ہے تو اس میں جذبہ، شعور اور ارادہ تینوں کار فرما ہوتے ہیں۔مذہب کا تعلق انسان سے ان تینوں پہلوؤں سے ہے۔کوئی جذبہ ایسا نہیں ہے جس میں خودی کے دوسرے پہلو (شعور اور ارادہ) شامل نہ ہوں۔انسان خالص جذبات یا خالص شعور یا خالص ارادے سے نا آشنا ہے۔ مثلاً علم الدین شہید[2] کا جذبہ اس کی مکمل شخصیت کی گہرائی سے اُبھرا تھا اس میں شعور اور ارادہ بھی شامل تھا۔

ایمان دراصل عمل کی استعداد کا نام ہے۔اسلام ایسے ایمان کو پسند نہیں کرتا جو انسان کو عمل پر آمادہ نہ کر سکے۔

وحی میں بھی شعور اور ارادے کے عناصر شامل ہوتے ہیں۔جو لوگ مجھ سے ملنے آتے ہیں ان میں اکثر ایسے ہوتے ہیں جن کا دل سوزِ دروں سے بیگانہ ہوتا ہے یعنی وہ 'متکلم نعش' [بولتی ہوئی لاشیں]ہوتے ہیں۔جو آدمی دوسروں کے لئے اسوہ (نمونہ) ہوتا ہے اس کی کوئی پرائیوٹ[ذاتی] زندگی

---

[2] [غازی] علم الدین شہید نے ۱۹۲۹ء میں لاہور کے ایک کتب فروش راجپال کو قتل کر دیا تھا کیونکہ اس نے سرکارِ دوعالم ﷺ کی شان میں گستاخی کی تھی۔[ایک گستاخانہ کتاب شائع کی تھی] علامہ مرحوم تا دم وفات اس کے عشق رسول [ﷺ] کے مداح رہے اور ہمیشہ اس کا ذکر بڑی عقیدت کے ساتھ کیا کرتے تھے۔

نہیں ہوتی یعنی وہ خلوت اور جلوت دونوں میں یکساں زندگی بسر کرتا ہے بالفاظ دگر اس کے ظاہر اور باطن میں مطابقت ہوتی ہے۔

۵۔ اکتوبر ۱۹۳۰ء۔میکلوڈ روڈ۔۶ بجے شام

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کی کہ مذہب اور نظریۂ حلول (Patheism) میں بنیادی فرق کیا ہے؟ فرمایا کہ نظریۂ حلول کی رُو سے خدائے مشخص کا وجود نہیں ہے۔ جبکہ مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ خدا ایک شخص (Person) ہے جو سنتا ہے، جواب دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب میں خدا کا تصور انسانی خودی کے رنگ میں کیا جاتا ہے۔ اور ہم ایسا تصور کرنے پر مجبور ہیں۔

ہمارا تصورِ طاقت (Force) ہمارے تصورِ ارادہ سے ماخوذ ہے۔ ''آخر الامر اس بات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ صرف باطنی تجربہ ہی کسی مذہب کی صداقت کا معیار ہے۔ ہاں جب تم اپنے باطنی تجربے کو دوسروں کو سمجھاؤ گے تو عقل سے کام لے سکتے ہو۔

الٰہیات دراصل اپنے باطنی تجارب کو دوسروں کو بذریعہ عقل سمجھانے کا دوسرا نام ہے۔

میں نے اسی زمانے میں خطبات مدراس کا پہلی مرتبہ مطالعہ کیا تھا۔ ان خطبات کی خوبیاں بیان کیں تو فرمایا ''اگر یہ کتاب المامون کے عہد میں لکھی گئی ہوتی تو تمام دنیائے اسلام میں ایک غلغلہ برپا ہو جاتا۔''

پھر فرمایا ''دراصل میری یہ کتاب آئندہ فلسفۂ اسلام پر قلم اٹھانے والوں کے لئے ایک مقدمہ کا کام دے گی۔

۶۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۰ء۔ میکلوڈ روڈ۔ 5½ بجے شام

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ملوکیت کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ میں نے یہ دریافت کیا کہ اسلام ملوکیت کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔ فرمایا ''اسلام کو ملوکیت سے کوئی علاقہ نہیں ہے وہ ملوکیت کی ہر صورت کو مذموم قرار دیتا ہے۔ اسلام میں ملوکیت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ پھر فرمایا ملوکیت کی بنیاد، انسان کا یہ جذبہ ہے کہ وہ طاقت حاصل کرنا چاہتا ہے تاکہ دوسروں پر حکومت کر سکے اور اس طاقت کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ دوسرا اس میں شریک ہو۔

ملوکیت کا طریق کار یہ ہے کہ بادشاہ، قوم میں تقسیم اور تفریق کا رنگ پیدا کرتا ہے تاکہ وہ ثالث کا فرض انجام دے سکے اور اس طرح متصادم جماعتوں کو یقین دلاتا ہے کہ تمہاری عافیت کے لئے میرا وجود ضروری ہے۔

ملوکیت کا ثمرہ یہ ہے کہ محکوم قوم میں:

(الف) فسق و فجور پیدا ہو جاتا ہے

(ب) اعلیٰ ادنیٰ اور ادنیٰ اعلیٰ ہو جاتے ہیں

(ج) محکوم قوم رفتہ رفتہ اخلاقِ حسنہ سے عاری ہو جاتی ہے۔

اس سلسلے میں ملکۂ سبا کا قول لائق مطالعہ ہے۔

قَالَتۡ إِنَّ الۡمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرۡيَةً أَفۡسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهۡلِهَا أَذِلَّةً ۖ وَكَذٰلِكَ يَفۡعَلُونَ

(القرآن، النمل: آیت ۳۴)

[بولی بیشک بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں اسے تباہ کردیتے ہیں اور اس کے عزت والوں کو ذلیل اور ایسا ہی کرتے ہیں][3]

۷۔ ۱۳؍ دسمبر ۱۹۳۰ء۔ میکلوڈ روڈ

---

3 اس کتاب میں موجود آیاتِ مبارکہ کا ترجمہ امام احمد رضا خان کے ترجمۂ قرآن کنزالایمان سے لیا گیا ہے

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خدا اور انسان کے باہمی رشتے پر گفتگو چلی تو علامہ نے فرمایا:

حقیقی معنی میں صرف خدا ہی موجود ہے۔ انسان موجود ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔

چو موج می تپد آدم بہ جستجوی وجود
ہنوز تا بہ کمر در میانۂ عدم است[4]

(زبورِ عجم)

[کلیات فارسی، ص ۳۹۸]

پھر فرمایا:

God is in effort as seen through man.

[گاڈ اِز اِن ایفرٹ ایز سین تھرو مین: خدا اس کاوش میں ہے جو انسان کے نقطۂ نظر سے دیکھی جا سکے]

پھر فرمایا:

خدا کے سوا اور کوئی شے حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے۔

فرمایا کہ ''اس بات کی تائید نہ فلسفے سے ہو سکتی ہے نہ الٰہیات سے کہ خدا وہاں ہے اور انسان یہاں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا اور انسان مد مقابل ہستیاں نہیں ہیں۔

اگر خواہی خدا را فاش بینی

---

[4] ترجمہ:

مثال موج ہے بشر وجود کی تلاش میں
مگر ابھی کمر تلک ہے درمیانۂ عدم

[صدیقی، ص ۸۴۱]

خودی را فاش تر دیدن بیاموز[5]

[کلیات فارسی، ص ۸۴۲]

اگر زیری ز خود گیری زبر شو
خدا خواہی بخود نزدیک تر شو[6]

[کلیات فارسی، ص ۴۳۴]

ہیگل کا نظریہ یہ ہے کہ میرا وجود خدا کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اس کا وجود میرے لئے۔

پھر فرمایا:

موت بھی زندگی ہی کا ایک رُخ (Aspect) ہے اس لئے اس سے ہراساں نہیں ہونا چاہیئے۔

کوئی شخص ہمہ اوست کا مفہوم لفظوں کے ذریعہ سے دوسرے کو نہیں سمجھا سکتا۔اس کا تعلق وجدان سے ہے نہ کہ ادراک سے۔

اگر ہم خدا، خودی یا کسی اور شے کو جوہر قرار دیں تو ان میں سے کسی کی ہستی کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ صفات، جوہر میں پائی جاتی ہیں یعنی وہ قائم بذات غیر ہیں اس لئے کوئی غیر یعنی جوہر ضرور

---

[5] ترجمہ:

آرزو معرفت حق کی جو تو رکھتا ہے
خود شناسی کا زمانے میں قرینہ بھی سیکھ

[صدیقی، ص ۱۸۷]

[6] ترجمہ:

اب اگر تو زیر ہے خود گیری سے بن جا زبر
گر خدا کو چاہتا ہے خود سے ہو نزدیک تر

[صدیقی، ص ۸۸۹]

موجود ہے۔ حالانکہ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔اس لئے ہم خدایا خودی کو جوہر نہیں کہہ سکتے۔

۸۔ ۴؍ ستمبر ۱۹۳۱ء یوم جمعہ-۵ بجے شام-میکلوڈ روڈ

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ موصوف یکم ستمبر کو لاہور سے روانگی کا قصد کر چکے تھے مگر فوری علالت کی وجہ سے التوا واقع ہو گیا۔

میں نے عرض کی کہ آپ کے الہ آباد کے خطبہٗ صدارت کو میں اپنے اشاعت اسلام کالج کے طلبہ کو سبقاً سبقاً پڑھا رہا ہوں۔فرمایا تم نے اچھا کیا مگر اس میں دوامی قدر و قیمت (Permanent value) کی چیز تو صرف شروع کا حصہ ہی ہے یعنی اسلام اور قومیت۔اسے خاص توجہ سے پڑھنا چاہئے۔اور اگر ہو سکے تو اس کی شرح لکھنی چاہیئے۔

پھر فرمایا ''شاید مسلمانوں نے کسی سیاسی خطبہ کو اس ذوق و شوق سے نہیں پڑھا ہوگا جیسے اس خطبے کو پڑھا ہے اور نہ اس قدر زیادہ افراد نے کسی خطبے کو اس قدر لائق اعتناء سمجھا ہوگا۔

میں نے عرض کی کہ ایمان اور عقل میں کیا رشتہ ہے؟ فرمایا ''دونوں جداگانہ چیزیں ہیں۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ایک دوسرے کے معاون ہیں، بعض کی رائے میں عقل بمنزلہ خادم ہے اور ایمان مخدوم ہے وغیرہ۔ لیکن میری رائے یہ ہے کہ ان کو مخلوط نہ کیا جائے، دونوں اپنی اپنی جگہ رہیں۔

حضورِ انور ﷺ سے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ اسلام کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تو زبان سے کلمہٗ شہادت ادا کرے، نماز پڑھے، روزہ رکھے، زکوۃ دے اور اگر استطاعت ہو تو حج کرے۔ پھر انھوں نے پوچھا کہ ایمان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ

تو ایمان لائے اللہ پر، ملائکہ پر، کتابوں پر، رسولوں پر، قدر خیر و شر من اللہ [اچھی اور بُری تقدیر اللہ ہی کی طرف سے ہے] پر اور یوم آخرت پر۔ پھر انھوں نے پوچھا احسان کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کر گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر یہ حالت ممکن نہ ہو تو پھر یہ محسوس کر گویا وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔"

حدیث بیان کرنے کے بعد علامہ نے فرمایا کہ دراصل یہ اسلام ہی کے تین مراتب ہیں اور ایمان اور احسان میں بہت تھوڑا سا فرق ہے۔ یہ احسان والی کیفیت ہی دراصل اسلام کی روح ہے اور کیفیت ایمان عمل صالح سے پیدا ہوتی ہے۔

پھر فرمایا "ایمان کے جس قدر ارکان ہیں وہ سب کے سب، عقل کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہیں۔ عقل زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی ہے کہ ان کے ممکن یا غیر ممکن ہونے کا فتویٰ دے دے مثلاً

Whether the concept of 'God' is logically possible or not[7]

یعنی تصورِ ذاتِ باری عقلاً ممکن ہے یا نہیں؟

اب ظاہر ہے کہ قیامت، حشر و نشر، وزنِ اعمال، جنت و نار وغیرہ کا ہمیں کوئی شخصی تجربہ نہیں ہے۔ اس لئے عقل ان امور سے متعلق نفیاً یا اثباتاً کچھ نہیں کہہ سکتی۔ وہ تو صرف مادیات میں چل سکتی ہے۔ یا ان باتوں میں جو ہمارے تجربے یا مشاہدے میں آ چکی ہیں۔ مثلاً جزو اپنے کل سے چھوٹا ہوتا ہے۔

---

[7] علامہ مرحوم کی عادت تھی کہ اپنی گفتگو میں خصوصاً فلسفیانہ قیل و قال میں اکثر اوقات انگریزی کے جملے بول جایا کرتے تھے۔ میں نے ان ملفوظات میں چند جملے بطور یادگار بجنسہٖ نقل کر دیے ہیں۔ میری نوٹ بکس [کتبِ یادداشت] میں انگریزی کے بہت سے جملے محفوظ تھے۔

پھر فرمایا ''جیسا کہ میں کئی دفعہ واضح کر چکا ہوں، ہم خدا کو مجرد عقل سے نہیں پا سکتے (عقل اس کا ادراک نہیں کر سکتی) اسے باطنی مشاہدے یا تجربے کی بدولت جان سکتے ہیں اور مذہب جیسا کہ اربابِ علم جانتے ہیں تجارب کے ایک طویل سلسلے کا نام ہے۔ چونکہ خدا لامتناہی (Infinite) ہے اور وہ ہر لحہ نئی تجلی فرماتا رہتا ہے (کما قال: کل یوم ہو فی شان[القرآن، الرحمٰن، آیت ۲۹] یعنی حق تعالیٰ ہر لحہ اپنی ذات کی نئی تجلی کرتا رہتا ہے) اس لئے اس کی ہستی سے متعلق ہمارے مشاہدات اور تجاربِ باطنی بھی لامتناہی ہیں۔ نیز یہ ضروری تو نہیں کہ ہمارا آج کا تجربہ کافی یا آخری یا معیاری قرار پائے۔ عین ممکن ہے کل ہمیں بہتر اور برتر تجربہ حاصل ہو جائے۔

پس ثابت ہوا کہ ایمان ایک ترقی پذیر کیفیت ہے جس میں روز بروز اضافہ ہو سکتا ہے۔ اور یہ بات قرآن حکیم سے بھی ثابت ہے کہ ایمان میں بیشی ہو سکتی ہے:

(إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ ءَايَٰتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَٰنًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ)(القرآن، الانفال:آیت ۲) [ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ یاد کیا جائے ان کے دل ڈر جائیں اور جب ان پر اس کی آیتیں پڑھی جائیں ان کا ایمان ترقی پائے اور اپنے رب ہی پر بھروسہ کریں]

پھر فرمایا ''ہاں عقل کو اس حالت میں مذہبی عقائد یا مسلمات پر تنقید کا حق حاصل ہے جب وہ مسلمات، تحکمانہ (Dogmatic) [ڈاوَگمیٹک] رنگ میں پیش کئے جائیں مثلاً فلاں بات پر ایمان لے آؤ ورنہ نجات نہیں ہوگی۔ الحمد للہ اسلام میں کوئی Dogma [ڈاوَگما: محکم] نہیں ہے یعنی اسلام کسی بات کو زبردستی نہیں منواتا۔ قرآن جس قدر عقائد تلقین کرتا ہے، ان کی راستی پر دلائل عقلیہ مرتب کرتا ہے۔

پھر فرمایا ''اگر ایک شخص کو اپنی ذات میں خدا کی ہستی کا تجربہ یا مشاہدہ

ہو گیا ہے تو، پھر عقل کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس میں دخل دے۔ اور سچ پوچھو تو عقل کو اس باطنی تجربے اور مشاہدے سے سروکار بھی کیا ہو سکتا ہے؟ یہ تجربہ تو عقل کی رسائی سے بالاتر ہے۔

جب کوئی شخص اچھا شعر کہتا ہے یا اچھی تصویر بناتا ہے تو اس پر تنقید کے لئے کسی مہندس یا منجم کے پاس نہیں جاتا بلکہ کسی شاعر یا مصور کے پاس جاتا ہے۔ لہٰذا ایک فلسفی یا منطقی، کسی باطنی مشاہدے پر کس طرح تنقید کر سکتا ہے۔ یاد رکھو! مذہبی تجارب (مشاہداتِ باطنی) عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔

آخر میں عود الی المقصود [وعدہ کرنے کا ارادہ] کے انداز میں فرمایا کہ ایمان اس کیفیت کا نام ہے جو انسان کو عمل پر آمادہ کر دے یعنی مومن وہ ہے جس سے اعمال صالحہ خلوصِ قلب کے ساتھ سرزد ہوں نہ اس لئے کہ وہ دوزخ سے خوفزدہ ہے یا جنت کا آرزو مند ہے بلکہ اس لئے کہ اس کی ذہنیت ہی ایسی ہو گئی ہے کہ اگر وہ اعمالِ حسنہ ادا نہ کرے تو اسے راحت قلبی نصیب نہیں ہو سکتی۔ بالفاظ دگر نکوکاری اس کی طبیعت ثانیہ بن جائے۔ کم از کم میں اس بات کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں کہ ایک آدمی مومن بھی ہو اور بدکار بھی ہو۔ ہاں ایک مسلم گناہ کا ارتکاب کر سکتا ہے۔

۹۔ ۲۷ مئی ۱۹۳۲ء۔ ۸ بجے دن۔ میکلوڈ روڈ

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ڈرائینگ روم میں تنہا بیٹھے ہوئے تھے۔ میں رسالہ نگار لکھنؤ بابت ماہ مئی ساتھ لایا تھا۔ اس میں ان کی شاعری پر فنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی گئی تھی۔ اسے پڑھ کر فرمایا ''خدا جانے مسلمانوں کو یہ توفیق کب حاصل ہوگی کہ وہ وزن اور بحر سے بالاتر ہو کر معانی تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ اس کے بعد دیر تک شاعری کے مقصد پر گفتگو کی۔

پچھلی ملاقات میں، میں نے عرض کی تھی کہ اسرارِ خودی کے بعض اشعار آپ سے سمجھنا چاہتا ہوں۔چونکہ اس امر کی اجازت دے دی تھی اس لئے آج اسرارِ خودی بھی ساتھ لایا تھا۔اشارہ پا کر میں نے پہلا شعر پڑھا:

پیکر ہستی ز آثار خودی است[8]

[کلیات فارسی، ص 32]

فرمایا "ہر شے میں خودی موجود ہے۔ پتھر کو لے لو۔اگر تم کمزور ہو تو تم سے اٹھائے نہیں اٹھے گا۔اس میں وزن ہے اور یہی اس کی خودی ہے۔ درخت کو کاٹو تو مشکل سے کٹے گا۔غرض ہر شے کسی نہ کسی رنگ میں قوت مزاحمت (Power of resistance) رکھتی ہے اور یہی اس کی خودی ہے۔ یہی اس کی ہستی کا ثبوت ہے کہ وہ ہے۔

غیر او پیداست از اثبات او[9]

فرمایا کہ ایغو [خودی] کے لئے غیر ایغو[بے خودی] کا ہونا ضروری ہے۔ جب تک آپ غیر کو ثابت نہ کریں، ایغو کوثابت نہیں کر سکتے۔ ایغو کو مشخص کرنے کے لئے اسے اغیار سے متمیز کرنا ضروری ہے، اور اس امتیاز کے لئے دوسری اشیاء کا وجود ضروری ہے جن کے مقابلے میں یا موجودگی میں

---

[8] ترجمہ:

پیکر ہستی کا آثار خودی سے ہے وجود

[صدیقی، ص 251]

[9] ترجمہ:

اس کا غیر اس کے (اللہ کے) وجود کے اثبات سے ظاہر ہوتا ہے۔

[مترجم: محمد سہیل عمر]

ذہن کسی خاص شے کے وجود کا تصور کر سکتا ہے۔ الغرض انا کے لئے غیر انا کا وجود ضروری ہے۔

باطل از قوت پذیرد شان حق[1110]

[کلیات فارسی، ص ٦٦]

فرمایا کہ قوت ایسی شے ہے کہ اگر یہ حاصل ہو جائے تو باطل میں بھی حق کی ایک شان پیدا ہو جاتی ہے اور اس میں شک بھی کیا ہے۔ نصرانیت کو دیکھ لو۔ چونکہ اس وقت اس کے پیروؤں کو قوت حاصل ہے، اس لئے بہتوں کے حق میں باعث مزلت اقدام بنی ہوئی ہے۔

زندگانی محکم از لاتقنطوا ست

[کلیات فارسی، ص ١٠٧]

فرمایا "یاد رکھو غم اور خوف یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ خودی کو تباہ کر دیتی ہیں۔ اور ایک مسلمان جب تک ان دو عیبوں سے پاک نہ ہو جائے حقیقی معنی میں مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اور ان کے ازالے کی صورت یہ ہے کہ انسان، توحید الٰہی کو اپنے دل میں پختہ کر لے بایں طور کہ پھر شک دل میں راہ نہ پا سکے۔ یعنی اسے یہ یقین ہو جائے کہ جب تک خدا نہ چاہے، کوئی

---

[110] ترجمہ:

زندگی کی محکمی لا تقنطو میں ہے نہاں

[صدیقی، ص ٣٨٥]

[11] ترجمہ:

دیتی ہے باطل کو بھی قوت وقار و شان حق

[صدیقی، ص ٣١٠]

طاقت مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ پھر اس کے دل میں نہ حزن راہ پا سکتا ہے نہ خوف۔ اگر غیر اللہ کا خوف کسی درجے میں بھی دل میں موجود ہے تو خودی کبھی ہرگز نہیں اُبھر سکتی۔

بیم غیر اللہ عمل را دشمن است[12]

[کلیات فارسی، ص ۱۰۸]

فرمایا ہم جملہ مظاہر فطرت سے ڈرتے ہیں۔ زلزلے سے، آگ سے، امراض سے، سانپ سے، تاریکی سے، شیر سے وغیرہ۔ محض اسی لئے کہ ہم موت سے ڈرتے ہیں لیکن اگر ہمیں یہ یقین ہو جائے کہ موت ایک مرحلہ ہے جو روحانی ترقی کے سلسلے میں لازماً پیش آتا ہے تو ہم موت سے خوفزدہ نہیں ہو سکتے۔ موت بھی زندگی ہی کی ایک شان (Aspect) ہے۔ موت زندگی کے خاتمے کا نام نہیں ہے بلکہ موت وہ دروازہ ہے جس میں سے ہو کر ہم نئی دنیا میں داخل ہوتے ہیں۔

کائنات میں کوئی شے تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ جب ہم کہتے ہیں کہ دنیا کی کوئی حقیقت نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ کائنات سراب (Illusion) ہے بلکہ یہاں جو کچھ ہے مومن کی نگاہ میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے کیونکہ اس کا مطمع نظر بہت بلند ہوتا ہے۔ وہ مادی ساز و سامان سے مطلق مرعوب نہیں ہوتا کیونکہ ہر شے فانی ہے۔

اگر ہم یہ یقین کر لیں کہ کائنات میں یا میں ہوں یا خدا ہے تیسری کوئی

---

[12] ترجمہ:

بیم غیر اللہ ہے تیرے عمل کا بیخ کن

[صدیقی، ص ۳۸۷]

ہستی نہیں ہے تو پھر خوف کیسا؟ یعنی ہم مومن اس وقت بن سکتے ہیں جب خدا کے سوا کسی کا وجود ہماری نگاہ میں نہ سمائے۔

رمز قرآں از حسین آموختیم[13]

[کلیات فارسی، ص ۱۲۲]

فرمایا کہ تعلیماتِ قرآنی کی روح یہ ہے کہ مومن وہ ہے جو باطل کا مقابلہ کرے اور مطلق ہراساں نہ ہو یعنی ایسے موقع پر نفع یا نقصان کا خیال دل میں نہ لائے۔ شہید کو شہید اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے معتقدات کی سچائی پر اپنے خون سے گواہی دیتا ہے۔

ایک فرنچ مصنف نے لکھا ہے کہ اسلام ایک آسان مذہب ہے۔ والٹیئر نے اس کے جواب میں یہ کہا کہ اسلام آسان مذہب نہیں ہے۔ دن میں پانچ مرتبہ نماز پڑھنا، موسم گرما میں روزے رکھنا، زکوۃ دینا اور حج کرنا یہ باتیں آسان نہیں ہیں۔ میں نے دل میں کہا اسلام کی حقیقت سے نہ معترض واقف ہے نہ مجیب۔ بے شک اسلام نے نماز، روزہ، زکوۃ اور حج کا حکم دیا ہے مگر اسلام کا نصب العین ان ارکان سے بالاتر ہے۔ نماز پڑھنی آسان ہے مگر باطل کے مقابلے میں صف آرائی ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ انسان جان دے دے مگر فرعون کے سامنے سر نہ جھکائے۔

ماسوی اللہ را مسلمان بندہ نیست

---

[13] ترجمہ:

نکتہ قرآں ہمیں سکھلا دیا شبیر نے

[صدیقی، ص ۴۱۰]

پیش فرعونی سرش افکندہ نیست[14]

[کلیات فارسی، ص ۱۲۲]

ہمارے زمانے میں انور پاشا شہید نے اسی اصول پر عمل کیا۔انھوں نے ترکستان میں آزاد اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔چونکہ مشیت ایزدی کو منظور نہ تھا اس لئے وہ کامیاب نہ ہو سکے مگر انھوں نے روسیوں کے آگے سر تسلیم خم نہیں کیا۔بلکہ مردانہ وار موت کو لبیک کہا اور ابدی زندگی حاصل کر لی۔

در جہان نتوان اگر مردانہ زیست
ہمچو مردان جانسپردن زندگیست[15]

[کلیات فارسی، ص ٦۵]

۱۰۔ ۳رجون ۱۹۳۲ء -یوم جمعہ - میکلوڈ روڈ - ۵ بجے شام

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔باہر بیٹھے ہوئے تھے اور ایک صاحب سے اپنی کوٹھی کے لئے زمین کی خریداری کے مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے۔میں

---

14 ترجمہ:

رب کا بندہ ہے مسلماں غیر کا بندہ نہیں
وہ کسی فرعون کے آگے سرافگندہ نہیں

[صدیقی، ص ۴۰۹]

15 ترجمہ:

گر نہ ممکن ہو سکے مردانہ انداز حیات
جان مردوں کی طرح سینے میں ہے راز حیات

[صدیقی، ص ۳۰۸]

خاموش بیٹھا رہا۔جب وہ صاحب چلے گئے تو آپ نے حقے کے چند کش لئے اور میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا ''مجھے مسلمانوں کی حالت پر رونا آتا ہے۔ ان میں غیرت کا مادہ بہت کم رہ گیا ہے۔اسی لئے انھیں اب اتنی تمیز بھی نہیں ہے کہ جس کی وہ خوشامد کرتے ہیں اس سے انھیں کچھ فائدہ بھی حاصل ہوگا یا نہیں۔ جس شخص کو صاحب اقتدار دیکھتے ہیں اس کی خوشامد کرنے لگتے ہیں۔اور یہ مسئلہ کہ جسے وہ فائدہ سمجھتے ہیں دراصل اس کی قیمت (Value) کیا ہے، اس قدر اونچا ہے کہ اس تک ان کے ذہنوں کی رسائی بھی نہیں ہو سکتی۔اس کے بعد مجھے پڑھنے کے لئے اشارہ کیا۔ میں نے یہ شعر پڑھا:

شعلہ ہای او صد ابراہیم سوخت
تا چراغ یک محمد ﷺ بر فروخت[16]

[کلیات فارسی، ص ۳۳]

فرمایا ''اس سے پہلے یہ شعر آ چکا ہے:

عذر این اسراف و این سنگین دلی
خلق و تکمیل جمال معنوی[17]

---

[16] ترجمہ:

کتنے ابراہیم اس کے شعلوں میں جلتے رہے
تب چراغ مصطفیٰ ﷺ سے دشت و در روشن ہوئے

[صدیقی، ص ۲۵۲]

[17] ترجمہ:

عذر اس اسراف اور سنگیں دلی کا ہے یہی
لذت تخلیق و تکمیل جمال معنوی

[صدیقی، ص ۳۰۸]

[کلیات فارسی، ص ۳۳]

مطلب یہ ہے کہ فطرت بظاہر خونریزی کرتی ہے لیکن جمال باطنی کی تکمیل اسی سے ہوتی ہے۔ جب ملائکہ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی خلافت ارضی ہمیں عطا کی جائے انسان تو بہت خصیم اور خونریز ہے اور ہم ہر وقت آپ کی تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں تو اللہ نے ان کی تردید تو نہیں کی مگر یہ فرمایا: اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالاَ تَعْلَمُوْنَ یعنی خدا نے اس کائنات کی تخلیق ایک خاص نہج پر کی ہے۔ خصومت اور فسک دم، دونوں باتیں انسان کی فطرت میں ودیعت کی ہیں۔ اگر وہ چاہتا تو تکمیل جمال معنوی کے لئے کوئی اور صورت پیدا کر سکتا تھا مگر اس نے یہی پسند کیا کہ جدوجہد اور جنگ و جدل سے جمال کی تکمیل ہو۔ اسی لئے اس نے فرشتوں کو اس کام کے لئے منتخب نہیں کیا کیونکہ ان کے اندر خصومت اور خونریزی کا مادہ نہیں ہے۔ جبکہ پیکار اور جدال انسان کی سرشت میں داخل ہے۔

فطرت میں بظاہر خونریزی اور تباہ کاری نظر آتی ہے۔ بہت ضیاع ہوتا ہے اس کے بعد کوئی عمدہ شے تیار ہوتی ہے۔ مثلاً لاکھوں پھول آتے ہیں اکثر ضائع ہو جاتے ہیں چند ہی پھولوں پر پھل لگتے ہیں۔ لاکھوں بچے پیدا ہوتے ہیں اکثر مر جاتے ہیں کمتر پروان چڑھتے ہیں۔ اسی طرح خودی کے شعلے نے سینکڑوں ابراہیم پیدا کر کے فنا کر دیئے تب جا کر ایک انسان کامل پیدا ہوا۔ یہ صورت اس لئے مد نظر ہوئی کہ انسان جدوجہد کرنے کے بعد تکمیل جمال کر سکے۔

[صدیقی، ص ۲۵۲]

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''خلق فسوٰی قدر فہدٰی'' یعنی پیدا کیا پھر درست کیا (مناسب حال صورت بخشی) پھر اندازہ مقرر کیا کہ اس حد تک ترقی ممکن ہے پھر اس حد تک پہنچنے کے لئے ہدایت عطا کی۔ اس کے بعد آزادی عطا کی کہ جدوجہد کرے۔ زندگی از اول یا آخر عمل سے عبارت ہے۔ سکون موت ہے۔

شعلہ ی خود در شرر تقسیم کرد
جز پرستی عقل را تعلیم کرد[18]

[کلیات فارسی، ص ۳۳]

فرمایا: ''عقل، کل کو نہیں دیکھ سکتی صرف جزء کو دیکھ سکتی ہے۔ کیونکہ وہ زنجیرئی زمان و مکان ہے۔ کل کو صرف وجدان پا سکتا ہے کیونکہ وجدانی حالت میں نفس ناطقہ، قید زمان و مکان سے آزاد ہو جاتا ہے۔

علم از سامان حفظ زندگی است[19]

[کلیات فارسی، ص ۳۷]

---

[18] ترجمہ:

منقسم چنگاریوں میں اپنا جب شعلہ کیا
جزو پرستی عقل کی چنگاری کا شیوہ کیا

[صدیقی، ص ۲۵۳]

[19] ترجمہ:

تیری حفظ زندگی کا اک وسیلہ علم ہے
اور تقویم خودی کا اک ذریعہ علم ہے

[صدیقی، ص ۲۵۸]

فرمایا: ''علم و فن کا مقصد اصلی، محض آگاہی نہیں ہے بلکہ یہ کہ انسان علم کی بدولت اپنی زندگی اور خودی کی حفاظت کے طریقوں سے آگاہ ہو جائے۔ مذہب کا مقصد بھی یہی ہے۔ جو لوگ ''فن برائے فن'' کے قائل ہیں وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ فلسفہ، آرٹ اور مذہب، اگر خودی کی حفاظت میں معاون نہ ہوں تو بالکل بیکار ہیں۔

در اطاعت کوش ای غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار[20]

[کلیات فارسی، ص ۵۷]

فرمایا: ''خودی کی تربیت میں پہلا مرحلہ اطاعت ہے۔ اسی لئے اسلام کے معنی ہیں گردن نہادن یعنی احکام شرع کی بلا چون و چرا اطاعت کرنی۔ جب انسان احکام شرع کی اطاعت کرتا ہے تو اس میں اختیار کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے یعنی وہ صاحب اقتدار ہو جاتا ہے۔ حقیقی آزادی (حریت) احکام الٰہی کی تعمیل ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

کائنات پر نظر ڈالو۔ جو شے قیمتی اور معزز ہے وہ اطاعت ہی کی وجہ سے ہے۔ ہوا جب پھول میں مقید ہوتی ہے تو خوشبودار بن جاتی ہے۔ اسی طرح مردِ مومن، اطاعت سے مراتب عالیہ حاصل کرتا ہے۔ اس لئے مسلمان کو سختیِ آئین کی شکایت کرنی زیبا نہیں ہے اور نہ آئین میں تاویل کرنی چاہئے۔ مرشد

---

[20] ترجمہ:

ترک کر غفلت شعاری، اور بن طاعت گزار
در حقیقت جبر سے ہوتا ہے پیدا اختیار

[صدیقی، ص ۲۹۴]

رومی نے کیا خوب فرمایا ہے:

می کنی تاویل حرف بکر را
خویش را تاویل کن نے ذکر را[21]

یعنی قرآن کو اپنی خواہشات کے مطابق کرنے کی کوشش نہ کرو بلکہ اپنی زندگی کو قرآن کے سانچے میں ڈھالو۔ تاویل سے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچا۔ تاریخ اس پر گواہ ہے۔

اطاعت سے ضبط نفس کی صفت پیدا ہوتی ہے۔ انسان دو عناصر سے مرکب ہے خوف اور محبت۔ ان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دنیا کی طرف مائل رہتا ہے اور یہ دنیا طلبی اسے فحشاء اور منکرات پر اُبھارتی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ مسلمان یہ عقیدہ اپنے دل میں راسخ کر لے کہ اللہ کے سوا اور کوئی ہستی مجھے نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ ''لا الٰہ'' کا عصا اس قدر طاقتور ہے کہ خوف اور محبت کے طلسم کو چشم زدن میں باطل کر دیتا ہے۔ دیکھ لو! حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے گلے پر چھری رکھ دی۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ انھیں اللہ کے سوا اور کسی سے محبت نہیں تھی۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے اس فعل کو قیامت تک مسلمانوں کے لئے اُسوۂ حسنہ قرار دیا کہ مومن وہ ہے جس کے دل میں خدا کے سوا اور کسی کی محبت نہ ہو۔ خالد جانباز کو 'سیف اللہ' [اللہ کی تلوار] کا لقب اسی چیز نے دلوایا کہ وہ خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔

---

[21] ترجمہ:

تو نادر بات (قرآن مجید) کی تاویل کرتا ہے
خود کو موڑ، ذکر (قرآن) کو تبدیل نہ کر

مترجم: محمد سہیل عمر

آخر میں فرمایا کہ "لا الہ الا اللہ" [اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں] زبان سے مت کہو بلکہ دل سے کہو یعنی اس بات پر کامل یقین رکھو کہ خدا کے علاوہ کوئی ہستی تم پر قاہر اور غالب نہیں ہے۔ جب ماسویٰ اللہ کا خوف اور اس سے امید، یہ دو باتیں دل سے نکل جاتی ہیں تو مسلمان، مومن بن جاتا ہے۔

۱۵ اپریل ۱۹۳۳ء

ادارۂ معارفِ اسلامیہ کے پہلے اجلاس منعقدہ لاہور میں علامہ مرحوم نے اپنا افتتاحی خطبہ پڑھا تھا۔ اس میں سے چند اقتباسات ذیل میں درج کرتا ہوں:

> عصر حاضر کے مسلمان، علم کلام کی بحثوں کے مقابلے میں اسلام کی ثقافتی تاریخ سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور اسی لئے مسلمان ملکوں میں ثقافت جدیدہ کے تصورات کو اپنے اندر جذب کرنے کا میلان پیدا ہو گیا ہے۔
>
> انسان نے ہمیشہ سے کائنات میں نظم و ربط باہمی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور قرآنی تعلیمات کی رُو سے نظم و ضبط (Order) اس کائنات کی سرشت میں داخل ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:
>
> (الَّذِی خَلَقَ سَبعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۖ مَا تَرٰی فِی خَلقِ الرَّحمٰنِ مِن تَفٰوُتٍ ۖ فَارجِعِ البَصَرَ هَل تَرٰی مِن فُطُورٍ) [جس نے سات آسمان بنائے ایک کے اوپر دوسرا، تو رحمٰن کے بنانے میں کیا فرق دیکھتا ہے تو نگاہ اٹھا کر دیکھ تجھے کوئی رخنہ نظر آتا ہے] (القرآن، الملک: آیت 3)
>
> تمام سائنس اس یقین پر مبنی ہے کہ کائنات میں نظم و نسق پایا جاتا ہے چنانچہ جدید سائنس اسی مفروضے سے شروع ہوتا ہے۔ اور اگر یہ مفروضہ صحیح ہے تو پھر علم کا صحیح ذریعہ صرف تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ آیت مذکورہ بالا جدید سائنس اور اسلام میں استقرائی طریق کا سنگ بنیاد ہے۔
>
> سب سے پہلے مسلمان ماہرین فلکیات نے بطلیموسی نظام کی صحت اور واقعیت میں شک کیا۔ اور اس طرح کاپرنیکی نظام کی بنیاد پڑی۔
>
> موجودہ عہد کے مسلمان علماء اور حکما کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ اس مجوسی

گرد و غبار کو دُور کریں جس نے اسلام کے محاسن کو ہماری نظروں سے پوشیدہ کر دیا ہے۔

نوٹ: یہ اس طویل خطبے سے چند اقتباسات درج کئے گئے ہیں جو علامہ مرحوم نے ارشاد فرمایا تھا۔ میں نے یہ فقرے اپنی نوٹ بک میں درج کر لئے تھے اور انہی کا اردو ترجمہ ہدیۂ ناظرین کر دیا ہے۔ پورا خطبہ اسی قسم کے فکر انگیز جملوں سے معمور ہے۔

۱۲۔ یکم مئی ۱۹۳۳ء۔ میکلوڈ روڈ

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں اپنے ساتھ مسلم ریوائیول [مسلم نشاۃالثانیہ] کا دسمبر نمبر لے گیا تھا۔ اس میں علامہ کا وہ لیکچر [خطبہ] شائع ہوا تھا جو انھوں نے مجلس ارسطو لندن میں دیا تھا (بعد ازاں خطبات مدراس میں شامل کر دیا گیا)(Is Religion Possible?) [کیا مذہب کا امکان ہے؟] میں نے عرض کی کہ اس کا اردو ترجمہ کرنے کی اجازت دے دیجئے تو فرمایا کہ میں نے پروفیسر سید نذیر نیازی (جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) سے ترجمہ کے لئے کہہ دیا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد جناب میکش (مرتضیٰ احمد خاں مرحوم) آ گئے۔ انھوں نے ایسٹرن ٹائمز (اس زمانے میں لاہور سے شائع ہوتا تھا) کے ایک مضمون کو علامہ کے سامنے پیش کیا۔ پڑھ کر فرمایا: بڑا افسوس ہے کہ روسی مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے لئے تو مسلمانانِ عالم کو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔

اس مضمون کو پڑھ کر کمیونزم اور بالشوزم پر تبصرہ فرمایا اور اس ضمن میں جاوید نامے سے چند اشعار جو ان تحریکوں سے متعلق ہیں پڑھ کر سنائے۔

اس کے بعد مسٹر نور احمد چیف رپورٹر سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور ملنے آ گئے۔ ان سے تھوڑی دیر تک بعض سیاسی مسائل پر گفتگو ہوئی۔ وہ چلے گئے تو علامہ نے میکش صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا ''چند روز ہوئے سردار عبدالرسول خاں اور ان کے ایک دوست میرے پاس آئے تھے۔ کہتے تھے کہ ہم دونوں ابھی فریضۂ حج سے فارغ ہو کر آئے ہیں۔ سلطان ابن سعود نے بہت بُرا کیا کہ زائرین کو روضۂ اقدس کی جالیوں کو بوسہ دینے سے روک دیا۔ مجھے سلطان نے عصرانے پر مدعو کیا تھا لیکن میں نے ان کی دعوت اس لئے رد کر دی کہ انھوں نے ہمارے جذبات کا احترام نہیں کیا۔

یہ سن کر میکش کہنے لگے کہ میری رائے میں سلطان نے بہت اچھا کیا کیونکہ جالیوں کو بوسہ دینا ایک مشرکانہ فعل ہے۔ اس پر علامہ نے فرمایا کہ میں اس بات میں آپ سے متفق نہیں ہوں۔ اگر کوئی شخص فرط محبت سے اپنے بیٹے کو سینے سے لگا لے اور اس کی پیشانی چوم لے تو یہ شرک کیسے ہو گیا؟ یہ تو اظہارِ محبت ہے۔ اسی طرح حضورِ انور ﷺ کے روضۂ مبارکہ کی جالیوں کو چومنا، مشرکانہ فعل نہیں ہے بلکہ حضورِ انور ﷺ سے محبت کا اظہار ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص آنحضرت ﷺ میں خدائی صفات تسلیم کرتا ہے یا آپ ﷺ کو الوہیت میں شریک کرتا ہے تو وہ بلاشبہ مشرک ہے۔ مجھے بخوبی معلوم ہے کہ جو مسلمان جالیوں کو چومتے ہیں وہ فرطِ محبت و عقیدت سے ایسا کرتے ہیں اور یہ فعل مشرکانہ نہیں ہے۔

اس پر میکش کہنے لگے کہ محبت یہ نہیں ہے کہ جالیوں کو بوسہ دیا جائے محبت یہ ہے کہ محبوب کے Cause (مقصد حیات) کی حمایت کی جائے یا اس کی اتباع کی جائے۔ یہ سن کر علامہ لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ آپ کو یہ غلطی، محبت کے مدارج میں امتیاز نہ کر سکنے کی وجہ سے لاحق

ہوئی ہے۔ محبت کے مختلف مدارج ہیں۔ اگر ایک شخص محبت میں اس قدر بلند مرتبہ حاصل کر لے کہ محبوب کے رنگ میں رنگین ہو جائے یا اس کے لئے اپنی جان قربان کر دے تو یہ اس کی انتہائی خوش نصیبی ہے۔ مگر سب لوگ اس بلند مرتبے تک نہیں پہنچ سکتے۔ جو شخص اپنے محبوب کے لئے جان نہیں دے سکتا ظاہر ہے کہ اس کی محبت ادنیٰ درجے کی ہے لیکن آپ اس کی محبت کی مطلق نفی نہیں کر سکتے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے اسے سرے سے محبت ہی نہیں۔

"آپ محبت کو منطق کے پیمانے سے ناپنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ اصول ہی غلط ہے۔ محبت، منطق سے بالاتر ہے۔ یہاں Higher Logic [منطقِ اعلیٰ] کی حکومت ہے۔ ارسطو اور مل کی منطق بیکار ہے۔ محبت کیا شئے ہے؟ لفظوں کے ذریعہ سے اس کا اظہار بہت مشکل ہے۔ اور محبت کا تجزیہ کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ ع: ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا چشی [بخدا اس شراب کا مزہ تبھی جانو گے جب چکھ لو گے] والا معاملہ ہے۔ اس کا تعلق دماغ سے نہیں ہے دل سے ہے۔ اگر آپ کے وضع کردہ اصول کو صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ جو شخص جس قدر زیادہ متبع رسول ﷺ ہے اسی قدر زیادہ رسول ﷺ سے محبت کرتا ہے یعنی اگر محبت کا معیار، اتباع رسول ﷺ قرار دیا جائے تو آپ علم الدین شہید کے بارے میں کیا کہیں گے؟ وہ تو نماز کا بھی پابند نہ تھا اتباع رسول ﷺ تو بڑی چیز ہے؟

دراصل یہ سب کچھ، انسان کے مزاج (Temperament) پر موقوف ہے۔ بعض لوگوں کی عقل ان کی محبت کے تابع ہوتی ہے اور بعض کی محبت ان کی عقل کے تابع ہوتی ہے۔ اور دونوں قسم کے آدمی دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ اگرچہ علم و فضل کے اعتبار سے بہت بلند مرتبے

پر فائز تھے لیکن حبِ رسولﷺ کا جذبہ ان کی عقل پر غالب تھا۔ وہ بعض باتیں ایسی کرتے تھے جن پر منطقی اعتراض وارد ہو سکتا ہے مثلاً وہ جب کبھی اس درخت کے نیچے سے گذرتے تھے جس کے نیچے سے ایک مرتبہ حضورِ انورﷺ گذرے تھے، تو جھک کر گذرتے تھے حالانکہ وہ قصیر القامۃ تھے اس لئے اس کی مطلق ضرورت نہ تھی۔ جب لوگوں نے سبب دریافت کیا تو کہا حضورِ انورﷺ جھک کر گذرے تھے۔ میں جھک کر، اپنے محبوب کے فعل کی تقلید کرتا ہوں۔

دوسری مثال حضرت بایزید بسطامی کی ہے جنھوں نے ساری عمر خربوزہ نہیں کھایا کیونکہ انھیں کوئی حدیث ایسی نہیں ملی جس سے حضورﷺ کا خربوزہ کھانا ثابت ہو جاتا۔ اسی لئے میں نے لکھا ہے:

کامل بسطام در تقلید فرد
اجتناب از خوردن خربوزہ کرد[22]

[کلیات فارسی، ص ۴۱]

ان کے برعکس، حضرت فاروق اعظم کی عقل ان کی محبت پر غالب تھی۔ اسی بناء پر انھوں نے وہ درخت کٹوا دیا جس کے تنے سے حضورﷺ نے پشت مبارک لگائی تھی۔ اگر ان کی محبت علی کی محبت کی طرح ہوتی تو ہرگز وہ درخت نہ کٹواتے۔

22
کامل بسطام□ تھے تقلید میں اپنا جواب
اس لیے خربوزہ کھانے سے کیا تھا اجتناب

[صدیقی، ص ۲۶۶]

قصہ مختصر، علی رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ دونوں کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت تھی لیکن طبائع کے اختلاف کی بناء پر ان کی محبتوں کی نوعیت اور کیفیت جداگانہ تھی۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی اُفتادِ طبع کی روشنی میں جو رنگ مرغوب نظر آئے اختیار کر لے۔اس میں کسی مباحثے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ گنجائش ہی نہیں ہے۔

چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت Human type عام انسانی ٹائپ [نوعیت] کی ہے اس لئے وہ عموماً لوگوں کو اپیل [متوجہ] کرتی ہے۔ حضرت عمر کی محبت Superhuman type فوق البشر نوعیت کی ہے اس لئے بہت کم لوگوں کو پسند آتی ہے۔اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عموماً لوگوں پر جذبات کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ عقلی ٹائپ کے آدمی بہت کم ہوتے ہیں۔

دیکھ لو! آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بمقابلۂ دیگر پیشوایانِ مذاہب عالم، مسلمانوں کو زیادہ اپیل کرتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہم میں ہی سے ہیں "قل انما انا بشر مثلکم" [تم فرماؤ آدمی ہونے میں تو میں تمہیں جیسا ہوں] (القرآن، فصلت: آیت ٦)۔

تصورِ ذاتِ باری تعالیٰ کا ذکر آیا فرمایا قرآن مجید کا پیش کردہ تصور ہمیں زیادہ اپیل کرتا ہے کیونکہ وہ کہتا ہے تم مجھے پکارو میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔ "وَقَالَ رَبُّكُمُ ادعونی أَستَجِب لَكُم إِنَّ الَّذِينَ يَستَكبِرُونَ عَن عِبَادَتِي سَيَدخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ "[اور تمہارے رب نے فرمایا مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا بیشک وہ جو میری عبادت سے اونچے کھنچتے (تکبر کرتے) ہیں عنقریب جہنم میں جائیں گے ذلیل ہوکر] (القرآن، غافر:آیت ٦٠) گویا اس طرح بندے اور خدا (عابد اور معبود) میں ایک روحانی رابطہ قائم ہو جاتا ہے۔اور یہ رابطہ ہی مذہب کی جان ہے۔

معتزلہ کا پیش کردہ تصورِ باری، عام مسلمانوں کو اپیل نہیں کر سکتا کیونکہ ان کی رُو سے خدا نہ سمیع ہے نہ بصیر نہ علیم ہے نہ مجیب۔ بلکہ میری رائے تو یہ ہے کہ ایسے خدا کو ماننے کی بھی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

[کلیات اردو، ص 131]

۱۳۔ ۱۸ر فروری ۱۹۳۳ء۔ میکلوڈ روڈ

ایک عرصے کے بعد حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ غزنی کے رہنے والے ایک احمدی بزرگ عبدالقادر نامی بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت علامہ نے انھیں مجھ سے متعارف کرتے ہوئے بتایا کہ یہ صاحب ۱۹۱۸ء میں ہندوستان آئے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد قادیانی مذہب اختیار کر لیا اس لئے افغانستان واپس نہیں گئے۔ آج کل احمدیہ بلڈنگس میں مقیم ہیں اور گاہے گاہے میرے پاس آتے رہتے ہیں۔

اس تعارف کے بعد انھوں نے علامہ سے کہا کہ مسلمانانِ عالم کے ادبار سے میرا دل خون ہو رہا ہے مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اس قوم سے اپنی توجہ بالکل ہٹا لی ہے (ان کے الفاظ یہ تھے کہ مونہہ موڑ لیا ہے)۔

علامہ نے فرمایا میرا خیال ہے کہ خدا نے ان سے مونہہ نہیں موڑا بلکہ خود انھوں نے قرآن سے مونہہ موڑ لیا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ ساری دنیا میں ذلیل و خوار ہیں۔ میں یہ بات آج سے بیس سال پہلے کہہ چکا ہوں۔

اور تم خوار ہوئے تارکِ قُرآں ہو کر

[کلیات اردو، ص 232]

تاہم جائے شکر ہے کہ ابھی ان کی حالت ہنود یا یہود کی سی نہیں ہوئی ہے علاوہ بریں مسلمانوں میں بیداری پیدا ہو رہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ انھیں دوبارہ عروج حاصل ہوگا۔خدا نے ۱۹۱۷ء میں ایک موقع دیا تھا مگر افسوس۔

اس کے بعد عبدالقادر صاحب نے مسیح اور مہدی کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ اس پر علامہ نے فرمایا کہ میری رائے میں مسیح اور مہدی کے نزول کا تخیل سراسر غیر اسلامی ہے۔قرآن حکیم میں ان بزرگوں کی دوبارہ تشریف آوری کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ صحیح بخاری میں نزول مہدی کا مطلق ذکر نہیں ہے ہاں مسیح کی آمد ثانی سے متعلق دو حدیثیں ضرور موجود ہیں مگر جب قرآن میں اس کی آمد ثانی کا کوئی وعدہ نہیں ہے تو لامحالہ ان کو ناقابل اعتماد قرار دینا پڑے گا۔ مسیح اور مہدی کا انتظار کرتے رہنے کے بجائے خود مسلمانانِ عالم ہی وہ کام کیوں نہ کریں جو وہ مسیح اور مہدی سے متعلق سمجھتے ہیں۔

میں نے علامہ کی توجہ شری جواہر لعل نہرو کی خود نوشتہ سوانح حیات میں اس عبارت کی طرف مبذول کی جس میں انھوں نے Organised Religion [منظم مذہب] سے اپنی نفرت اور اس کی ضرر رسانی کا ذکر کیا ہے۔ فرمایا "پنڈت جی نے مذہب سے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جولوگ مذہب کی حقیقت سے ناواقف ہیں وہ عموماً یہی کہتے ہیں کہ وہ تعصب اور تنگدلی سکھاتا ہے۔ حالانکہ موجودہ نیشنلزم (وطنیت کا نظریہ) مذہب سے زیادہ تعصب اور تنگدلی سکھاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں جنگوں کا سبب یہی نیشنلزم ہے۔ مذہب کو اربابِ سیاست نے ہمیشہ اپنے مقاصد مشئومہ کے لئے استعمال کیا ہے۔ حروبِ صلیبی کی تہہ میں بھی یہی جذبہ کار فرما تھا۔اربابِ سیاست مذہب کے نام پر لوگوں کو لڑاتے ہیں اور مخالفین مذہب کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا

ہے کہ مذہب خونریزی کراتا ہے۔اربابِ اقتدار کا شیوہ یہ ہے کہ وہ پہلے جنگ کو عوام کی نظروں میں مقدس بناتے ہیں پھر انھیں اپنا سر کٹانے کے لئے میدانِ جنگ میں بھیجتے ہیں۔یعنی مذہب کو ذاتی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

گذشتہ زمانے کی تاریخ پر نظر ڈالو۔برہمنوں نے بودھ دھرم کو اس بنا پر ہندوستان سے خارج نہیں کیا کہ وہ اصولاً اس کے مخالف تھے بلکہ محض اس لئے کہ اس کی وجہ سے ان کا اقتدار خطرے میں پڑ گیا تھا ورنہ بودھ دھرم تو ویدانت کی تعلیم کا منطقی نتیجہ ہے۔ غور کرو! جب ہر شخص کی آتما یکساں ہے تو پھر ذات پات اور چھوت چھات کیسی؟ ویدانت کی تعلیم کا منطقی نتیجہ مساوات نسل انسانی ہے اور بودھ دھرم نے ویدانت کے اسی نتیجے کو ہندوؤں میں عام کرنے کی کوشش کی تھی جس کی پاداش میں اسے خارج البلد بلکہ خارج الوطن کر دیا گیا۔

اس کے بعد ہندوستان کے سماجی حالات سے متعلق گفتگو رہی بعد ازاں گفتگو مذہب کی طرف آ گئی۔فرمایا کہ نبی اور مجدد میں کئی پہلوؤں سے فرق ہوتا ہے مگر سب سے بڑا فرق یہ ہوتا ہے کہ دونوں کی ذہنی کیفیات مختلف النوع ہوتی ہیں۔اسی طرح مشاہدۂ باطنی میں بھی کیفیت کا فرق ہوتا ہے۔آخر میں فرمایا کہ اگر تم میرے مضمون اسلام اور احمدیت کا اردو ترجمہ شائع کرو تو اس پر حواشی بھی لکھنا اور خصوصاً بروز کے عقیدہ کی وضاحت کر دینا۔

۱۵۔۷ء ستمبر ۱۹۳۶ء- جاوید منزل میئوروڈ- ۶ بجے شام

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔مسلمانوں کی سیاسی پستی کا ذکر چلا تو فرمایا "پنجاب کے مسلمان اب تک کوئی انگریزی روزنامہ نہیں جاری کر سکے۔اس سے ان کی قومی زندگی کی پستی اور زبونی کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ مسلمان امراء

مشاغل لاطائل پر لاکھوں روپے خرچ کر سکتے ہیں لیکن قومی کاموں کے لئے ان کے پاس ایک پیسہ نہیں ہے۔ مجھے سالہا سال سے مسلمانوں کی اس ذہنیت کا تجربہ ہے۔ پھر فرمایا ''انگلینڈ کی (Set Policy) سوچی سمجھی ہوئی حکمت عملی یہ ہے کہ کوئی ایسی تحریک جو اسلامی ممالک کو متحد کر سکے، کامیاب نہ ہونے دی جائے۔ برطانیہ ہرگز نہیں چاہتا کہ اسلامی ممالک میں بیداری پیدا ہو۔ اسے ہر وقت پین اسلام ازم [تحریک اتحاد عالمِ اسلامی] کا خوف دامن گیر رہتا ہے۔

اس کے بعد نیازی صاحب آ گئے۔ انھوں نے [رسالہ] لائٹ [روشنی] سے چند اقتباسات علامہ کو سنائے۔ ان پر علامہ نے تبصرہ فرمایا۔ اس ضمن میں یہ بھی فرمایا ''بروئے قرآن وحی و الہام کسی خاص قوم یا ملک یا نسل سے مختص نہیں ہے الہام تمام زندہ ہستیوں کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ شہد کی مکھی بھی اس نعمت سے سرفراز ہو سکتی ہے۔ اور سائنسدان بھی الہام کے محتاج ہیں۔ دنیا میں جس قدر عظیم ایجادات ہوئی ہیں وہ سب الہام کی بدولت ہوئی ہیں نہ کہ ریسرچ [تحقیق] کی بدولت۔ نیز انسان اپنی زندگی کے اکثر معاملات Inspirationsالہام ہی کے تحت طے کرتا ہے۔ میری رائے میں نزول مسیح کا عقیدہ مجوسیت کی راہ سے مسلمانوں میں آیا ہے۔ کسی زمانے میں 'انتظار' عوام الناس کے لئے مفید تھا لیکن ختم نبوت کے بعد کسی کے انتظار کی ضرورت نہیں ہے۔

ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی، وہی آخر زمانی!

[کلیات اردو، ص 414]

۱۶۔۱۷ر اکتوبر ۱۹۳۶ء۔ جاوید منزل۔ میئو روڈ

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ادبی تنقید کا ذکر نکلا تو فرمایا "جہاں تک صحیح تنقید کا سوال ہے، ہندوستان ابھی مغرب سے سو سال پیچھے ہے۔ ہندوؤں میں تو کچھ حقیقت پسندی پیدا ہو چلی ہے لیکن مسلمانوں میں ابھی تک رومانیت کا اثر باقی ہے۔ گذشتہ پانچ سو سال میں مسلمانوں کے آرٹ، لٹریچر[ادب] اور شاعری کا رجحان یہ رہا ہے کہ حقائق سے گریز کیا جائے اور خیالی دنیا میں زندگی بسر کی جائے۔

ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ مسجد قرطبہ کو دیکھ کر آپ پر کیا اثر ہوا؟ میں نے کہا It is a commentary on the Quran written in stones یہ قرآن کی وہ تفسیر ہے جو پتھروں کے ذریعہ سے لکھی گئی ہے۔

پھر فرمایا "میری شاعری کو شعر کے معیار پر جانچنا مناسب نہیں ہے کیونکہ اسرارِ خودی سے لے کر بالِ جبریل تک ہر کتاب میں میں نے یہی لکھا ہے کہ شاعری میرے لئے مقصود بالذات نہیں ہے۔ میں تو مسلمانوں کے سامنے حقائق حیات بیان کرتا ہوں اور انھیں مشکلاتِ زندگی کا مقابلہ کرنے کا مشورہ دیتا ہوں۔ لیکن مسلمانوں پر گذشتہ تین سو سال سے رومانیت کی وجہ سے ایسا رنگ چڑھ گیا ہے کہ اگر کوئی شخص انھیں بذریعہ شعر، حقائق حیات کی طرف دعوت دے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ شاعری نہیں ہے۔ بالفاظ دگر ان کی نظر میں شاعری وہ ہے جس میں خلاف عقل اور تخیلی باتیں ہوں جن کو حقیقت سے کوئی سروکار نہ ہو۔ 'خدا مست' کی ترکیب پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ ترکیب اساتذہ کے یہاں نہیں ملتی۔ وہ یہ غور نہیں کرتے کہ اقبال کا پیغام کیا ہے؟

اقوام کے عروج و زوال کے اسباب بہت مخفی ہوتے ہیں اس لئے ان کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے۔ ہم کو جو کچھ معلوم ہو سکتا ہے وہ علامات ہیں

نہ کہ اسباب۔

قومی عروج انتہائی نظم و ضبط کی صفت پر موقوف ہے۔ظاہر ہے کہ قانون کی اطاعت بہت مشکل چیز ہے اور اس کے لئے بڑی ہمت درکار ہے۔جو قومیں رو بہ زوال ہیں وہ محنت اور پابندیوں سے گھبراتی ہیں جس طرح مریض طبیب کے احکام کی تعمیل سے گریزاں ہوتا ہے۔نتیجہ ظاہر ہے مرض بڑھتا جاتا ہے۔

۱۷۔ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۳۶ء- جاوید منزل

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جہاد پر گفتگو چلی۔اس ضمن میں فرمایا ''جہاد کرنا انسانی فطرت میں داخل ہے بلکہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔اگر ایک شخص اپنے ایمان، اپنے تمدن اور اپنے وطن کی حفاظت یا حمایت میں تلوار بلند نہیں کر سکتا تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ پھر تلوار کا اور مصرف کیا ہے؟ جب کبھی مسلمان کا دین خطرہ میں ہو اس پر تلوار اٹھانا فرض ہے۔اگر وہ اس مقدس فرض کی انجام دہی کے لئے بھی تلوار نہیں اٹھاتا تو پھر اس کی تلوار اس کے کس دن کام آئے گی؟

جہاد، اگر جوع الارض ['زمین کی بھوک' یعنی ملکوں/علاقوں پر قبضے کی خواہش] کے لئے ہو تو حرام ہے لیکن اسلام کی حفاظت کے لئے جہاد کرنا پہلے بھی جائز تھا اور آج بھی جائز ہے۔''جو قیصر کا حق ہے وہ قیصر کو دو'' یہ خالص رومن پروپاگنڈا تھا۔''

۱۸۔ ۶ر نومبر ۱۹۳۶ء- جاوید منزل

علامہ کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ میں نے سوال کیا کہ آج کل ہندوستان میں بیکاری روز بروز بڑھتی جاتی ہے آپ کی رائے میں اس کا حل کیا

ہے؟ فرمایا:

(الف) جب تک ہم انگریزوں کی غلامی میں ہیں

(ب) سرمایہ داری ہم پر مسلط رہے گی

(ج) فوج پر ملکی محاصل کا کثیر حصہ خرچ ہوتا رہے گا

(د) خود مسلمان رسوم لایعنی پر اسراف بیجا کرتے رہیں گے

اس وقت تک کوئی صحیح حل دستیاب نہیں ہو سکتا۔

۱۹۔ ۲۰؍ نومبر ۱۹۳۶ء۔ جاوید منزل

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے سوال کیا کہ شفاعت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا ''انسانی فطرت کی ایک کمزوری یہ ہے کہ وہ سہارا تلاش کرتی ہے۔ سابقہ ادیان نے اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور 'شفیع' کا تصور پیش کیا اور کہا کہ ہمارا مذہب قبول کر لوگے تو ہمارے مذہب کا بانی تمہاری شفاعت کر دے گا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قوت عمل کمزور ہو گئی اور عوام، مذہبی پیشواؤں کے غلام ہو گئے۔ اس لئے اسلام نے اگر شفاعت کا تذکرہ بھی کیا تو 'الا باذنہ' [مَن ذَا الَّذِی یَشفَعُ عِندَہُ إِلَّا بِإِذنِہِ: وہ کون ہے جو اس کے یہاں سفارش کرے بغیر اس کے حکم کے] (القرآن، البقرۃ: آیت ۲۵۵) کی قید لگا دی یعنی قیامت کے دن، اللہ کے حکم کے بغیر، کوئی شخص کسی کی شفاعت (سفارش) نہیں کر سکے گا تاکہ قوت عمل مردہ نہ ہو جائے۔ اسلام میں سب سے بڑا شفیع خود انسان کا عمل صالح ہے۔

وَأَن لَیسَ لِلإِنسٰنِ إِلَّا مَا سَعیٰ [اور یہ کہ آدمی نہ پائے گا مگر اپنی کوشش] (القرآن، النجم: آیت 39)۔ انسان کو وہی ملے گا جس کے لئے اس نے جدوجہد کی ہے۔ شفاعت بمعنی کفارہ تو صریحاً خلافِ اسلام ہے لیکن سفارش پر کوئی منطقی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خدا کے حضور میں کسی نیک بندے

کا کسی گناہ گار کے لئے سفارش کرنا نہ عقلًا معیوب ہے نہ نقلًا مذموم ہے۔

فرمایا ''مجھے تو اب یہ خیال ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی دینی اصلاح ممکن بھی ہے یا نہیں؟ وہ تو غیر اسلامی عقائد اور رسوم کے اس قدر خوگر ہو چکے ہیں کہ اب حقیقی اسلام سے انھیں تسلی نہیں ہو سکتی۔''

فرمایا ''ہندی مسلمان کی ذہنی پستی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہ کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ جو کام میں کر رہا ہوں وہ کہیں میری یا قوم کی تضیع اوقات کا موجب تو نہیں ہو جائے گا۔

فرمایا ''لوگوں میں اس بات کا احساس باقی نہیں رہا کہ ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں اس سے ہمیں یا قوم کو فائدہ پہنچے گا یا نقصان؟

فرمایا ''چند روز ہوئے ایک شاعر میرے پاس آئے اور کہا کہ مجھے اپنے اشعار میں تصرف کی اجازت دے دیجئے۔ میں نے کہا ''بندۂ خدا! مجھ پر کیوں ظلم کرتے ہو؟ خود ہی اپنے مطلب کے اشعار کیوں نہیں تصنیف کر لیتے؟ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کل ہر شخص صاحب تصنیف بننا چاہتا ہے اور یہ معلوم کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ مجھ میں تصنیف کی اہلیت بھی ہے یا نہیں؟ کس قدر تکلیف دہ ہے ایسے ماحول میں رہنا؟

۲۰۔ ۱۷ر ستمبر ۱۹۳۶ء۔ جاوید منزل

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت باہر صحن میں چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ مسئلہ تجسم پر گفتگو ہوئی۔ فرمایا کہ دیگر مذاہب نے خدا کو اتنا پست کیا کہ وہ انسان کی سطح پر آ گیا لیکن اسلام نے انسان کو اتنا بلند کیا کہ مظہر صفات بن گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا اگر بشکل انسان جلوہ گر ہو تو وہ خدائی صفات سے معریٰ ہو جائے گے اس لئے ہم اسے خدا نہیں کہہ

سکتے۔

اس کے بعد ماسٹر عبداللہ چغتائی علامہ سے ملنے آ گئے۔ وہ فرانس جا رہے ہیں۔ علامہ ان کو مفید مشورے دیتے رہے۔ چلتے وقت انھیں دعا دی اور کہا اگر اللہ نے مجھے صحت عطا فرما دی تو ۱۹۳۸ء میں حج کرنے جاؤں گا۔

۲۱۔ ۷۔ ۱۹۳۷ء (نوٹ بک میں تاریخ درج نہیں ہے غالباً اکتوبر کا مہینہ تھا)

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سوال کیا کہ جمہوریت کے بارے میں اسلام کی تعلیم کیا ہے۔ فرمایا اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ امیر کے لئے مقدم شرط یہ ہے کہ وہ اسلام کی حمایت کرے گا خواہ وہ عربی ہو یا عجمی"۔ اسلام نے جمہوریت کی روح اختیار کی ہے اور وہ 'شوریٰ' ہے۔ اسلام نے دنیا کو جمہوریت کی روح سے روشناس کیا اسی لئے اسلام نے وحی کا سلسلہ بند کر دیا تاکہ ہم آنحضرت ﷺ کے بعد کسی انسان کے سامنے سر تسلیم خم نہ کریں۔ بنی آدم کو حریت کی نعمت سے مالا مال کرنے کے لئے، وحی کو ختم کرنا لازمی تھا۔ اسلام نے اسی لئے ملوکیت، احباریت اور نبوت کو ختم کر دیا تاکہ انسان آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہو سکے۔ اس کے علاوہ انفرادی ذمہ داری کا قانون نافذ کیا۔ (أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ)[کہ کوئی بوجھ اٹھانے والی جان دوسری کا بوجھ نہیں اٹھاتی] (القرآن، النجم: آیت 38)۔

اسلام میں امارت بھی نکاح کی طرح ایک عمرانی معاہدہ ہے، امیر اور عوام کے درمیان۔ عوام نے ایک شخص سے کہا کہ اگر تم شریعت کی پابندی اور اس کے نفاذ کا وعدہ کرو تو ہم تمہیں اپنا امیر منتخب کرتے ہیں۔ اس شخص نے وعدہ کیا کہ میں ایسا ہی کروں گا۔ بس وہ قوم کا امیر منتخب ہو گیا۔ اگر وہ

خلاف ورزی کرے تو قوم کو اس کے خلاف بغاوت کا حق حاصل ہے۔

اسلامی جمہوریت میں رائے دہی کے لئے کلمہ شہادت ادا کرنا کافی ہے۔ مغربی جمہوریت میں بر سر اقتدار پارٹی[جماعت] عوام کو فریب دیتی ہے کہ تم حکمراں ہو حالانکہ دراصل زمام کار چند افراد کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو پرائم منسٹر[وزیر اعظم] کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں دراصل انگلستان کا وزیر اعظم، اس ملک کا حکمراں تھا۔ نام عوام کا تھا۔

حرف آخر

ان ملفوظات میں بعض مقامات میں عبارت غیر مربوط ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے قصداً وہ باتیں حذف کر دی ہیں جن کا تعلق مسلمانوں کے مختلف فرقوں یا جماعتوں سے ہے۔

مجھے برسوں علامہ مرحوم کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا۔ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں جبکہ وہ انجمن حمایت اسلام کے صدر تھے اور میں انجمن کے قائم کردہ اشاعت اسلام کالج کا پرنسپل تھا، مجھے بہت زیادہ ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا کیونکہ انھیں اس کالج سے بہت دلچسپی تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ کالج ۱۹۲۹ء میں ان کی اور غلام بھیک نیرنگ مرحوم کی متفقہ کوشش ہی سے قائم ہوا تھا۔

ان کی زندگی کے بہت سے واقعات آج بھی میرے حافظے میں محفوظ ہیں اور ان کی یاد اس قدر روشن ہے کہ بائیس سال گذر جانے کے بعد بھی وہ مدھم نہیں پڑی۔ اگر مدیر محترم نے ارشاد فرمایا تو میں انھیں جداگانہ مضمون کی صورت میں قلم بند کر دوں گا۔ ان شاء اللہ و بتوفیقہ[اگراللہ نے چاہا اور اُس کی توفیق سے]۔

۵

اقبال کی زندگی کے چند گوشے*

غازی محی الدین اجمیری

ایک سہانی شام کو آل انڈیا خلافت کمیٹی [مجلس خلافت] کے صدر دفتر خلافت ہاؤس [خلافت منزل] بمبئی میں علامہ اقبال کا تار ملا:

> کل صبح فرنٹیر میل سے پہنچ رہا ہوں۔ اگر لوہے کا کارخانہ منتقل ہو چکا ہوگا تو وہیں قیام کروں گا، حقے کا انتظام رکھنا۔

میرے قیام بمبئی کے دوران علامہ کی یہ آمد تیسری بار تھی (۱۹۳۱ء)۔ اس سے پہلے دو مرتبہ آ چکے تھے۔ پہلی دفعہ کہیں اور مقیم تھے، دوپہر کے کھانے پر خلافت ہاؤس آئے یا لائے گئے۔ ماحول خوشگوار، مکینوں کو مانوس و یگانہ پایا۔ پروگرام کے خلاف خلافت ہاؤس میں دوپہر بسر کی۔ سہ پہر چائے نوشی کے بعد اصلی قیام گاہ پر اور دوسرے دن بمبئی سے مراجعت فرما گئے۔ کچھ عرصہ بعد دوبارہ تشریف آوری ہوئی۔ اسٹیشن [اقامت گاہ] ہی سے کوئی قدر شناس ان کو لے اُڑے اور ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ لیکن علامہ میزبان کو سمجھا بجھا کر شام کو عین چائے کے وقت سامان سمیت خلافت ہاؤس پہنچ گئے۔ ہم نے محسوس کیا کہ جسم میں جاں آ گئی۔ ہر فرد دیدہ و دل فرش راہ کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ خلافت کا سارا کاروبار معطل ہو کر رہ گیا اور ہر کارکن اپنی ڈیوٹی [فرضِ منصبی] چھوڑ کر علامہ کے محور پر ان کے گرد گھومنے

* سہ ماہی، اقبالیات اردو، جلد ۷، شمار ۲، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، جولائی ۱۹۶۶ء۔

لگا۔ایک شبانہ روز ہم سب گل افشانی گفتار سے لطف اندوز اور خدمت گذاری کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوتے رہے۔اس بار علامہ بہت کھل کر رہے اور ان کی حکیمانہ اور فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں سے ہمارے دلوں اور دماغوں کو بڑی روشنی ملی۔

اس دو روزہ قیام میں دو واقعات ایسے پیش آئے جن کو قارئین غالباً دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے: ایک حقے کا پرابلم [مسئلہ]، دوسرا لوہے کے کارخانے کا انتقال[منتقلی]۔

دورانِ قیام میں علامہ کی طرف سے حقے کی فرمائش ہم سب کے لیے لانیحل عقدہ اور پرابلم بن گئی۔ ہم سب کارکنان خلافت ایک اچھی پوزیشن رکھتے تھے اور جس حیثیت کے تھے اس سے اپنے کو کچھ برتر ہی تصور کیا کرتے تھے۔لیکن علامہ کے اس مطالبہ نے ہماری ساری شیخی کرکری کر کے رکھ دی۔اب ہم خلافت ہاؤس کے اردگرد جھونپڑیوں کا طواف کر رہے تھے اور ہوٹلوں کے ملازمین کی خوشامد کرتے پھر رہے تھے۔کسی سے چلم حاصل کی، کسی سے نیچہ لیا، کسی نے حقے کی نَے ہاتھ میں تھما دی، کسی نے نہایت بدبودار تمباکو ہاتھ پر دھر دی، کسی نے تمباکو کا نہایت بد قطع کالا کلوٹا ڈبہ تھما دیا۔الغرض بدقت یہ تمام اجزاء فراہم کر کے لائے اور حقہ تیار کر کے علامہ کے سامنے رکھا۔علامہ نے حقے کی نَے ہاتھ میں لی، حقے کے درمیانی حصے کو چھوا اور تیوری پر قدرے بل ڈال کر فرمایا کہ ارے اس کو تازہ نہیں کیا!

حقہ اور تازہ! ابھی ہم اس کے مفہوم پر ہی غور کر رہے تھے کہ حاضرین میں سے حقے کے کسی ماہر نے 'تازہ' کے مفہوم پر روشنی ڈالی۔ایک صاحب نے حقہ اُٹھایا اور نل کے نیچے رکھ کر چلم سمیت اس پر پانی بہا دیا۔ چلم میں سے شعلہ بھڑکا اور چشم زدن میں آگ بجھ گئی اور راکھ معہ تمباکو کے بہہ گئی۔ غیر معمولی تاخیر ہونے پر علامہ خود نل پر پہنچے۔دیکھا کہ پھر از

سر نو چلم میں تمباکو اور آگ رکھی جا رہی ہے۔ بہت ہنسے اور فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ میں سے کسی کو بھی حقہ بھرنے کی تمیز اور اس کی لطافت کا ذوق نہیں ہے۔ یہ تو بڑی کمی ہے۔ جبھی تو یک نالۂ مستانہ زجائے نہ شنیدم [ایک نالۂ مستانہ ہے کہ کسی طرف سنائی نہ دیا]۔

پہلی تشریف آوری کے دوران جبکہ کھانے کے بعد دوپہر میں خلافت ہاؤس ہی میں استراحت فرما ہوئے تھے چائے نوشی کے وقت ارشاد فرمایا تھا کہ مجھے یہاں بڑا سکون اور راحت ملی البتہ کبھی کبھی سامنے کے کارخانے سے جو کھڑکھڑاہٹ کی آواز آتی ہے اس سے بڑی اذیت پہنچتی رہی۔ بڑی ہی سامعہ خراش آواز ہے، قلب و روح کو اس سے بڑی اذیت پہنچتی ہے۔ اس دل خراش آواز کا قصہ یہ تھا کہ خلافت ہاؤس کے جنوب کی جانب لوہے کا ایک بہت بڑا کارخانہ تھا۔ یہاں لوہے کی سلاخیں ڈھالی جاتی تھیں اور پھر ان کو دھار دار اوزاروں سے قطع کر کے ہموار کیا جاتا تھا۔ اس سے وقفے وقفے کے بعد دل خراش آواز پیدا ہو کر سارے گرد و پیش کو پریشان اور مبتلائے اذیت رکھتی تھی۔ علامہ جیسا نازک احساسات اور لطیف جذبات سے بھرپور انسان بھلا اس انکرالصوات [بدترین آواز] سے کیونکر متاثر و متاذی نہ ہوتا؟ ہم اور گرد و پیش میں بسنے والے تمام افراد اس خارخانے کے یہاں سے ہٹا دینے کے سلسلے میں ہمہ قسم کی مساعی کے باوجود ناکام اور مایوس ہو چکے تھے۔ جب دوسری بار علامہ دو دن کے لیے تشریف فرما ہوئے تو پہلے ہی دن کارخانے نے اذیت رسانی کا مظاہرہ کیا۔ علامہ نے تیور بدل کر اپنے آپ کو مخاطب کر کے فرمایا: اچھا کل دیکھیں گے۔ دوسرے دن نو دس بجے کے قریب فرمایا کہ میرے ساتھ چلو۔ میں ساتھ ہو لیا۔ فرمایا اس کارخانے کو یہاں سے منتقل کر دینے کا جس آفیسر کو اختیار ہے اس کے دفتر چلو۔ میں نہ صرف آفیسر بلکہ معاملے کے تمام قانونی پہلوؤں اور مالہ و ماعلیہ [اس کے بارے میں] سے

واقف تھا۔ میں نے راستے میں کچھ قانونی نقطے بھی گوش گذار کر دیئے۔ ہم دفتر پہنچے۔ ایک سرکاری دفتر میں علامہ المشرق کی آمد بالکل خلاف توقع تھی، ہل چل مچ گئی۔ آفیسر نے خود آئین و قانون اور رسم و رواج کی بندشیں توڑ کر آگے بڑھ کر استقبال و خیر مقدم کیا اور بڑے ہی اعزاز و اکرام کے ساتھ علامہ کو اپنی کرسی پر بٹھایا اور خود ایک طرف کرسی پر بیٹھ گیا۔ اولاً کچھ فلسفیانہ باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد علامہ نے کارخانے کا تذکرہ کیا اور قانونی دلائل پیش کیے جن کے اس نے بڑے خوشگوار انداز میں جوابات دیئے۔ آخر علامہ نے جذباتی انداز میں فرمایا کہ بمبئی جیسے ہنگامہ خیز شہر میں خلافت ہاؤس ہی ایسی جگہ ہے جہاں مجھے سکون مل سکتا تھا، لیکن اس کارخانے کی وجہ سے وہاں بھی اطمینان میسر نہیں۔ آفیسر سپر انداز ہو گیا اور شد و مد سے وعدہ کیا کہ جلد ہی وہ کارخانے کو وہاں سے کہیں اور منتقل کر دے گا۔ چنانچہ دو چار ہی ماہ میں کارخانہ وہاں سے کہیں اور منتقل ہو گیا اور علامہ کی بدولت تمام اہالیانِ محلّہ کو اس سوہانِ روح عذاب سے نجات مل گئی۔

تار میں اسی لوہے کے کارخانہ کا ذکر تھا۔ علامہ کا تار ملتے ہی ہم سب بجائے اس کے کہ ان کی آمد پر خوشیاں مناتے، حقے کے اجزا کی فراہمی کے لیے فکر مند ہو گئے اور مختلف بازاروں کی سمت دوڑ پڑے۔ جس جس بازار میں اس کے اچھے سے اچھے اجزا مل سکتے تھے وہاں پہنچے اور تمام اجزا سے جو حقے کا مجموعہ تیار کیا گیا تھا وہ بڑا ہی خوشنما اور دلفریب تھا۔ ابھی ہم اس بحث ہی میں اُلجھے ہوئے تھے کہ اس حقے کو دیکھ کر علامہ کس کس طرح اظہارِ خوشنودی و پسندیدگی فرمائیں گے کہ کسی نے تمباکو کی یاد دلا کر بحث میں کھنڈت ڈال دی۔ معلوم ہوا کہ ہم حقے کی روح تمباکو تو لائے ہی نہیں جس کے بغیر حقے کا وجود اور اس کی ساری خوشنمائیاں بیکار ہیں۔

اب تمباکو کا مسئلہ تھا اور ہم تھے۔ رد و کد کے بعد طے ہوا کہ

معمولی تمباکو تو بدبودار اور واہیات ہوتی ہے، لکھنؤ کا تازہ سے تازہ خمیرہ لانا چاہئے۔ چنانچہ ٹیلیفون کے ذریعے ماہرین و مبصرین کی نشاندہی پر ایک چند دوکانوں کا پتہ نشان معلوم کر کے لکھنؤ کا نہایت عمدہ خمیرہ بڑی مقدار میں خرید کیا گیا۔ ستم ظریف دوکاندار جب دام وصول کر کے خمیرہ سر منڈھ چکا تو اب وہ منہ سے پھوٹا اور ہم سب کو ایک اور نئے قسم کے آزار میں مبتلا کر دیا۔ کہنے لگا یہ خمیرہ بیکار ہے جب تک اس میں گڑھاکو (ایک قسم کے نہایت کریہہ تمباکو کا ملغوبہ) کی پرانے گڑ کے ساتھ آمیزش نہ کی جائے گی کام نہ چل سکے گا۔ بہرحال اسی کے پتہ نشان بتلانے پر گڑھاکو اور پرانا گڑ تلاش کر کے لائے۔ اسی کی بتائی ہوئی مقدار و ترکیب کے مطابق ایک صاف پتھر پر ان اجزا کو اوپر تلے دھر کر خوب خوب کٹائی کی گئی تاآنکہ معجون مرکب قسم کا کالا کالا حلوہ سا تیار ہو گیا۔ رات کا زیادہ حصہ خلافت ہاؤس کی صفائی کے اہتمام میں بسر کیا اور کم حصہ سو کر کاٹا۔ صبح چائے اور ناشتے کی بجائے حقے کے چالو کرنے کی فکر دامن گیر رہی۔ طے ہوا کہ علامہ جوں ہی ہال میں تشریف فرما ہوں فوراً سلگتا ہوا، خوشبوئیں بکھیرتا ہوا تازہ بتازہ گرما گرم حقہ ان کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ یہ بات کہنے کی تو نہیں ہے لیکن اس سے پتہ چلتا ہے کہ لوگوں کے قلوب پر علامہ کی عظمت و محبت کے کیسے گہرے نقوش ثبت تھے کہ ہم میں سے ہر شخص جو بزعم لیڈری [رہنمائی] کسی بڑی سے بڑی شخصیت کو خاطر میں نہ لاتا تھا اس کے دل میں یہ خواہش پنہاں تھی کہ سب سے پہلے علامہ کی خدمت میں حقہ پیش کر کے سرخ رُوئی حاصل کرے۔

ایک بار مجھ جیسے کسی من چلے نے علامہ سے سوال کر لیا کہ حقے میں کیا مزہ ملتا ہے۔ مختصر، سادہ اور معنی خیز جواب ملا: ''پی کر دیکھو!'' یہ اسی

طوالت کا اختصار ہے کہ ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں۔علامہ کا قیام اس بار خلافت ہاؤس میں چودہ دن رہا۔بمبئی جیسے بین الاقوامی اور لکھوکھا انسانوں کی بستی کے شہر میں مرکزی خلافت کمیٹی کا دفتر خلافت ہاؤس ویسے ہی مرجع خلائق رہتا تھا لیکن علامہ کی تشریف آوری کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔انسانوں کا سیلاب اُمنڈتا رہتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صبح سے شام تک سارے بمبئی کی پہنائیاں خلافت ہاؤس میں سمٹ آئی ہیں۔

بھائی کلہ روڈ کے پل سے ایک طویل سڑک خط جوہری کی طرح مچھ گاؤں تک چلی گئی ہے۔قریب قریب اسی کے درمیان خلافت ہاؤس کی شاندار عمارت واقع ہے۔علامہ کا پروگرام روز بنتا تھا اور سختی کے ساتھ اس کی پابندی کی جاتی تھی۔خاص کر ان کے آرام کے اوقات میں خلل اندازی کسی قیمت پر نہیں ہونے دی جاتی تھی۔کچھ وقت ان کے غور و فکر اور فلسفیانہ استغراق کے لیے بھی ہوتا تھا جس میں کسی کو مخل نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔

اس چودہ روزہ قیام کے دوران چند عجیب اور بعض حد درجہ دل چسپ واقعات پیش آئے جن کی تفصیلات علامہ کی عظمت اور جلالت شان اور ان کے فقید المثال اخلاق و کردار کی آئینہ دار ہو سکتی ہیں۔یہ تفصیلات مرتب ہو ہو کر مقالات کی صورت میں ہدیۂ قارئین ہوتی رہیں گی۔و الا تمام من اللہ تعالیٰ۔

آج کی صحبت میں اسی دفتر پارینہ کا ایک ورق نذرِ قارئین کیا جا رہا ہے۔علامہ خلافت ہاؤس میں مقیم تھے۔سابق خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید خاں وینس میں جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔پورا شاہی خاندان ان کے ساتھ تھا، صدہا تفکرات ان کو گھیرے ہوئے تھے۔سب سے بڑی فکر ان کو قابل شادی لڑکیوں کو ٹھکانے لگانے کی تھی۔

نظام حیدرآباد اپنے دونوں شہزادوں اعظم جاہ و معظم جاہ کی شادی کسی

اعلیٰ شاہی قسم کے خاندان میں کرنے کے لیے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ مولانا شوکت علی عالم اسلامی کا رشتہ جوڑتے جوڑتے کبھی کبھی انفرادی رشتے ناتے کی منزل زیریں پر بھی اتر آیا کرتے تھے۔

نہیں کہا جا سکتا کہ اس قران السعدین یعنی شہزادگان دکن (اعظم جاہ و معظم جاہ) اور دُرر شاہی (دُر شاہوار و نیلوفر) کو ملک عقد میں منسلک کرنے کا خیال پہلے نظام کو آیا یا معزول خلیفہ کو یا مولانا شوکت علی کو۔ بہرحال مولانا محرک بنے اور شہزادگان رونمائی کے لیے خلیفہ کی جائے پناہ پر پہنچا دیئے گئے۔ مولانا کے کمرے میں مجلس رونمائی برپا ہوئی۔ مستقبل کے دولہا و دولہنوں کی آمنا سامنا ہوا۔ دلہنوں کی پسند کے مسئلے پر تو پردہ ہی پڑا رہا، البتہ شہزادگان عالی تبار بُری طرح ریجھ گئے اور اس بساط پر اپنا سب کچھ بلکہ دل و جان تک ہار آئے۔ بساط عشق پر جان و دل کی بازی ہار جانے والوں ہی کو حریم وصل میں وقار کے ساتھ بار مل سکتا ہے

دل و جان اگر ببازی بہ بساط عشق بازی
بحریم وصل جانان بوقار خواہی آمد[1]

نظام کو اس ساری صورتِ حال سے مطلع کر دیا گیا اور اب باقاعدہ مسائل و معاملات طے ہونے لگے۔ نظام قارون کو شکست فاش دے دینے کے باوجود بڑے جزرس اور کائیاں تھے۔ جو شرائط اُجڑے ہوئے حریم خلافت سے پیش ہوتی تھیں ان میں مین میخ ضرور نکالتے رہتے تھے اور اس طرح

---

[1] ترجمہ:

اگر دل و جان کی بازی لگانا ہے تو بساط عشق پر لگا
کہ وصل محبوب کی خلوت میں وقار سے داخل ہو

مترجم: محمد سہیل عمر

معاملات میں طوالتیں اور مسائل میں اُلجھنیں پیدا ہوتی رہتی تھیں۔ شہزادگان ان طوالتوں اور اُلجھنوں سے بڑے پریشان رہتے تھے اور وہ ہر قیمت پر جلد سے جلد یہ سودا کر لینا چاہتے تھے۔ان کے پیش نظر ایک صوفی شاعر کی مثال تھی جو محبوب ہندی کے خال رُخ پر سمرقند و بخارا تک نچھاور کرنے کو تیار ہو چکا تھا۔ یہاں تو ہندی خال رُخ کے مقابلے میں ترکی حسن و جمال تھا جو اپنی بھرپور رعنائیوں، شادابیوں اور فتنہ سامانیوں کے ساتھ شہزادگانِ دکن کے نظام جسم و روح کو تہہ و بالا کیے دے رہا تھا۔اس پردیس میں شہزادگان کا کوئی محرم راز بھی نہ تھا جس کے سامنے وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتے۔

حیدرآباد کے کچھ وزراء اور اعلیٰ حکام ساتھ تھے جن کے سامنے وہ کھل نہیں سکتے تھے اور پھر ان کی خشک مزاجیاں بھلا جان ہار شہزادگان کی تر دامنیوں کا ساتھ کہاں دے سکتی تھیں! لے دے کر ایک مولانا شوکت علی اپنی جسمانی ہولناکیوں اور معنوی رعنائیوں کے ساتھ وہاں موجود تھے جن کو بحالت مجبوری شہزادگان اپنی اپنی بپتائیں اور کتھائیں سنا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیا کرتے تھے۔ مولانا علی گڑھ کے کھلنڈرے رہ چکے تھے۔ وہ شہزادگان کے ساتھ یہ کھیل بھی کھیل لیا کرتے تھے اور ان کی ڈھارس بندھا دیا کرتے تھے۔اس سلسلے کی داستانیں اس قدر دلچسپ و دل آویز اور مضحک ہیں کہ سننے والا دیوارِ قہقہہ بن کر رہ جائے۔ کبھی کبھی شوکت صاحب لہر میں آ جاتے تھے تو ہم لوگ دنیا و مافیہا سے یکسو ہو کر یہ داستانیں سننے بیٹھ جاتے تھے اور ہفتوں ہمارے دل و دماغ ان سے چاشنی گیر و لذت چش [لطف اندوز ہوتے اور مزہ اٹھاتے] رہتے تھے۔ شہزادگان کا گھڑی گھڑی بے چین ہو ہو کر مولانا کے کمرے میں آنا اور تازہ اطلاعات کے ضمن میں کسی مایوس کن خبر سے متاثر ہو کر ٹھیٹ حیدر آبادی لب و لہجہ میں الفاظ ذیل ادا کرنا

'مولا...اب کیا ہونا...یوں لطف نہیں آئے گا'۔ مولا کے الف کو دیر تک اور دور تک کھینچتے ہوئے لے جایئے، پھر ''اب کیا'' کو آدھا ادھورا ادا کر کے ''ہونا'' پر پہنچ جایئے اور اس کے ''نا'' کے ساتھ ہمزہ ملا کر اس کو جھٹکے دے دے کر دیر تک نا...کرتے رہیے تب آپ گوہر افشانی کا لطف لے سکیں گے۔ بہرحال اس قسم کی باتیں محفل رنداں کے حریم راز کی امانت ہوا کرتی ہیں۔ان کو علانیہ طشت از بام کرنا خلافِ مصلحت سمجھا جاتا رہا ہے۔لہٰذا اس جمالیاتی اور ادبی ورق کو الٹ کر:

دگر از سر گرفتم رشتۂ زلف پریشان را[2]

اُلجھے ہوئے مسائل شوکت صاحب کے ناخن تدبیر سے سلجھ گئے۔ جادۂ صد سالہ اپنی دوری و درازی کے باوجود ایک ہی آہ میں طے ہو گیا اور عقد ہو گیا۔ شہزادگان کی واپسی دلہنوں کے خاندان کے کثیر افراد کے جلو میں طے پا گئی اور تمام ممالک محروصہ دکن میں جہاز کے بمبئی پہنچنے کے وقت و تاریخ کا سرکاری اعلان شائع ہو گیا۔

ایسے بھی اس پُر مسرت تقریب کے موقعہ پر بمبئی میں شہزادگان اور دلہنوں کے خیر مقدم کے لیے ہزاروں کا اجتماع متوقع تھا کہ سمندتاز پر تازیانہ پڑ گیا اور عمائدین ریاست و عامہ رعایا کے کانوں میں بات پھونک دی گئی کہ اس استقبال میں شرکت اعلیٰ حضرت کی خوشنودی کا باعث ہو گی۔اس نفخ صور کے بعد عام طور پر یہ اندازہ کر لیا گیا کہ استقبال میں ڈیڑھ دو لاکھ

---

[2] ترجمہ:

میں نے زلف پریشاں کا سلسلہ پھر سے پکڑا

مترجم: محمد سہیل عمر

سے کم کا اجتماع نہ ہوگا۔

اب سرگزشت کا اصلی واقعہ آتا ہے۔

حیدر آباد دکن کے گل فروش (ہار پھول کے تاجروں) کے چند خاندانوں نے ایک میٹنگ [اجلاس] میں طے کیا کہ اس زرین موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لیے اعلیٰ قسم کے پھولوں کی شاندار لاکھ ڈیڑھ لاکھ مالائیں (ہار) تیار کی جائیں، ان کو زرتار کر کے اور بھی شان دوبالا کر دی جائے۔ ہار تین قسم کے ہوں: قسم اول کی قیمت پانچ روپے، قسم دوم دو روپے، تیسری قسم آٹھ آنے۔ چنانچہ اس منصوبے کے ماتحت انھوں نے خود ان کے بیان کے مطابق پھولوں کی فراہمی اور ہاروں کی تیاری پر قریب پچیس تیس ہزار روپیہ صرف کیا اور ڈیڑھ لاکھ سے بھی زیادہ ہر قسم کی مالائیں تیار کر لیں، اور اُن کے تر و تازہ کرنے کی تمام تدابیر کو بروئے کار لا کر دو تین دن پہلے بمبئی آ دھمکے۔ یہاں آتے ہی انھوں نے ہزاروں ہینڈ بلوں، پوسٹروں اور اخبارات کے ذریعہ ایڈورٹائز [مشتہر] کیا اور ہاروں کے چربے اور فوٹو [عکسی تصویر] بھی شائع کرائے۔ بیلاؤبیر کے طویل و عریض ہال میں استقبالی مظاہرہ طے پا چکا تھا اور وہاں اس کے سلسلے کے انتظامات میں حیدر آباد کے ذمہ دار حکام شبانہ روز مصروف تھے۔ گل فروشوں نے بیلاؤبیر کے اسی ہال کے بالمقابل سڑک کے پار ایک ہوٹل [قیام گاہ] کا بڑا ہال بدقت و منت بقول ان کے چھ سات ہزار روپے دے کر دو دن کے لیے کرایہ پر حاصل کر لیا اور مالاؤں سے اس ہال کو پاٹ دیا اور بطور ایڈورٹائز کچھ ہاروں سے سجا بھی دیا اور اس تصور میں مگن ہو گئے کہ دن کے نو دس بجے جہاز کے آنے سے پہلے صبح منہ اندھیرے استقبالی پبلک کی آمد کا آغاز ہو جائے گا اور ہر استقبالی اس دوکان سے ہار خرید کرتا ہوا بیلاؤبیر کے استقبالی ہال میں داخل ہو جائے گا۔ ادھر یہ دل خوش کن تخیل آرائیاں تھیں اور خوب خوب خیالی پلاؤ

پک رہے تھے، اُدھر قدرت اس استقبالی نظام کو درہم و برہم کر دینے کا تہیہ کر چکی تھی۔ دفعتاً بجلی کوند گئی، آنکھوں میں چکا چوند آ گئی۔ ایک ایک بچے کی زبان پر چرچا تھا کہ ''اسی جہاز سے گاندھی جی آ رہے ہیں''۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرس[گول میز مجلس] کے اختتام کے بعد گاندھی جی راستے میں جگہ جگہ قیام کرتے ہوئے ہندوستان واپس آ رہے تھے اور پورٹ سعید سے شہزادوں اور ان کی دلہنوں کے اسی جہاز میں سوار اور براجمان ہو گئے۔ اب سارا بمبئی صبح منہ اندھیرے ہی ان کا سواگت کرنے کے لیے اُلٹ پڑا اور احمد آباد، سورت، کاٹھیاواڑ، پونہ، مہاراشٹر وغیرہ وغیرہ مضافاتی علاقوں سے راتوں رات جس قدر درشنی آ سکتے تھے وہ بھی بیلاڈ پیر پر آ دھمکے۔ حیدرآبادی قافلے کے لاکھ دو لاکھ افراد تک کے تو بیلاڈ پیر اور اس کا ہال اور اطراف متحمل ہو سکتے تھے لیکن گاندھی کے ٹڈی دل استقبالیوں کو کیسے برداشت کیا جا سکتا تھا؟

نتیجہ یہ ہوا کہ حیدرآباد کے دو ڈیڑھ لاکھ استقبالی گاندھی جی کے چھ سات لاکھ استقبالوں کے اروب میں آ گئے اور آٹے میں نمک کی طرح تحلیل ہو کر اس اژدہام میں کھو گئے۔ کیسے ہار پھول کی مالائیں اور کیسا استقبال و خیر مقدم! بھیڑ کا عالم یہ تھا کہ بیلاڈ پیر اور ہال تو ایک طرف رہا ساری سڑکوں، شاہراہوں، میدانوں، پارکوں کی پہنائیاں اور وسعتیں تنگ ہو گئیں اور حشرات الارض سے پٹ گئیں۔ مالاؤں کی دوکان نگاہوں سے اوجھل اور منقطع ہو کر رہ گئی۔ کس کو ہوش تھا کہ بھیڑ کو چیر کر اپنی جان جوکھوں میں ڈالے اور دوکان تک پہنچ کر جیتی جان کے بدلے ہار خریدے! وہاں دوکان محبوب کی کمر بن کر رہ گئی تھی اور ''کہاں ہے، کس طرف ہے اور کدھر ہے'' کی صدائیں اگر بلند ہی ہوتی ہوں گی تو اس ہنگامۂ دار و گیر میں ان کا

سننے والا کون تھا؟ اگر دوکان کا پتہ چل جاتا تب بھی وہاں پہنچ کر ہار خریدنا، پھر ہال تک پہنچنا اور اس کو دولہا دلہنوں کے گلے کا ہار بنانا تو ایک طرف، وہاں تو دولہا دلہن ہی کا پتہ اور یوسف بے کارواں بن کر رہ گئے تھے۔ سارے ہال اور گرد و پیش پر گاندھی جی اور ان کے چیلوں کا مخالفانہ قبضہ تھا اور وہاں دلہنوں اور شہزادوں کے خیر مقدم کے بجائے گاندھی جی کا سواگت کیا جا رہا تھا۔ پھولوں کی مالاؤں کے بجائے گاندھی جی پر کچے سوت کی لچھیاں نچھاور ہو رہی تھیں۔ بہت دیر بعد پتہ چلا کہ صورت حال کی نزاکت کے پیش نظر شہزادوں اور دلہنوں کو کسی دوسری اجاڑ سمت سے بدقت نکال کر دور تک پیدل چلا کر کرائے کی ٹیکسیوں کا انتظام کر کے غیر آباد راستوں سے والکیئر نظام پیلس [محل] تک پہنچایا گیا جہاں محدود تعداد میں چند خاص خاص اور بلند پایہ افراد کے ذریعے استقبال و خیر مقدم کا فرض کفایہ ادا کیا گیا۔ جب تک یہ بھیڑ بھاڑ رہی بیچارے گل فروش متحیر و گم سم

آشیاں جلتا رہا اور باغباں دیکھا کیے

جب ہوش میں آئے اور حواس بجا ہوئے تو میدان خالی تھا۔ جہاں انسانوں کا سمندر موجیں مار رہا تھا وہاں ہو کا عالم تھا۔ اب یہاں گل فروش تھے، مالاؤں کے انبار تھے اور مالکان ہوٹل کی طرف سے بقیہ رقم کرایہ کی ادائیگی اور جلد سے جلد ہوٹل خالی کرنے کا تقاضا اور مطالبہ۔ سارے گل فروش مالاؤں کے انبار کو وہیں چھوڑ کر روتے پیٹتے شہر کی جانب چل پڑے۔ جس شخص نے ان کی طرف آنکھ اُٹھا دی اس سے وہ اپنی بپتا کہنے لگ گئے۔ ان سے ہمدردی سب کو ہوئی اور کر کوئی کچھ بھی نہ سکا۔ یہ وقت وہ تھا جبکہ خلافت کمیٹی دم توڑ رہی تھی۔

تحریک خلافت مصطفیٰ کمال پاشا کے القائے خلافت کے بعد بستر علالت

پر دراز تھی اور روز بروز مضمحل ہوتی چلی جا رہی تھی۔ تاہم چند مقامات پر اس کا اثر باقی تھا اور تحریک میں کام کرنے والے تحریک کے اضمحلال کے باوجود اپنے مخلصانہ کردار اور حاجت روا و ہمدرد خلائق ہونے کی وجہ سے پبلک کی نگاہوں میں معزز و موقر تھے۔ خاص کر بمبئی شہر، حسین شہید سہروردی کے کلکتہ اور میرے وطن اجمیر شریف میں اس کا اثر و نفوس صاف صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ اس اثر کی نوعیت کے بعض پہلو بڑے عجیب اور مضحک بھی تھے، مثلاً اگر بارش نہیں ہوئی ہے، سخت گرمی پڑ رہی ہے، قحط کے آثار ہیں تو لوگ محلّوں سے میٹنگ کر کر کے خلافت میں آتے تھے اور ہم سے بڑی سنجیدگی کے ساتھ شکایتی لہجے میں باضابطہ مطالبہ کرتے تھے کہ صاحب گرمی کی شدت سے پبلک پریشان ہے، قحط کا اندیشہ ہے، آپ یہاں کیا کرتے رہتے ہیں؟ آپ سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ پانی برسوا دیں؟ اجمیر شریف میں اتفاق سے دو ولی صفت بزرگ ایک دن ایک ہی وقت میں انتقال کر گئے۔ دونوں کی تجہیز و تکفین کا وقت قریب قریب ایک ہی تھا اور دونوں کی تدفین علیحدہ علیحدہ قبرستانوں میں بیک وقت ہونی تھی۔ یہ صورت حال بلائے جان بن گئی۔ ایک گل خن افروز (چنے بیچنے والا بھڑبھونجا) سر بازار گلے پڑ گیا اور چلا چلا کر بڑے کرخت لہجے میں کہنے لگا کہ ”بس صاحب بس! دیکھ لیا آپ خلافت والوں کو، بڑے لیڈر [رہنما] بنے پھرتے ہیں“۔ اس دوران میں ہمارے گرد ایک اچھی خاصی بھیڑ جمع ہو گئی۔ میں نے اس خوف سے کہ ممکن ہے ہم میں سے کسی سے کوئی سنگین اور شرمناک قسم کا جرم سرزد ہو گیا ہو اور علانیہ سر بازار افشا کر کے یہ بھڑبھونجا عزت کے ٹکے کر ڈالے بڑے ملائم انداز میں ڈرتے ڈرتے اس سے خفگی کی وجہ اور اپنا قصور دریافت کیا۔ کہنے لگا:

صاحب! یہ دونوں بزرگ ایک وقت کیسے مر گئے؟ اب ہم دونوں کے کفن دفن اور نماز جنازہ میں کیسے شریک ہوں؟ ایک سے تو ہم نا محروم (محروم کی بجائے نا محروم اسی کی اُپج ہے) ہی رہ جائیں گے۔آپ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ ان کے مرنے کا وقت آگے پیچھے کر دیتے۔

اس کی لن ترانی سن کر لوگ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور ان الفاظ میں معذرت کر کے پیچھا چھڑایا کہ اس دفعہ غفلت کو معاف کرو آئندہ ایسی باتوں کا خیال رکھا جائے گا۔ ہاں تو عرض یہ کر رہا تھا کہ خلافت والے اپنے ایثار اور محیر العقول کارناموں کی وجہ سے پبلک کے دلوں میں اس قدر اُتر گئے تھے کہ ان کو قضا و قدر کے کارخانے میں دخیل سمجھ لیا گیا تھا۔ ایسے ہی تاثرات کے ماتحت بہت سے لوگوں نے گل فروشوں کو مشورہ دیا کہ خلافت ہاؤس جاؤ، وہاں شاید کوئی صورت اور اس مشکل کا حل نکل آئے۔

میں خلافت کے دفتر میں اپنی نشست پر کام کر رہا تھا کہ پچیس تیس افراد پر مشتمل ایک انبوہ روتا پیٹتا دفتر میں داخل ہوا۔ اُن کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔کسی کے آنسو بہہ رہے تھے، کسی کی آنکھیں خشک تھیں مگر صورت روہانسی بنی ہوئی تھی۔ دریافت کرنے پر ان لوگوں نے ساری داستان غم سنا ڈالی۔ایک دو باتیں کہتے تھے اور بیچ بیچ میں کچھ کچھ رو بھی لیتے تھے۔سب کچھ سننے کے بعد میں حیران و سراسیمہ ہو کر رہ گیا اور دیر تک سوچ بچار کے بعد صرف یہی کہہ سکا کہ میں کیا کر سکتا ہوں، میرے بس میں کیا ہے؟ مایوسی کے یہ کلمات سن کر وہ لوگ اور بھی بکھر گئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ وہ رو رہے تھے اور ہم حیران و ششدر ان کو دیکھ رہے تھے۔اب یہاں سے داستان کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے جو مقصود بالذات ہے اور جس کی خاطر تمہید ہی کے معلوم نہیں کتنے

صفحات سیاہ کر دینے پڑے۔

جس دفتر خلافت میں گریہ و زاری کا کہرام بپا تھا اور تحیر و مایوسی کے بادل چھائے ہوئے تھے ٹھیک اسی کے بالائی حصے میں علامۃ المشرق اقامت گزیں تھے۔ دفعتاً علامہ کی تصویر اُبھری اور نگاہوں میں پھر گئی۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور ان لوگوں سے کہتا ہوا کہ ''ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں'' بالائی منزل پر پہنچ گیا۔ وہاں علامہ اپنی حالت میں گم اور حسب دستور آنکھیں بند کیے کسی فکر میں غرق تھے۔ میں نے قریب پہنچ کر قدرے اونچی آواز میں کہا:

خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب[3]

علامہ نے آنکھیں کھولیں۔ فرمایا ''بیٹھو! کیا بات ہے؟'' میں نے گل فروشوں کی تمام کتھا ایک ہی سانس میں سنا دی اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ غالباً کل شام تک شہزادگان حیدرآباد روانہ ہو جائیں گے، ان کی اسپیشل [خصوصی ریل گاڑی] تیار کھڑی ہے۔ قدرے تامل کیا، ہاتھ بڑھا کر میرے ہاتھ سے وہ مالائیں لے لیں جو میرے ہاتھ میں تھیں۔ ان کو بغور دیکھا۔ پھر فرمایا ''ہار کتنی تعداد میں ہیں؟'' میں نے عرض کیا ''لاکھ ڈیڑھ لاکھ ہوں گی یا کچھ کم و بیش۔'' فرمایا ''اسپیشل کتنی لمبی ہے؟'' میں نے کہا ''بڑی لمبی شیطان کی آنت ہے۔'' فرمایا ''ان ہاروں سے پوری اسپیشل کو سجا کر دلہن کیوں نہ بنا دیا جائے؟'' میں علامہ کی ساری اسکیم کو سمجھ گیا جو ان کے دماغ میں آ چکی تھی۔ میں نے تائید کی۔ ٹیلیفون کی طرف ہاتھ لہراتے ہوئے فرمایا ''فون قریب لاؤ

---

[3] ترجمہ:

اٹھ کہ مشرق و مغرب سب برباد ہوئے

مترجم: محمد سہیل عمر

اور سر اکبر حیدری سے ملا دو''۔ میں نے قریب میز سے فون اُٹھا کر علامہ کے قریب رکھا۔ ریسیور اُٹھا کر ڈائل کو گھمایا۔ سر اکبر حیدری کا اسپیشل نمبر [خصوصی عدد] مل گیا۔ اس طرف سے خود حیدری بول رہے تھے۔ علامہ نے ساری رام کہانی سنا کر فرمایا کہ حکومت نظام یہ سب ہار مقررہ قیمت پر خرید لے اور ان گل فروشوں ہی کو اس کو اندر باہر سے سجا دینے پر مامور کر دیا جائے۔ یہ اسپیشل بجائے خود ایک عجوبہ اور نئی چیز ہوگی۔ یہاں سے دکن تک کی فضائیں معطر ہوتی چلی جائیں گی اور ایک دل کش نظارہ اور اچھا تماشا رہے گا۔ سر اکبر نے علامہ کی بات بھی پوری نہ ہونے دی اور بڑی بیتابی سے کہا کہ ان گل فروشوں کو فوراً نظام پیلس بھیج دیا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسپیشل کو سجانے کا مسئلہ سر اکبر کے زیر غور تھا کہ علامہ نے ان کی مشکل حل کر دی۔ میں نے نیچے پہنچ کر ان لوگوں سے کہا کہ ایک منٹ [لمحہ] ضائع کیے بغیر نظام پیلس پہنچو اور سر اکبر حیدری سے ملو۔ یہ لوگ بھاگم بھاگ نظام پیلس جا پہنچے اور سر اکبر نے سارے ہاروں سے اسپیشل سجا دینے کے لئے ان لوگوں کو باضابطہ مامور کرنے کا آرڈر دے دیا۔

چار پانچ بجے شام سے تمام رات اور دن کے گیارہ بجے تک یہ لوگ اسپیشل سجاتے رہے اور واقعی اس کو دلہن بنا کر رکھ دیا۔ دو بجے کے قریب سر اکبر آئے۔ کام کو پسند کیا اور پوری قیمت اور سجائی کی اُجرت اسی وقت چیک کے ذریعے ادا کر دی۔ دوسرے دن صبح ہی صبح پانچ چھ ٹیکسیاں خلافت ہاؤس میں داخل ہوئیں۔ ان میں سے گل فروش نکلے اور مٹھائیوں اور فروٹس [پھلوں] کے چند ٹوکرے بھی برآمد ہوئے۔ ان لوگوں نے یہاں پہنچ کر اور وفور مسرت سے بے قابو ہو کر عجیب مجنونانہ حرکات کیں۔ خلافت ہاؤس کو سر پر اُٹھا لیا۔ ہم لوگوں کو کندھوں پر بٹھا لیا۔ سروں، چہروں، رخساروں کو

چوم چوم کر گندہ کر دیا اور خواہش ظاہر کی کہ علامہ کی زیارت کرائی جائے، ان سے شرف ملاقات کا موقع بہم پہنچایا جائے۔علامہ بدقت اس پر تیار ہو سکے کہ ہال کی کھڑکی کے سامنے آ گئے۔ سب کے سلاموں کا جواب دیا۔ فروٹاور مٹھائیوں کے متعلق فرمایا کہ یہ غیر ضروری تکلیف اور تکلف کیوں کیا اور اتنا فرما کر اپنی جگہ جا بیٹھے۔ مٹھائی اور فروٹ میں سے بقدر قلیل ایک سینی میں سجا کر علامہ کی خدمت میں پیش کیے گئے جس پر آپ نے صرف ایک غلط انداز نگاہ ڈالی۔ان ماکولات کے ساتھ علامہ کی سرد مہری نے حاشیہ نشینوں کو سرگرم عمل کر دیا اور وہ سارا خوان چٹ کر گئے۔ فروٹس اور مٹھائیوں کے ٹوکروں پر خلافت کمیٹی، خلافت اخبار، خلافت پریس کے کارکن ٹوٹ پڑے اور یہ سب ٹوکرے چشم زدن میں خالی ہو گئے اور حضرت اقدس خواجۂ اعظم اجمیری نور اللہ مرقدہ' کی دیگ لٹنے کا سماں آنکھوں میں پھر گیا۔

۶

اقبال کی زندگی کے چند گوشے*

محمد شفیع کنبوہ

شیخ حسن دین[1] صاحب مرحوم مدت مدید تک انجمن حمایت اسلام لاہور کے کتب خانے کے سپرنٹنڈنٹ[مہتمم] رہے اور وہ لاہور کے کشمیری خاندانوں سے اچھے خاصے روابط رکھتے تھے کچھ اس لئے کہ وہ خود کشمیری تھے اور دوسرے اس لئے بھی کہ وہ صاحب ذوق تھے اور سوشل ورکر [سماجی کارکن] بھی تھے۔انھوں نے مجھے ایک واقعہ سنایا جو حسب ذیل ہے:

> یہ کوئی سنہ ۱۹۱۴ء-۱۹۱۵ء کا ذکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی شادی کے چرچے لاہور میں ہونے لگے۔ بہتیرے خاندانوں نے خواہش ظاہر کی مگر ڈاکٹر صاحب کسی کی نہ سنتے تھے۔آخر لاہور کے چند اکابر نے منشی محبوب عالم پیسہ اخبار والوں کی لڑکی فاطمہ بیگم کی طرف اُن کی توجہ دلوائی اور کہا کہ لڑکی فاضلہ اردو فارسی جانتی ہے اور آج کل پونا میں کسی کالج میں پڑھاتی بھی ہے اس لئے یہ رشتہ ٹھیک رہے گا۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے انکار کر دیا۔
>
> اس بات کی خبر جب فاطمہ بیگم کو پہنچی تو اُس نے گرمیوں کی چھٹیوں میں لاہور کا ارادہ کر لیا۔ یہاں آنے سے پیشتر اُس نے بڑی جرأت سے کام لے کر ڈاکٹر صاحب کو ایک چٹھی لکھی جس میں اُس نے لکھا:

---

* سہ ماہی، اقبالیات اردو، جلد ۷، شمار ۲، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، جولائی ۱۹۶۶ء۔

[1] شیخ حسن دین کی علامہ اقبال کے بارے میں ایک تصنیف کے لیے دیکھیے:
شیخ حسن دین، ''پس چہ باید کرد کا منظوم ترجمہ''، مشمولہ حسن دین+ شیخ مقبول الٰہی، اقبال کی پس چہ باید کرد مع مثنوی مسافر، لاہور، شیخ غلام علی، ۱۹۸۸ء۔

> آپ یہ جان کر خوش ہوں گے کہ میں ایک ادیب کی لڑکی ہوں اور مجھے مدت سے پڑھنے لکھنے کا شوق ہے۔آج کل میں شعر بھی کہتی ہوں اس لئے میری خواہش ہے کہ اس فن کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں۔میں عنقریب لاہور آ رہی ہوں۔اگر آپ اجازت دیں تو میں کبھی کبھار اصلاح لینے کی غرض سے آپ کے پاس آ جایا کروں کیونکہ آپ ہمارے قریب ہی تو رہتے ہیں (انار کلی بازار میں)

جس وقت یہ چٹھی ڈاکٹر صاحب کو ملی تو ڈاکٹر صاحب نے حاضرین مجلس کو دکھائی جن میں غالباً احمد دین وکیل بھی موجود تھے۔پھر جلدی سے چٹھی لے کر اس کی پشت پر یہ شعر لکھ دیا:

شوقِ تحریرِ مضامیں میں گھلی جاتی ہے
بیٹھ کر پردہ میں بے پردہ ہوئی جاتی ہے

[باقیات[2]، ص 385]

اور اُسی طرح اُس چٹھی کو ایک نئے لفافہ میں بند کر کے واپس بھیج دیا۔واللہ اعلم بالصواب۔

یہ ۱۹۳۶ء کے کرسمس کی ایک رات کا ذکر ہے کہ میرے چند عزیزوں نے اقبال سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔چنانچہ عشاء کی نماز کے بعد ہم جاوید منزل کی طرف روانہ ہوئے۔وہاں پہنچے تو علی بخش کی مہربانی سے معلوم ہو گیا کہ ڈاکٹر صاحب ابھی جاگ رہے ہیں۔ہم نے اجازت چاہی۔ڈاکٹر صاحب نے لیٹے ہی لیٹے کروٹ لی اور ہمارے سلام کا جواب دینے کے بعد صورت احوال پوچھی۔طے شدہ پروگرام کے مطابق میرے ایک رفیق

---

[2] محمد اقبال، کلیات باقیات شعر اقبال: متروک اردو کلام، مرتبہ، صابر کلوروی، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۴.(بعد ازاں کتاب میں اس کو مختصراً 'باقیات' لکھا گیا ہے۔مرتب)

نے ڈاکٹر صاحب سے عرض کی حضور جاوید نامہ میں آپ نے شرف النساء بیگم کے محل کی بہت تعریف کی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

ڈاکٹر صاحب یہ سنتے ہی تھوڑے سے اُچھلے اور ہماری طرف پوری توجہ کے ساتھ یوں گویا ہوئے:

تمہیں معلوم نہیں کہ شرف النساء بیگم کون تھی۔ اتنی پاکباز اور اسلام کی پرستار عورت کا نام بھی مسلمانوں کو نہیں آتا۔ افسوس۔

ہم سب خاموشی کے ساتھ اُن کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھ رہے تھے جو لحظہ بہ لحظہ سرخ ہو رہا تھا۔ پھر یکدم بول اُٹھے:

سنیے! شرف النساء بیگم لاہور کے ایک صوبیدار کی لڑکی تھی۔ بڑی نیکو کار اور پرہیزگار۔ اُسے صحیح اسلام کا پتہ چل گیا تھا۔ چنانچہ وہ ہمیشہ اپنے پاس تلوار اور قرآن پاک کا ایک نسخہ رکھتی تھی۔ قرآن پڑھنا اور تلوار سے کھیلنا یہ اُس کا روزمرہ کا شغل ہو گیا تھا۔ چنانچہ اپنے بستر مرگ پر اُس نے یہ وصیت کی کہ اُس کے مرنے کے بعد قرآن پاک اور اس کی تلوار کو اُس کی میت کے ساتھ ہی دفن کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اور یہ جی ٹی روڈ پر گلابی باغ کی چوکی کے پچھلی طرف جو سرو والا مقبرہ کہلاتا ہے اُسی کا ہے۔ یہ سیدھا مقبرہ کھڑا ہے اور اس کے اوپر جانے کا کوئی راستہ نہیں۔ اب جب سکھوں کا دورِ حکومت آیا تو کسی نے اُن سے کہہ دیا کہ اس مقبرے میں خزانہ مدفون ہے۔ چنانچہ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً ہی مقبرے کی کھدائی شروع کر دی اور یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ قبر میں ہڈیوں کے ڈھانچے کے علاوہ قرآن پاک کے چند بوسیدہ اوراق اور ایک زنگ آلود تلوار کے سوا اور کچھ بھی نہیں جنھیں تلف کر دیا گیا۔

اب آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ تلوار اور قرآن کی بات شرف النساء بیگم نے کہاں سے سیکھی۔ سنئیے:

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں حضرت سلمان فارسیؓ کوفہ کے گورنر [حاکم صوبہ] تھے۔ اُن کے عہد میں وہاں کے دارالامارت (گورنمنٹ ہاؤس) [سرکاری رہائش

گاہ] میں آگ لگ گئی۔ ملازمین سراسیمگی کی حالت میں آگ بجھانے میں مشغول مگر حضرت سلمان فارسی نہایت اطمینان کے ساتھ ایک طرف جا کر کھڑے ہو گئے۔ لوگوں نے ان کی توجہ مال و اسباب کی طرف دلائی اور کہا کہ حضور آپ اپنے مال و منال کے نکالنے کے لئے کیا حکم صادر فرماتے ہیں۔ مگر حضرت سلمان فارسی نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ فرمایا کہ میں اپنا اثاثہ نکال لایا ہوں اور دیکھو وہ یہ ہے۔ ایک گھوڑا، ایک تلوار اور قرآن پاک کا یہ نسخہ، مسلمانوں کا اثاثہ بس یہی ہے اور یہ میں لے آیا ہوں، مجھے دوسرے دنیوی مال و منال کی ضرورت نہیں۔ یہ سن کر حاضرین آبدیدہ ہو گئے اور انھیں معلوم ہو گیا کہ مسلمان کی صحیح جائیداد کون سی ہے۔

بس اسی واقعہ سے شرف النساء بیگم نے سبق سیکھا اور ہمیشہ تلوار اور قرآن کو پاس رکھا۔ پھر کیوں نہ وہ جنت میں ایک بہترین مقام حاصل کرے، اُس کا محل یقیناً سب سے ارفع و اعلیٰ ہوگا۔ یہ ہے شرف النساء بیگم کی مختصر داستان۔ اب تم سوچو کہ تم اسلام کی تعلیمات پر کس حد تک عمل کرنے کے لئے تیار ہو۔

ہم سوچ میں پڑ گئے اور واپسی کی اجازت چاہی جو مل گئی۔ اُس وقت ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں میں آنسو تھے جنھیں وہ ضبط کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

یہ مارچ ۱۹۳۷ء کے آخری عشرہ کا ذکر ہے۔ امرتسر کے چند بیوپاری قسم کے دوست شالامار باغ کا میلہ دیکھنے کے لئے لاہور تشریف لائے۔ یہ نیم خواندہ اصحاب باتوں باتوں میں ڈاکٹر اقبال کا ذکر لے بیٹھے۔ ان میں سے ایک صاحب نے یہ فرمائش کر دی کہ اگر میں انھیں ڈاکٹر اقبال کی زیارت کرا دوں تو وہ حضرت مادھو لال حسین کے مزار پر چراغاں دیکھنے کے لئے نہیں جائیں گے۔ چنانچہ میں اُن پانچوں دوستوں کو لے کر جاوید منزل جا پہنچا اور علی بخش سے درخواست کی کہ وہ انھیں ڈاکٹر صاحب کی زیارت کرا دے کیونکہ یہ اصحاب بڑی دُور سے آئے ہیں۔ علی بخش نے اندر جھانکا، پھر اندر جا کر ڈاکٹر

صاحب کے پلنگ کے سامنے چھ کرسیاں رکھ کر اندر پہنچنے کا اشارہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب اُس وقت ایک دھوتی اور بنیان پہنے لیٹے ہوئے تھے۔ ہم سب نے مودبانہ سلام کیا اور انھوں نے جواب دیتے ہوئے کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مگر ہم نے کرسیوں کو پیچھے دھکیل دیا اور فرش پر بیٹھنے کو ترجیح دی۔ جس وقت ہم دو زانو ہو کر بیٹھ گئے تو بڑی متجسسانہ نگاہوں سے ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے:

کیوں بھائیو! کیسے آئے ہو؟

میں نے جواب دیا کہ جناب یہ صرف آپ کی زیارت کے لئے آئے ہیں۔

زیارت ! ارے کسی پیر کی زیارت کر لی ہوتی، میں تو کوئی پیر نہیں۔ لوگ ہمیشہ پیروں فقیروں کی زیارت کیا کرتے ہیں۔

چند لمحات کی خاموشی کے بعد میرے ایک ساتھی نے کہا کہ افسوس ہے ہم نے اس وقت جناب کو تکلیف دی اور جناب کے لئے کوئی تحفہ بھی نہ لا سکے۔ یہ سنتے ہی وہ یک دم بول اُٹھے:

تحفہ؟ وہ کیا ہوتا ہے
مسلمان کے گھر مسلمان کا آ جانا ہی تحفہ ہے۔

یہ فقرہ دو بار دُہرایا اور پھر ہم سب کی طرف متوجہ ہو کر بولے:

اچھا یہ بتاؤ! نماز پڑھا کرتے ہو یا نہیں؟

یہ سنتے ہی ہم ایک دوسرے کی بغلیں جھانکنے لگے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جواب دیں۔ آخر میں نے جرأت سے کام لے کر عرض کیا:

حضور نماز تو پڑھتے ہیں مگر دل نہیں لگتا۔ بھولی ہوئی چیزیں یاد آ جاتی ہیں۔

وہ سنتے ہی مسکرا پڑے اور فرمانے لگے:

ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے بھی نماز میں انھیں حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اچھی طرح دلجمعی نہیں ہوتی۔ قرطبہ میں میرا جی چاہتا تھا کہ نماز پڑھوں۔

جامع اظہر میں نماز پڑھنے کا بڑا لطف آتا تھا۔ بھلا غور کرو۔ جمعہ کا دن ہو، مسلمان جوق در جوق نماز پڑھنے کے لئے جا رہے ہوں، مسلمانوں کے بادشاہ کی سواری کی آمد آمد ہو۔ مسلمانوں کی فوجیں بازار میں دو رویہ کھڑی ہوں تو پھر کون بدبخت ہے جس کا دل نماز پڑھنے کو نہ چاہے۔ یہ غلام آباد ہے۔ تم سچے ہو۔

جس وقت ڈاکٹر صاحب یہ کہہ رہے تھے تو اُن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں آنسو اُمڈے چلے آ رہے تھے۔ ایک خاص قسم کے جوش کے ساتھ وہ اُچھلے اور پھر لیٹ گئے۔ کمرے میں سناٹا طاری ہو گیا۔ چند لمحات کے بعد پھر یوں گویا ہوئے:

بھائیو! نماز پڑھا کرو، پڑھتے پڑھتے ہی نماز پڑھی جائے گی۔ سپاہی پریڈ کرتا کرتا ہی کبھی جرنیل بن جاتا ہے۔ نماز پڑھا کرو۔ اسی میں فائدہ ہے۔

ان الفاظ کے ساتھ وہ خاموشی سے لیٹ گئے اور علی بخش نے ہمیں چلے جانے کا اشارہ کیا۔ چنانچہ ہم بھی نہایت خاموشی کے ساتھ سلام کر کے رخصت ہوئے۔

یہ ستمبر یا اکتوبر ۱۹۳۷ء کا واقعہ ہے کہ میں نے پچھلے پہر میو روڈ سے گزرتے ہوئے چند نوجوانوں کو جاوید منزل میں گھستے ہوئے دیکھا۔ میں بھی غیر شعوری طور پر ان کے پیچھے ہو لیا۔ آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے میں۔ برآمدے کے ساتھ والے چھوٹے کمرے میں اس وقت ڈاکٹر صاحب ایک آرام کرسی پر بیٹھے یا لیٹے حقہ پی رہے تھے۔ ہم سب نے بیک وقت سلام کیا اور حکم کے مطابق سامنے بچھی ہوئی کرسیوں پر سمٹ کر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان نوجوانوں کی طرف نگاہ ڈالی گویا کہ ان کی تشریف آوری کا مطلب پوچھا۔ ان میں سے ایک نے عرض کیا:

جناب پندنامۂ عطار میں ایک شعر ہے

کفر کافر را و دین دیندار را

ذرۂ درد دل عطار را[3]

اس شعر کا مطلب سمجھنے کے لئے ہم یہاں حاضر ہوئے ہیں۔
شعر سنتے ہی ڈاکٹر صاحب کچھ نیم بگولاسا ہو گئے اور فرمانے لگے:
یہ تمہیں کس نے پڑھایا کہ یہ پند نامۂ عطار کا شعر ہے؟
آپ کون سے کالج میں پڑھتے ہیں؟
کس جماعت میں ہیں؟
کون کون سے مضامین آپ نے کالج میں لے رکھے ہیں؟ آپ کے والد صاحبان کیا کرتے ہیں؟

ان تابڑ توڑ سوالات سے وہ نوجوان کچھ بھونچکے سے رہ گئے اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔آخر ایک نے بتلایا کہ وہ ایف اے کا طالب علم ہے اور دوسرے نے بی ایس سی کا طالب علم ہونا ظاہر کیا۔پہلے نے فارسی میٹرک تک پڑھی تھی اور دوسرے نے مڈل[آٹھویں جماعت] تک۔البتہ دونوں کے گھروں میں علم و ادب کا کافی چرچا ہے۔کسی پڑھے لکھے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب کا چہرہ متغیر ہو گیا اور فرمانے لگے:

تھوڑی سی فارسی پڑھ لینے سے فارسی نہیں آئے گی۔معلوم نہیں کس نے آپ کو غلط سلط پڑھا دیا ہے۔یہ شعر پند نامۂ عطار کا نہیں اور اس کو سمجھنے کے لئے کافی عمر درکار ہے۔پہلے فارسی پڑھنے اور سمجھنے کا شوق پیدا کرو پھر کہیں جا کر اس کا مطلب سمجھ سکوگے۔میرا خیال تھا کہ تم فارسی پڑھ کر اب عربی کی طرف رجوع کروگے۔مگر افسوس تمہیں تو فارسی ہی نہیں آتی، اردو

---

[3] ترجمہ:

کافر کا کفر اور دیندار کی دینداری
عطار کے درد دل کا ایک ذرہ ہے

مترجم: محمد سہیل عمر

کتنی آتی ہو گی۔ تم تو سائنس کے طالب علم ہو، خدا ہی تمہارا حافظ ہے۔

جس وقت اقبال کی زبان سے یہ الفاظ نکل رہے تھے تو ان کا چہرہ سرخ اور ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ ایک خاص قسم کا جوش نمایاں تھا بلکہ مونچھوں کے بال بھی تنے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ لب و لہجہ آہستہ آہستہ تیز ہو رہا تھا۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد پھر فرمانے لگے۔

تمہارا کوئی قصور نہیں۔ یہ صرف غلط تعلیم کا نتیجہ ہے۔ پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا کرو۔ فرصت کے اوقات میں کسی قابل آدمی کی مجلس میں بیٹھ جایا کرو۔ اگر خدا کو منظور ہوا تو کبھی پڑھ ہی لو گے۔

سنو اگر کچھ سیکھنا ہے تو عربی پڑھو۔ صرف قرآن پڑھنے سے عربی نہیں آئے گی بلکہ عربی کو بحیثیت عربی زبان کے پڑھو پھر کچھ بنے گا۔

۷

چند تاثرات*

محمد فاضل[1]

چونکہ میرا تعلق سفارت خانۂ افغانستان متعینہ ہند سے ۱۹۰۸ء سے بحیثیت ترجمان و سکریٹری [معتمد] قائم رہا اس لئے میں جب کبھی لاہور آتا تھا تو اقبال سے اکثر ملاقات کا شرف حاصل کیا کرتا تھا۔ وہ مجھ سے بہت تپاک سے ملتے اور سفارت و حکومت کے حالات دریافت کرتے۔ میں ہمیشہ ان کے اشعار سفرائے افغانیہ کے سامنے پڑھ کر ان کے کلام کی ہمہ گیری اور اثر آفرینی کا ذکر کیا کرتا تھا۔ اقبال زندگی بھر انجمن حمایت اسلام کے حامی کی حیثیت سے بہت دیر تک سیکریٹری اور پھر مدت تک صدر انجمن رہ کر عالم اسلامی کی بالعموم اور مسلمانان ہند کی بالخصوص تعلیمی امداد اور خدمات کے سرچشمہ رہے۔ چنانچہ امیر حبیب اللہ خان تاجدار افغانستان جب سیاحت ہندوستان پر لاہور آئے تو یہ مرحوم میر شمس الدین صاحب اور اقبال کی مساعی کا ہی نتیجہ تھا کہ حبیبیہ ہال اسلامیہ کالج لاہور کی منظوری ہوئی اور اساس رکھی گئی۔

جب کبھی بھی مجھے اپنے بعض احباب زادگان کے داخلہ یا اعطائی وظائف

---

* سہ ماہی، اقبالیات اردو، جلد ۶، شمار ۴، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، جنوری ۱۹۶۶ء۔

[1] محمد فاضل کی علامہ اقبال کے بارے میں ایک اور نگارش کے لیے دیکھئے:
محمد فاضل، ''اقبال اور عشق رسول ﷺ''، مشمولہ، سلیم اختر، مرتبہ، اقبالیات کے نقوش، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۷ء۔

میں وقت پیش آتی تو اقبال کے قلم و زبان نے غربا کی امداد کرنے سے کبھی دریغ نہ فرمایا۔ وہ حقیقتاً کریم النفس اور حامی غربا بزرگوار تھے۔ چونکہ عام طور پر لوگوں کو معلوم تھا کہ تمام سفرائے افغانستان اور خود حکومت افغانستان اقبال کا بہت احترام اور بے حد اکرام کرتے ہیں اس لئے بہت سے لوگ بسا اوقات استحصال ملازمت [حصولِ ملازمت] اور استخدام [استعمال] کے لئے جناب ڈاکٹر صاحب کی وساطت ڈھونڈتے تھے اور جناب موصوف مستحق اشخاص کی امداد کرنے میں کبھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اکثر تحریراً و تقریراً مجھے اشارہ فرما دیا کرتے تھے اور ان طالبین کا کام بخیر و خوبی انجام پا جاتا تھا۔ لیکن اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کو بعض لوگوں کے کردار پر اشتباہ[شک وشُبہ] ہوا تو پھر آپ نے ان مساعی سے بہت حد تک ہاتھ روک لیا۔

جب محمود طرزی صاحب وزیر خارجہ افغانستان امیر امان اللہ کے عہد میں بعد از محاربہ[جنگ و جدل کے بعد] افغانستان و برطانوی ہندوستان میں وفد صلحیہ [امن کا وفد] کے رئیس مقرر ہو کر کوہ منصوری پر پہنچے تو بندہ وفد منصوری کا سکریٹری مقرر ہو گیا۔ رئیس وفد نے اقبال سے خصوصی مکاتبہ [خط و کتابت] میں مشاورت کی کہ وہ انھیں انگریزوں سے حصول مراعات لازمہ کے بارہ میں اپنی رائے بیضا ضیا [روشن کردینے والی] سے مستفید کریں۔ چنانچہ علامہ مرحوم وقتاً فوقتاً اپنی رائے اور اشارات سے مستفیض فرماتے رہے اور محمود طرزی مرحوم نے کابل واپس جاتے ہوئے میرے توسل سے اقبال کا بے حد شکریہ ادا کیا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ قیام وفد صلحیۂ افغانستان کے زمانہ میں سیوائے ہوٹل منصوری میں انجمن حمایت اسلام لاہور کی طرف سے ایک نمایندہ اعانت کے لئے وفد سے ملاقات کرنے کا خواہشمند تھا۔ اور وفد کے قیام کے زمانہ

میں منصوری میں اس قدر خفیہ پولیس کے آدمی مقرر تھے کہ ہر شخص پر سی۔آئی۔ڈی[کرمنل انویسٹی گیشن ڈیپارٹمنٹ: محکمۂ تحقیقاتِ جرائم] کا شبہ ہوتا تھا اور سلجوقی صاحب سفیر کے قول کے مطابق: از رمہ کردہ سگ ہا بسیار بود یعنی ریوڑ اتنا زیادہ نہ تھا جتنے کتے تھے۔جناب محمود طرزی رئیس وفد افغانستان ہوٹل کے ایک برآمدہ میں بیٹھے مجھ سے اخبار و اطلاعات سن رہے تھے۔سامنے ہوٹل کے دروازے پر جو نظر پڑی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک معمر سفید پوش متدین سے شخص کو سی آئی ڈی والے برابر دھکے دے رہے ہیں اور گالیاں دے کر دروازے سے باہر نکال رہے ہیں۔میں نے طرزی صاحب کو کہا کہ دیکھئے صاحب غالباً کوئی شخص ملاقات کو آنا چاہتا ہے لیکن یہ سی آئی ڈی والے اس سے بیحد بے احترامی اور ہتک کا سلوک کر رہے ہیں۔اس پر مجھے کہا گیا کہ جا کر دیکھوں کہ کیا ماجرا ہے۔جب میں وہاں پہنچا تو اس نمایندہ نے مجھے ایک معرفی نامہ دیا جو ڈاکٹر صاحب کا تھا۔اس پر میں نے ان لوگوں کو خوب ڈانٹا ڈپٹا اور نمایندہ موصوف کو بہت بہت تسلی اور دلجوئی سے محمود طرزی صاحب کے پاس لے گیا۔

طرزی صاحب نے اسے نوازش بزرگانہ سے پاس بٹھا لیا اور فوراً مسٹر ایچیسن مہماندار انگریزی کو بلایا کہ اولاً اگر ہم لوگ قیدی ہیں اور کسی کو ہم سے ملنے کی اجازت نہیں تو کسی کو ڈیرہ دون سے آگے آنے کی اجازت ہی کیوں دی جاتی ہے۔اور ثانیاً اگر کوئی ہمارے رفیق محترم کا رقعہ لے کر اتنے لمبے سفر کے مصائب برداشت کر کے یہاں پہنچ بھی جاتا ہے تو پھر ہماری آنکھوں کے سامنے اسے کیوں پیٹا اور بے عزت کیا جاتا ہے۔اس کے بعد اگر ہم نے دیکھا یا سنا کہ کسی سی آئی ڈی والے نے ہمارے کسی ملنے والے سے ایسا سلوک کیا تو نتائج کی ذمہ داری ہرگز وفد پر عائد نہ ہوگی۔اس انتباہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت مدت تک کوئی سی آئی ڈی والا دائرہ ہوٹل میں قطعاً نظر نہ

میں وقت پیش آتی تو اقبال کے قلم و زبان نے غربا کی امداد کرنے سے کبھی دریغ نہ فرمایا۔ وہ حقیقتاً کریم النفس اور حامی غربا بزرگوار تھے۔ چونکہ عام طور پر لوگوں کو معلوم تھا کہ تمام سفرائے افغانستان اور خود حکومت افغانستان اقبال کا بہت احترام اور بے حد اکرام کرتے ہیں اس لئے بہت سے لوگ بسا اوقات استحصال ملازمت [حصولِ ملازمت] اور استخدام [استعمال] کے لئے جناب ڈاکٹر صاحب کی وساطت ڈھونڈتے تھے اور جناب موصوف مستحق اشخاص کی امداد کرنے میں کبھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اکثر تحریراً و تقریراً مجھے اشارہ فرما دیا کرتے تھے اور ان طالبین کا کام بخیر و خوبی انجام پا جاتا تھا۔ لیکن اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کو بعض لوگوں کے کردار پر اشتباہ[شک وشُبہ] ہوا تو پھر آپ نے ان مساعی سے بہت حد تک ہاتھ روک لیا۔

جب محمود طرزی صاحب وزیر خارجہ افغانستان امیر امان اللہ کے عہد میں بعد از محاربہ[جنگ و جدل کے بعد] افغانستان و برطانوی ہندوستان میں وفد صلحیہ [امن کا وفد] کے رئیس مقرر ہو کر کوہ منصوری پر پہنچے تو بندہ وفد منصوری کا سکریٹری مقرر ہو گیا۔ رئیس وفد نے اقبال سے خصوصی مکاتبہ [خط و کتابت] میں مشاورت کی کہ وہ انھیں انگریزوں سے حصول مراعات لازمہ کے بارہ میں اپنی رائے بیضا ضیا [روشن کردینےوالی] سے مستفید کریں۔ چنانچہ علامہ مرحوم وقتاً فوقتاً اپنی رائے اور اشارات سے مستفیض فرماتے رہے اور محمود طرزی مرحوم نے کابل واپس جاتے ہوئے میرے توسل سے اقبال کا بے حد شکریہ ادا کیا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ قیام وفد صلحیۂ افغانستان کے زمانہ میں سیوائے ہوٹل منصوری میں انجمن حمایت اسلام لاہور کی طرف سے ایک نمایندہ اعانت کے لئے وفد سے ملاقات کرنے کا خواہشمند تھا۔ اور وفد کے قیام کے زمانہ

میں منصوری میں اس قدر خفیہ پولیس کے آدمی مقرر تھے کہ ہر شخص پر سی۔آئی۔ڈی[کرمنل انویسٹی گیشن ڈیپارٹمنٹ: محکمۂ تحقیقاتِ جرائم] کا شبہ ہوتا تھا اور سلجوقی صاحب سفیر کے قول کے مطابق: از رمہ کردہ سگ ہا بسیار بود یعنی ریوڑ اتنا زیادہ نہ تھا جتنے کتّے تھے۔جناب محمود طرزی رئیس وفد افغانستان ہوٹل کے ایک برآمدہ میں بیٹھے مجھ سے اخبار و اطلاعات سن رہے تھے۔سامنے ہوٹل کے دروازے پر جو نظر پڑی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک معمر سفید پوش متدین سے شخص کو سی آئی ڈی والے برابر دھکے دے رہے ہیں اور گالیاں دے کر دروازے سے باہر نکال رہے ہیں۔میں نے طرزی صاحب کو کہا کہ دیکھئے صاحب غالباً کوئی شخص ملاقات کو آنا چاہتا ہے لیکن یہ سی آئی ڈی والے اس سے بیحد بے احترامی اور ہتک کا سلوک کر رہے ہیں۔اس پر مجھے کہا گیا کہ جا کر دیکھوں کہ کیا ماجرا ہے۔جب میں وہاں پہنچا تو اس نمائندہ نے مجھے ایک معرفی نامہ دیا جو ڈاکٹر صاحب کا تھا۔اس پر میں نے ان لوگوں کو خوب ڈانٹا ڈپٹا اور نمائندہ موصوف کو بہت بہت تسلی اور دلجوئی سے محمود طرزی صاحب کے پاس لے گیا۔

طرزی صاحب نے اسے نوازش بزرگانہ سے پاس بٹھا لیا اور فوراً مسٹر ایجیسن مہماندار انگریزی کو بلایا کہ اولاً اگر ہم لوگ قیدی ہیں اور کسی کو ہم سے ملنے کی اجازت نہیں تو کسی کو ڈیرہ دون سے آگے آنے کی اجازت ہی کیوں دی جاتی ہے۔اور ثانیاً اگر کوئی ہمارے رفیق محترم کا رقعہ لے کر اتنے لمبے سفر کے مصائب برداشت کر کے یہاں پہنچ بھی جاتا ہے تو پھر ہماری آنکھوں کے سامنے اسے کیوں پیٹا اور بے عزت کیا جاتا ہے۔اس کے بعد اگر ہم نے دیکھا یا سنا کہ کسی سی آئی ڈی والے نے ہمارے کسی ملنے والے سے ایسا سلوک کیا تو نتائج کی ذمہ داری ہرگز وفد پر عائد نہ ہوگی۔اس انتباہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت مدت تک کوئی سی آئی ڈی والا دائرہ ہوٹل میں قطعاً نظر نہ

آیا۔ چنانچہ اس نمایندہ کی کئی دن مہمانی کی گئی اور ایک ہزار روپیہ عطیہ کے طور پر دیا گیا اور جناب ڈاکٹر صاحب کو رقعہ بھیج کر تسلی دی گئی کہ عنقریب مذاکرات کے خاتمہ پر انجمن حمایت اسلام کے لئے کافی رقم مقرر کی جائے گی۔

جناب علامہ مرحوم نے نہایت شائستہ انداز میں شکریہ ادا فرمایا۔ اس عبارت سے مقصود یہ ہے کہ حضرت حکیم الامت کا تعلق ہمیشہ سفارت خانہ سے رہا اور انھیں ہر سفیر بے حد احترام کی نگاہ سے دیکھتا رہا۔ لیکن علامہ صاحب کے تعلقات جناب صلاح الدین سلجوقی سے تو عشق کی حد تک پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ ان تعلقات کا خواجہ اے رحیم اور راجہ حسن اختر صاحبان کو بخوبی علم ہے۔ ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب بمبئی تشریف لے گئے تو جناب صلاح الدین سلجوقی وہاں بحثیت افغان قونصل والکشور میں مقیم تھے اور ڈاکٹر صاحب سلطان مینش دفتر خلافت کے مہمان تھے۔ جب سلجوقی صاحب کو اس کا علم ہوا تو فوراً ایک رکن سفارت کو رقعہ دے کر بھیجا جس میں صرف یہی شعر لکھا تھا:

بیا بمیکدہ و چہرہ ارغوانی کن
مرو بصومعہ کانجا ریاکارانند[2]

مخلص سلجوقی

---

[2] ترجمہ:

میکدے میں آ کر چہرہ ارغوانی کر لو
عبادت گاہ میں کیا جانا کہ وہاں سب ریاکاری ہے

مترجم: محمد سہیل عمر

حضرت اقبال نے جو پہلے سے ہی صلاح الدین سلجوقی کی علم دوستی اور محبت کا چرچا سن چکے تھے اور مکاتبہ سے علایق مؤدت [باہمی الفت کے تعلقات] قائم کر چکے تھے، فوراً بوریا بستر لپیٹا اور سفارت خانہ میں آن بسیرا لیا۔ پھر کیا تھا شب و روز مجالس علمی گرم ہیں اور رشتہ محبت و ارتباط یوماً فیوماً [محبت اور ربط دن بہ دن]بڑھتا گیا۔ جناب سلجوقی صاحب بمبئی میں قونصل افغانستان کی حیثیت سے مامور تھے۔ جناب ڈاکٹر صاحب بمبئی سے چند روزہ قیام کے بعد اخلاص باہمی کے بہت گہرے اثرات لے کر آئے۔ اسی اثنا میں دہلی کے جنرل قونصل گری سردار عبدالرسول خان صاحب دہلی سے تبدیل ہو کر کابل چلے گئے۔ جناب اقبال نے سلجوقی صاحب کی صلاحیت و قابلیت و محبوبیت کو مدنظر رکھ کر حکومت افغانستان سے پُر زور تحریک کی کہ اگر سلجوقی صاحب کو دارالحکومت ہندوستان میں بطور جنرل قونصل مقرر کر کے بھیجا جائے تو نہایت ہی موزوں ہوگا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کو عالم اسلام کا خیر خواہ اور نفسی اغراض سے مبرا اور بالاتر بزرگ سمجھ کر ان کی تحریک قبول کر کے حکومت نے جناب صلاح الدین سلجوقی کو دہلی شملے کا سفیر مقرر کر کے افغانستان کی محبوبیت کو دنیائے ہندوستان میں چار چاند لگا دیئے۔ اس کے بعد ہر شخص خیال کر سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور سلجوقی صاحب کے یگانہ تعلقات کا کیا عالم ہوگا۔

جناب سلجوقی صاحب کے زمانہ قیام شملہ میں ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب نے سلجوقی صاحب کو اطلاع فرمائی کہ وہ ایک مقررہ تاریخ کو چند روز کے لئے شملہ تشریف لا رہے ہیں لیکن ان کا قیام شیخ اصغر علی صاحب کمشنر لاہور کے پاس ہوگا۔ سلجوقی صاحب نے بندہ سے فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب کی موٹر آج بالو گنج بیریئر [رکاوٹ] سے گذرے گی۔ یہ آپ کی بے حد ہمت اور مردانگی ہوگی کہ جناب ڈاکٹر صاحب کو موٹر سے اُتار کر بجائے چھوٹے

شملے جائے اور شیخ اصغر علی صاحب کے ہاں مقیم ہونے کے یہاں سمر ہل سفارتخانہ میں لے آؤ۔

چنانچہ میں چند افغانی مسلح گارد کے سپاہیوں کو سلامی دینے کے لئے ہمراہ لے گیا اور بیریئر پر موٹر کا انتظار کرنے لگا۔ اتنے میں کئی موٹریں آئیں اور چلی گئیں لیکن علامہ ان میں موجود نہ تھے۔ اتنے میں ایک موٹر آئی جس میں حضرت ڈاکٹر صاحب رونق افروز تھے۔ اس روز اقبال نے خلاف معمول لنگی باندھ رکھی تھی۔ مجھے پہچاننے میں ذرا دقت ہوئی لیکن جونہی پہچانا میں ان سے بغل گیر ہوا۔ مزاج پرسی کے بعد میں نے عرض کیا کہ میں مامور ہوں کہ جناب کو آگے جانے کے بجائے سفارت خانے لے چلوں اور میں نے مذاقاً عرض کیا کہ حضور اگر آپ سیدھی طرح نہیں چلیں گے تو یہ چند مسلح افغان جو آپ کی سلامی اُتارنے کی خاطر آئے ہیں آپ کو اغوا کر کے لے چلیں گے۔ اس پر اقبال نے فرمایا کہ میرا بستر موٹر سے اُتار لیا جائے اور شیخ اصغر علی صاحب کو ٹیلیفون پر کہہ دیا جائے کہ ڈاکٹر صاحب کو سلجوقی صاحب سفیر افغانستان نے بالو گنج اُتار لیا ہے۔ لیکن ساتھ یہ بھی کہہ دینا کہ شیخ اصغر علی آج لنچ [ظہرانہ] سفارت خانہ میں میرے ساتھ ہی کھائیں۔ چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی اور شیخ اصغر علی نے لنچ کی دعوت قبول کر لی۔ جب شیخ اصغر علی لنچ پر آئے تو ڈاکٹر صاحب نے مزاحاً فرمایا: شیخ صاحب اگر عجب خان مس [آنسہ] ایلس کو اغوا کر کے لے گیا تھا تو اس میں مس ایلس کا کوئی قصور نہ تھا وہ بیچاری قطعاً بے گناہ تھی۔

اس میں اشارہ یہ تھا کہ اگر سلجوقی نے عجب خان کا پارٹ [کردار] پلے [ادا] کر کے مجھے اغوا کر لیا اور سفار خانہ میں لے آیا تو میرا کوئی قصور نہ سمجھا جائے۔ اسی لطیفہ پر ساری محفل کشت زعفران بن گئی۔ لنچ ختم ہو چکنے پر جب ڈاکٹر صاحب استراحت کے لئے اپنے کمرہ میں تشریف

لے گئے تو ڈاکٹر صاحب کا خادم علی بخش بھی، جو ہر شخص کو معلوم ہے، سفر و حضر میں علامہ مرحوم کے ساتھ رہتا تھا کمرہ میں پاؤں دبانے چلا گیا تو سلجوقی نے مجھ سے پُر محبت لہجہ میں کہا کہ واللہ خیلے ہمت کردید کہ ایں شخص بزرگ و مشفق را آور دید ورنہ اندیشناک بودم کہ پروغرام خود را تبدل نخواہند نمود۔[بخدا، خوب ہمت کی کہ اس عظیم ہستی اور مشفق شخصیت کو لے آئے ورنہ میں تو فکر مند تھا کہ یہ اپنا پروگرام بدل نہ دیں] اس کے بعد کئی دعوتوں کا شملہ میں شیخ اصغر علی اور دیگر اکابرین شملہ کے ہاں رد و بدل ہوتا رہا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جب میں لاہور آیا تو ڈاکٹر صاحب کی ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ ڈاکٹر صاحب حسب معمول نہایت سادگی سے چارپائی پر ننگے سر لوئی اوڑھے لیٹے ہوئے حقے کے کش لگا رہے تھے۔ انھوں نے نہایت مہربانی اور گرمجوشی سے میری پذیرائی فرمائی، اور بھی کئی اہل علم استفادۂ علمی اور سیاسی کے لئے رونق افروز تھے، باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ دیر کے بعد دیگر لوگ اٹھ کر جاتے رہے۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے کہ جاوید منزل مکمل ہو گئی ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ جائیداد تین روز بھی کیوں میرے نام سے منسوب رہی ہے۔ اسی روز ڈاکٹر صاحب نے اسے اپنے فرزند جاوید کے نام منسوب و منتقل کر دیا اور فرمایا کہ دنیا میں درویش کے پاس کچھ بھی نہیں ہونا چاہئے۔ اقبال نے اس وقت ایک شعر فرمایا جو بدبختانہ مجھے یاد نہیں رہا لیکن اس کا مطلب اور مضمون بالکل اسی شعر کے مرادف تھا۔

ما ہیچ نداریم و غم ہیچ نداریم
دستار نداریم غم پیچ نداریم[3]

---

[3] ترجمہ:

اس سے ڈاکٹر صاحب کی شانِ غنا و بے نیازی ترشح ہوتی ہے۔
ایک دن ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اثنائے ملاقات میں اپنی زبانِ فیض ترجمان سے فرمایا: میں نواب صاحب بہاولپور (جو بہت ہی وسیع الاخلاق اور اقبال دوست حکمران تھے) کے بلانے پر وہاں (بہاولپور) گیا ہوا تھا۔ نواب صاحب نے حسب العادت بہت اعزاز و اکرام فرمایا اور چندے بعد کہا کہ اگر آپ وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ قبول فرمائیں تو ریاست بہاولپور کے لئے موجب افتخار و ترقیات ہوگا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے (جو ریاست کی پارٹی بازی[گروہ بندی] اور سیاست مداری سے بخوبی واقف تھے کیونکہ اُن کی آنکھوں کے سامنے کئی وزیر اعظم آئے اور کئی بمصداق [5] بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے، ریاست سے چلے گئے یا جبراً نکالے گئے) فرمایا نواب صاحب محترم! میں آپ کی شاہانہ پیشکش کا بے حد شکر گذار ہوں۔ عطیہ تو بے شک بہت دلکش و دلچسپ ہے مگر بمصداق

بدریا در منافع بے شمار است
وگر خواہی سلامت بر کنار است[4]

لیکن سیاسیات حاضرہ کو مدنظر رکھ کر میں نہیں چاہتا کہ ایک روز

نہ میرے پاس کچھ ہے نہ کسی چیز کے نہ ہونے کا غم
نہ بگڑی ہے نہ اس کے بل پیچ کی فکر ہے
مترجم: محمد سہیل عمر

[4] ترجمہ:
دریا میں بہت سے فائدے ہیں
ہاں سلامتی چاہتے ہو تو کنارے پر رہو
مترجم: محمد سہیل عمر

دست بدست دگرے اور پا بدست دگرے [ہاتھ بھی دوسرے کے ہاتھ میں اور پاؤں بھی دوسرے کے ہاتھ میں: یعنی بے اختیار]ہو کر ریاست سے نکلوں، پہلے ہی قبولیت سے انکار کر دوں۔اس پر جناب نواب صاحب نے کچھ وظیفہ مقرر فرما دیا اور اصرار نہ فرمایا اور بہت عزت سے ریاست سے مرخص [رخصت] کیا۔علامہ مرحوم و مغفور خود ایک دفعہ سفیر صاحب افغانستان کی مجلس میں حکیم نابینا صاحب مرحوم مقیم دہلی کی حذاقت و مہارت کا ذکر کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ میں دردِ گردہ کا پرانا مریض تھا چنانچہ اس درد سے میں اکثر بے تاب اور نیم جان ہو جایا کرتا تھا اور جب میرے مرض نے سخت اشتداد[بہت شدت] کی صورت اختیار کر لی تو میں کوشش کر رہا تھا کہ کچھ رقم جمع کر کے آسٹریا جا کر آپریشن [عملِ جراحی] کراؤں تاکہ اس مرض نابکار سے چھٹکارا حاصل ہو۔اسی اثنا میں میری عسرت اور شدت مرض کی اطلاع جناب حکیم نابینا صاحب مرحوم تک پہنچ گئی جس پر حکیم صاحب نے مجھے تار کے ذریعہ اطلاع دی کہ آسٹریا جانے سے قبل علاج کے سلسلہ میں پہلے اُن سے مل لوں۔چنانچہ ڈاکٹر صاحب دہلی روانہ ہوئے اور سفر کے دوران میں ہی مرض کا دورہ آ پڑا اور اسٹیشن دہلی سے سٹریچر پر ڈال کر اقبال کو حکیم نابینا کے مسکن پر قریب جامع مسجد دہلی پہنچایا گیا۔حکیم صاحب نے سب کوائف سن کر ایک دوا عطا کی اور کہا کہ چند گھنٹے کے بعد آپ کو پیشاب بالکل سیاہ رنگت کا آئے گا۔اس کی سیاہ رنگت سے گھبرانا نہیں۔ شدید درد کے بند کرنے کے لئے بھی دوا تجویز کی گئی جس سے درد کا اشتداد جاتا رہا اور نیند آ جانے سے بے حد تسکین و راحت حاصل ہوئی۔ٹھیک وقت مقررہ پر ڈاکٹر صاحب کو پیشاب کی حاجت ہوئی اور فی الواقعہ پیشاب نہایت سیاہ رنگ کا تھا لیکن جوں جوں پیشاب خارج ہوتا گیا، ڈاکٹر صاحب کی جان میں جان آتی گئی۔آخرش حکیم صاحب نے گفتگو کے دوران خود ہی

فرمایا کہ سنگ مثانہ اور گردہ کی پتھری دوا سے تحلیل ہو کر پیشاب کے ذریعہ کاملاً خارج ہو جائے گی اور پھر کبھی ایسا درد یا دورہ نہیں پڑے گا۔ چنانچہ اقبال نے فرمایا کہ مجھے بالکل آرام ہو گیا اور وہ دن اور آج کا دن ہے مجھے معلوم ہی نہیں کہ آیا مجھے دردِ گردہ کی شکایت کبھی تھی بھی یا نہیں اور حکیم صاحب کی توجہ و عنایت سے میرے سفر اور آسٹریا میں آپریشن کے جملہ مصارف اور زحمات بچ گئیں اور ہمیشہ بعد ازاں میں حکیم نابینا صاحب کی طبّی قابلیت اور حذاقت کا قائل رہا۔ وہ لوگ جو ہر شعبہ میں یورپی تفرق کے دلدادہ ہیں اور یونانی طب سے اعراض اور احتقار[بے اعتنائی اور حقارت کا سلوک] کا برتاؤ کرتے ہیں ڈاکٹر صاحب ان کو یونانی طبّی اعجاز کا درس دیا کرتے تھے۔ایک مجلس میں کسی شخص نے چند طبّی لطائف بیان کئے اور کہا کہ پشاور میں ایک حکیم عبداللہ نامی رہتے تھے۔ان کے متعلق مشہور تھا کہ جب وہ قبرستان میں سے گذرتے تو منہ پر کپڑا ڈال لیتے تھے۔کسی نے اس کا سبب دریافت کیا تو جواب ملا کہ چونکہ یہ سب مردے میرے علاج کے شرمندۂ احسان ہیں لہٰذا مجھے ان سے شرم آتی ہے اور میں منہ ڈھانک لیتا ہوں کہ ان کو کیا منہ دکھاؤں۔اس شخص نے اسی حکیم عبداللہ کے متعلق ذیل کے چند اشعار بھی ڈاکٹر صاحب کو سنائے اور کہا:

ملک الموت رفت پیش خدا
گفت اے لا یزال بے ہمتا
در پشاور حکیم عبداللہ
من یکے می کشم و اُو صدتا
یا مرا ازیں کار معطل کن

یا اُو را خدمت دگر فرما[5]

اس پر ڈاکٹر صاحب خوب ہنسے اور فرمایا کہ کوئیکز[عطائیوں] سے اور کیا اُمید ہو سکتی ہے۔

جب سردار صلاح الدین سلجوقی سفیر افغانستان متعینہ دہلی کے ایما پر اقبال، سید سلیمان ندوی اور سر سید راس مسعود کا تعلیمی اور عرفانی وفد کابل گیا تو درحقیقت اصل مقصد یہ تھا کہ اعلیٰ حضرت غازی محمد نادر خان، سلجوقی صاحب کی مدح و ثنا اور تشویق کے باعث ڈاکٹر صاحب مرحوم سے ملنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس وفد سے تعلیمی مشاورت کا استفادہ کرنے کے نام سے علامہ اقبال کو کابل بلایا گیا۔ پہلے راقم الحروف کو وفد کے ساتھ بھیجنا تجویز ہوا پھر یہ دیکھتے ہوئے کہ میرے جانے سے سفارت خانہ کے کاروبار میں ہرج ہوگا میرے بھانجے مسٹر عبدالمجید کو جو ٹائپسٹ[ٹائپ کار] اور اسٹنٹ سکریٹری[معاون معتمد] تھے بحیثیت اتاشی وفد کے ساتھ بھیجا گیا۔ اس وفد کی کابل میں وہ آؤ بھگت ہوئی کہ اس کی نظیر افغانستان کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ چنانچہ اقبال نے ایک مجلس میں بزبان خود فرمایا کہ میں نے سوچا کہ اگر کوئی موٹر تحفتاً لے جاؤں تو اعلیٰ حضرت کے پاس بحیثیت ایک اولوالعزم

---

[5] ترجمہ:

موت کا فرشتہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوا
کہا کہ اے خدائے لازوال اور بے ہمتا
پشاور میں ایک حکیم عبداللہ ہے
میں ایک کی جان لیتا ہوں تو وہ سو آدمی مارتا ہے
یا تو مجھے اس کام سے چھٹی دیجیے
یا اس کے ذمے کوئی اور کام لگایئے

مترجم: محمد سہیل عمر

پادشاہ ہونے کے ہر ساخت کی اعلیٰ سے اعلیٰ موٹریں موجود ہوں گی۔ علیٰ ہذا القیاس قلم تحریر یا اور تحائف کے متعلق بھی یہی خیال کیا۔ ہو نہ ہو کوئی ایسا تحفہ لے جاؤں جو اپنی مثال میں بے نظیر اور رفیع المرتبت ہو۔ چنانچہ اسی غرض کے لئے ایک تاریخی مطلا اور مذہب حمائل شریف قرآن تجویز کی گئی اور جب ڈاکٹر صاحب حضورِ شاہانہ میں پیش ہوئے تو اعلیٰ حضرت محمد نادر خاں شہید کی آنکھوں میں وفورِ اخلاص سے معانقہ کے وقت آنسو ڈبڈبا آئے اور اعلیٰ حضرت فرمانے لگے کہ الحمد للہ میں اس روز کو یوم السعید سمجھتا ہوں کہ میری دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی نہایت اخلاص بھرے الفاظ میں اظہارِ عقیدت فرمایا جس کے معانی اس کے لگ بھگ تھے:

بیا بیا کہ بداماں نادر آویزیم
کہ مرد نیک نہاد است و پاک طینت است
فقیرے در لباس خود امیرے
امیرے درد مندے دل پزیرے[6]

معانقہ اور ملاقات شاہ افغانستان اور شاہ سخنستان کا سماں ایسا دلچسپ تھا کہ دائرہ تحریر میں نہیں سما سکتا۔ بہرحال جب سلام و پیام کا دور ختم ہوا تو اقبال نے فرمایا کہ اعلیٰ حضرت میں نے کوئی ہدیہ اور تحفہ حضورِ شاہانہ میں

---

[6] ترجمہ:

آ کہ دامن نادر سے وابستہ ہو جائیں
کہ نیک سرشت اور پاک باز آدمی ہے
امیرانہ لباس میں درویش ہے
ایسا امیر جو دردمند بھی ہے اور اس کی طرف دل کھنچتا ہے

مترجم: محمد سہیل عمر

تقدیم [خدمت شاہی میں پیش] کرنے کے لئے بہت تفکر و تدبر سے کام لیا لیکن دنیا کی ہر چیز مجھے حقیر نظر آئی۔ ان کی بابت میں نے خیال کیا کہ بحیثیت ایک جلیل القدر تاجدار نامدار افغانستان ہونے کے آپ کو وہ سب اشیاء و نعمائے الٰہی بدرجہ اتم و اعظم حاصل ہیں لٰہذا میں یہ حمائل مبارکہ اعلیٰ حضرت کی خدمت میں تقدیم کرتا ہوں جس کے کلام الملوک، ملوک الکلام [شاہوں کا کلام، کلام کا شہنشاہ] ہونے میں کوئی ریب و شک نہیں۔

اس پر محمد نادر خان شہید نے تعظیماً سر و قد کھڑے ہو کر حمائل مبارکہ کو بوسہ دے کر دونوں ہاتھوں سے سر و چشم پر رکھا اور فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب معظم آپ نے یہ ہدیہ مبارکہ عطا کر کے مجھے دونوں جہاں کی بادشاہی بخش دی ہے۔ اس عطیہ بزرگانہ کے تشکر کے لئے میرے پاس کافی الفاظ نہیں، اب دعا فرمایئے کہ اللہ مجھے اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ چنانچہ یہ مجلس نہایت تزک و احتشام سے ختم ہوئی اور ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے کہ مجھے اس مجلس کے محبت آمیز و ولولہ انگیز تاثرات مادام الحیات [مرتے دم تک] فراموش نہیں ہوں گے۔

افغانستان میں حکومت کی طرف سے اس وفد کی تعظیم و تکریم اور ابراز [ظاہری] اعزاز و اکرام میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا گیا۔ چنانچہ اقبال نے ایک مجلس میں کوہ پغمان کا ذکر ان ڈرامائی الفاظ میں فرمایا: کہ جب ہماری موٹر پغمان کے دائرہ میں پہنچی تو مظاہر و مناظر قدرت کا وہ بے نظیر اور دلفریب سماں دیکھا کہ خود بخود خیال ہوتا تھا کہ آنچہ می بینم بہ بیداریست یا رب یا بہ خواب [یا رب، یہ جو دیکھ رہا ہوں یہ بیداری میں ہے یا خواب دیکھتا ہوں!] پغمان کی نہایت وسیع آئینہ نما و دلکشا سڑک بلور کی طرح شفاف و درخشاں جس میں سے انسان کا چہرہ نظر آتا تھا یورپ کی خوبصورتی کو مات کرتی ہے تھی۔ سڑک کے دو رویہ چنار کے درجہ و ترتیب وار سر سبز درخت

پہلے چھوٹے پھر اس سے بڑے پھر اس سے بڑے یہاں تک کہ اخیر میں ان کے سر فلک شگاف معلوم ہوتے تھے اور وہ دیدہ افروز نظارہ پیش کرتے تھے کہ جس کا تذکرہ دائرہ بیان میں نہیں آ سکتا۔ سڑک کے چو طرفہ ساتھ ساتھ خیابان تھے جن میں سرخ بجری بچھی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھی کہ گویا یاقوت سائیدہ گسترده شد یعنی یاقوت کو پیس کر بچھا دیا گیا ہے اور آفتاب کی کرنوں سے بجلی کی طرح بجری کے ذرے چمکتے تھے اور ان خیابانوں سے پرے سبز گھاس کے وسیع چمن ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے سبز و شاداب مخملی قالین بچھائے ہوئے ہیں۔ ان چمنوں میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر مدور طبقات گل [مٹی کے گول تختے] تھے اور ان میں ایسے بوقلمون [متنوع] قسم کے خوش رنگ پھول تھے کہ جن کی نظر فریبی کی وجہ سے آنکھیں وہاں سے ہرگز ہٹنا نہیں چاہتی تھیں لیکن جب دوسرے طبقۂ گل کی طرف نظر دوڑتی تھی تو ان پھولوں کی خوبصورت اور رعنائی کی وجہ سے پہلے پھولوں کی جاذبیت بھول جاتی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ ہمیشہ ہی دیکھتا رہے غرضیکہ ہر طرف ایسا خوشگوار منظر تھا کہ قدرت الٰہی کا جلوہ نظر آ کر یہی شعر یاد آتا تھا:

سبحان من تحیر فی صنعہ العقول
سبحان من بقدرتہ تعجب الفحول[7]

چمنستانوں کے پرے دو طرفہ نہر جاری ہے جس کے دونوں کناروں پر ثمر ور درخت سایہ فگن ہیں اور جَنّٰتٍ تَجری مِن تَحتِهَا الأَنهٰرُ [باغ ہیں، جن کے

---

[7] ترجمہ:

تعریف اس کی جس کی صنعت تخلیق سے عقل دنگ
تعریف اس کی جس کی قدرت سے فہم حیران

مترجم: محمد سہیل عمر

نیچے نہریں رواں] (القرآن، البقرۃ: آیت ۲۵) کا عملی نمونہ اور جلوہ پیش کرتی ہیں۔ نہر سے پرے سفید سفید انڈا نما کوٹھیاں اور کوٹھیوں میں کہیں کہیں خوبصورت افغانی عورتوں کی جو نہایت عمدہ لباس میں ملبوس نظر آتیں یا ان کی جھلک پڑتی تو حورٌ مَقصوراتٌ فِی الخِیامِ [حوریں ہیں خیموں میں پردہ نشین] (القرآن، الرحمٰن: آیت ۷۲) کا نقشہ سامنے ہوتا تھا۔ ہر جانب یہ فردوس کا سماں یہی خیال اور تصور پیدا کرتا تھا کہ انسان عالم فانی سے عالم جاودانی میں پہنچ گیا ہے۔ آگے جا کر پہاڑ سے آبشار گرتی ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ پگھلی ہوئی چاندی کا دھارا پہاڑ سے گر کر ایک ترانہ گا رہا ہے۔ اس نقرہ نما پانی کے گرنے سے نہایت سرد نسیم پیدا ہوتی ہے اور وہ نسیم خوش آئند دماغ میں داخل ہو کر دماغ کے ہر خلیہ میں تلاش کرتی ہے کہ اگر کوئی بیماری ہو تو اسے پھینک کر نکال دے۔ ایسی آب و ہوا کی موجودگی کسی بیمار کو نزدیک نہیں آنے دیتی۔

المختصر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ میں نے نیاپز، وینس، بوادی بولو، جنیوا ایسے مقاماتِ تفریحی دیکھے ہیں۔ لیکن ان کو پغمان کے سے پُر فضا، خوش ہوا، کثیر المناظر تفریحی مقام سے کوئی نسبت ہی نہیں معلوم ہوتی۔ گویا کہ یہ قطعہ قطعۃ من الجنتہ [جنت کا ٹکڑا] ہے۔ جب سب مناظر دیکھنے کے بعد ایک چمن سبزہ زار میں واپس آئے تو میں حکومت افغانیہ کی خوش سلیقگی سے حیران ہو گیا۔ چمن بھی سبز اور اس پر سبز مخملی گداز قالین پھر سارا فرنیچر بھی سبز رنگ حتیٰ کہ سامان چائے، چینک، پیالیاں وغیرہ بھی سراسر سبز۔ اس پر خدمت گاروں کے سبز لباس عجیب نضارت [دلکش نعمت] ویکسانی و شادمانی کا سماں پیش کر رہے تھے۔ جب ایسے پُر فضا خوشگوار اور یک رنگی خوشنما کے ماحول میں ہم کرسیوں اور کوچوں پر بیٹھ گئے اور چائے نوشی کی مجلس شروع ہوئی تو پاس

ہی سنگین فوارے بھی سبز پتھر کے بنے ہوئے کھول دیئے گئے۔ چونکہ ہوا سرد تھی جناب اقبال کو سردی محسوس ہوئی تو آپ نے فرمایا:

ہوا سرد است، فوارہ را بستہ کنید دریں خنکی از فوارہ چہ مقصد است یعنی ہوا ٹھنڈی ہے فوارے بند کرو۔ فواروں سے اس سردی میں کیا مقصد ہے؟ یہ جملہ سن کر جناب سردار فیض محمد خاں جو اس وقت حکومت افغانیہ کے وزیر معارف اور وفد کے مہماندار شاہی مقرر تھے، فی البدیہہ شعر کہنے لگے کہ اس فوارہ سے یہ مقصد ہے:

عقد مروارید می سازد نثار مقدمت
ورنہ از فوارہ مقصود دگر کے دارد آب[8]

یعنی فوارہ موتیوں کی لڑیاں پرو پرو کر اپنے مہمانانِ عزیز کے سر پر نچھاور کر رہا ہے۔ نہیں تو پانی کا فوارے سے اور کیا مقصد ہے؟ دکتور مرحوم یہ فی البدیہہ شعر سن کر عش عش کر کے پھڑک گئے اور ہر طرف سے تحسین آفرین کے آوازے بلند ہوئے لیکن ڈاکٹر صاحب کب نچلے بیٹھنے والے تھے۔ وہ بھی سردار فیض محمد خان صاحب کا شعر پڑھ کر فوراً فرمانے لگے:

مہربانی ہا کہ بر من کردۂ سازد نثار
ورنہ از فوارہ مقصود دگر ہم دارد آب[9]

---

[8] ترجمہ:

آپ کی آمد پر موتیوں لی لڑی قدموں میں نثار
ورنہ فوارہ بننے سے پانی کا مقصود اور کیا ہے

مترجم: محمد سہیل عمر

[9] ترجمہ:

مجھ پر جو مہربانی کی وہ آپ کے شایان شان تھی
ورنہ فوارے سے پانی کا دوسرا مقصد بھی ہے

مترجم: محمد سہیل عمر

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ جب سے میں وارِدِ افغانستان ہوا ہوں اور آپ نے جو بے شمار مہربانیوں کی بوچھاڑ مجھ پر کی ہے، پانی کے قطرے تسبیح کے دانے بن کر انھیں شمار کر رہے ہیں ورنہ اس کے سوا بھی پانی کے فوارے سے بہت سے مقاصد ہو سکتے ہیں۔اس طرح علمی مذاکرات میں رشک آفرین مجلس ختم ہوئی۔

کوئی نہیں جانتا کہ اقبال نہایت ظریف الطبع بزرگ تھے۔ میرے بھانجے عبدالمجید اتاشی سے بہت مہربانی کرتے اور اکثر مذاق کر لیتے تھے۔ میرے بھانجے نے کہا کہ دکتور صاحب کیا اچھا ہو کہ آپ بھی جیسا کہ لوگ انگلستان سے یادگار کے طور پر بیویاں لے آتے ہیں افغانستان کا تحفہ ایک افغانی خاتون سے شادی کر کے لے جائیں۔اس پر اقبال کو بہت دلچسپی ہوئی تو متبسم ہو کر عبدالمجید سے کہنے لگے: مجید صاحب کیا کوئی افغانی خاتون مجھ سے شادی کرنا پسند کرے گی؟ تو مجید صاحب نے کہا کہ واہ صاحب آپ پادشاہِ سخن اور مشاہیر زمانہ یکتائے روزگار کے سامنے سینکڑوں اکابرین افغانستان اپنی صبیات [بیٹیاں] پیش کر دیں گے۔ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے کہ مجید صاحب یہ آپ کی خوش فہمی ہے۔ مجید نے کہا کہ صاحب اگر آپ کا حکم ہو تو میں اس بارے میں کوئی ذکر اور سر رشتہ کروں۔ تو ڈاکٹر صاحب ہنس کر فرمانے لگے مجید صاحب آپ تو پندرہ برس سے سفارت خانہ میں ترجمانی کا کام کر رہے ہیں، آپ کو تو معلوم ہوگا کہ اگر میں نے افغانی خاتون سے شادی کر لی تو وہ مجھ سے کیسا برتاؤ کرے گی۔ اس پر مجید صاحب نے کہا کہ برتاؤ اچھا ہی کرے گی، ہاں سویرے منہ نہار آپ کو جگا کر حکم کیا کرے گی: او ڈاکٹر او ڈاکٹر بر خیز برائے من چائے تیار کن۔ یعنی او ڈاکٹر اُٹھ فوراً میرے لئے چائے تیار کر۔ اس پر ڈاکٹر صاحب بہت دلچسپی سے ہنسے اور کہا کہ مجید

صاحب کیا وہ سچ مچ مجھ سے یہ کہے گی کہ اُٹھ چائے تیار کر لے۔ مجید صاحب نے کہا کہ واللہ وہ ضرور یہ کہے گی اور اگر اس کو ایک وقت بھی چائے نہ ملی تو وہ آپ کی وہ گت بنائے گی کہ آپ کو نانی یاد آ جائے گی۔

ڈاکٹر صاحب ہنس کر فرمانے لگے کہ مجید صاحب کیا یہ سچ ہے؟ تو مجید صاحب خوش مزاجی سے کہتے تھے کہ واللہ ایں درست است۔ بخدا یہ سچ ہے۔ بلکہ کوئی کوئی خاتون تو یہ کہنے سے بھی نہ جھجکے گی کہ او ڈاکٹر اور ڈاکٹر برخیز چائے دم کن۔ کہ او ڈاکٹر! اُٹھ چائے تیار کر۔ اور آپ سے سستی دکھائی تو برملا کہہ دے گی کہ اُوے خدا زدہ ڈاکٹر خیلے تنبل آدم ہستی۔ او خدا کی مار ڈاکٹر تو بڑا سست آدمی ہے۔ تو اس پر ڈاکٹر صاحب دل بھر کر ہنسے اور جب کبھی تفریح کو دل چاہتا تو مجید صاحب سے ڈاکٹر صاحب فرماتے کہ خوب مجید صاحب وہ خاتون افغان اور کیا کہے گی تو مجید صاحب کہہ دیتے کہ واللہ بسا اوقات وہ خاتون افغانی ناراضگی کے وقت آپکی تواضع بھی کر دے گی۔

۸

علامہ اقبال سے میری ملاقات*

خلیفہ عبدالحکیم[1]

* سہ ماہی، اقبالیات اردو، جلد ۶، شمار ۴، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، جنوری۱۹۶۶ء۔

[1] خلیفہ عبدالحکیم کی علامہ اقبال کے بارے میں دیگر تخلیقات کے لیے دیکھئے:

خلیفہ عبدالحکیم، ''مقدمہ'' اور ''فلسفۂ خیر و شر''، مشمولہ، یونس جاوید، مرتبہ، منشوراتِ اقبال، لاہور، بزم اقبال ؛ ـــــ، ''مقدمہ''، ایس اے رحمان، ترجمانِ اسرار [اسرارِ خودی کا منظوم ترجمہ]، لاہور، کارواں بک ڈپو، ۱۹۵۲ء؛ ـــــ، اقبال اور ملا، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۵۲ء؛ ـــــ، ''علامہ محمد اقبال'' اور ''رومی اور اقبال''، مشمولہ، نورجہاں بیگم، شاعر اقبال کو جتنا پہچانا، ڈھاکا، ۱۹۶۲ء؛ ـــــ، ''رومی، نطشے اور اقبال''، مشمولہ، اے جی نیازی، مرتبہ، اقبال کا تنقیدی مطالعہ، لاہور، عشرت پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۵ء ؛ ـــــ، ''رومی، نطشے اور اقبال''، ''شاعر انقلاب''، ''جمہوریت''، ''ابلیس''، ''علم اور روحانی حال و وجدان [خطبات کے پہلے خطبے کا خلاصہ]''، مشمولہ سید اصغر علی شاہ جعفری، مرتبہ، اقبالِ با کمال، لاہور، تاج بک ڈپو، ۱۹۶۶ء؛ ـــــ، ''اقبال اور اشتراکیت''، مشمولہ، محمد حنیف رامے، مرتبہ، اقبال اور سوشلزم، لاہور، البیان، ۱۹۷۰ء؛ ـــــ، ''اقبال سے میری پہلی ملاقات''، مشمولہ، مصباح الحق صدیقی، مرتبہ، علامہ اقبال' اپنوں کی نظر میں، یونیورسل بکس، ۱۹۷۷ء؛ ـــــ، ''بیرسٹر اقبال''، ایم ایس ناز، مرتبہ، اقبال کے ہم صفیر، لاہور، شیخ غلام علی، ۱۹۷۷ء؛ ـــــ، ''اقبال، حالات اور شاعری''، مشمولہ، سلیم اختر، مرتبہ، اقبالیات کے نقوش، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۷ء ؛ ـــــ، ''اقبال اور رومی''، مشمولہ، طاہر تونسوی، مرتبہ، اقبال اور مشاہیر. لاہور، سنگ میل، ۱۹۷۸ء ؛ ـــــ، ''مولانا روم اور اقبال''، مشمولہ، بہار اللہ آبادی، مرتبہ، اوصافِ اقبال، دہلی ، چمن بک ڈپو، ۱۹۸۱ء؛ ـــــ، ''اقبال کا تصورِ الہٰ''، تفسیرِ اقبال، سری نگر، گلشن پبلشرز، ۱۹۸۲ء؛ ـــــ، ''رومی اور اقبال کا تصورِ محبت''، مشمولہ، مشرف احمد، مرتبہ، اقبال شناسی، کراچی، نفیس اکیڈیمی، ۱۹۸۶ء؛ ـــــ، ''تصورِ عشق''، مشمولہ، اسعد گیلانی، مرتبہ، تصوراتِ اقبال، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۹۱ء؛ ـــــ، ''اقبال اور افلاطونی فلسفہ''، مشمولہ، سعید بدر، مرتبہ، اقبال شناسی اور ہمایوں، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۹۳ء؛ ـــــ، ''رومی اور اقبال''، مشمولہ، رفیع الدین ہاشمی + محمد سہیل عمر + ڈاکٹر وحید عشرت، اقبالیات کے سو سال، اسلام آباد۔ اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۲ء؛ ـــــ، ''مولانا

میں لاہور کے ایک مدرسے میں ابھی ابجد خوان[الف بے سیکھنے والا] تھا کہ اقبال کا نام کانوں میں پڑنے لگا۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں دور دور سے واعظ اور شاعر، خطیب اور لیڈر جمع ہوتے تھے۔ مولانا نذیر احمد جیسے ادیب اور خطیب اور مولانا حالی جیسے شاعر وہاں قوم کو رُلاتے، شرماتے اور گرماتے تھے۔ اقبال اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر تھے۔ وہ اس وقت نوجوان ہوں گے لیکن ہم اپنی کم عمری کی وجہ سے پچیس برس کے شخص کو بھی بزرگ سمجھتے تھے۔ اقبال وہاں بڑی بڑی طویل دس دس بارہ بارہ بندوں کی نظمیں ایک خاص لَے میں پڑھتے تھے جو بڑی پُر سوز اور درد انگیز ہوتی تھیں۔ اقبال کی شاعری کا سکہ سب سے پہلے یہیں پر بیٹھا اور چند سال میں سب کو محسوس ہونے لگا کہ ایک نیا ستارہ شاعری کے اُفق پر اُبھرا ہے جس کے اندر یہ ممکنات معلوم ہوتے ہیں کہ وہ آگے چل کر مہتاب و آفتاب بن جائے۔ اسی زمانہ میں اور غالباً حمایت اسلام کے ایک جلسے

روم اور اقبال''، ''رومی اور اقبال کا تصورِ محبت'' اور ''رومی، نطشے اور اقبال''، مشمولہ، محمد اکرام چغتائی، مرتبہ، پیر رومی و مرید ہندی، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء؛ ____، ''افکار اقبال''، مشمولہ، شگفتہ زکریا، فکر و فن اقبال، سنگت پبلشرز، ۲۰۰۴ء۔

خلیفہ عبدالحکیم اور علامہ اقبال کے باہمی روابط کے بارے میں دیکھئے:
''مختصر سوانح''، خلیفہ عبدالحکیم، فکرِ اقبال، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۵۷ء؛ شاہد حسین رزاقی، مرتبہ، مقالاتِ حکیم، جلد دوم، اقبالیات، لاہور، ثقافت اسلامیہ، ۱۹۶۹ء؛ وحید عشرت، علامہ اقبال اور خلیفہ عبدالحکیم کی نظر میں مسلم دنیا کی باز آفرینی کا مسئلہ، لاہور، پاکستان فلسفہ اکادمی، ۱۹۷۷ء؛ ''خلیفہ عبدالحکیم کا تذکرہ''، ڈورس احمد، اقبال ایز آئی نیو ہم [اقبال: جیسا میں نے انھیں جانا]، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۶ء؛ ''علامہ اقبال، خلیفہ عبدالحکیم اور کشمیر''، کلیم اختر، اقبال اور مشاہیر کشمیر، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۷ء؛ شاہد حسین رزاقی، مرتبہ اقبالیاتِ خلیفہ عبدالحکیم، لاہور، شیخ غلام علی، ۱۹۹۸ء؛ ''اقبال اور خلیفہ عبدالحکیم''، مرتبہ تسکینہ فاضل، مرتبہ اقبال اور ان کے معاصر شعرا اور ادبا، سری نگر، فاضل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء؛ ''ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی تصنیف فکرِ اقبال کا ایک جائزہ''، نگینہ فاضل، اقبال اور مطالعاتِ اقبال، سری نگر، فاضل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء۔

ہی میں علامہ شبلی نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ جب حالی اور آزاد کی کرسیاں خالی ہوں گی تو لوگ اقبال کو ڈھونڈیں گے۔ اس زمانے میں ان سے میری ذاتی ملاقات بعید از قیاس بات تھی۔ ولایت جانے سے قبل اور واپسی کے کئی سال بعد تک اقبال انجمن حمایت اسلام میں نظمیں سناتے رہے۔ میں نے پورا 'شکوہ' اور 'شمع و شاعر' انھیں جلسوں میں ان کی زبان فیض ترجمان سے سنا ہے۔ 'شمع و شاعر' انھوں نے اپنی پُر سوز لَے میں پڑھی اور 'شکوہ' بغیر لَے کے بڑے پُر جوش اور موثر انداز میں۔ لوگ ان کی لَے کے دلدادہ تھے، شور مچانا شروع کیا کہ لَے سے پڑھیئے۔ انھوں نے کہا کہ لَے سے پڑھنے کی نظم نہیں ہے۔ اس پر ایک بد ذوق وکیل بولے کہ اگر لَے سے پڑھیں تو میں ایک کثیر رقم انجمن کو چندے میں دوں گا۔ اس پر اقبال کو غصہ آ گیا اور اس شخص کو ڈانٹ دیا کہ تم کو نہیں معلوم کس قسم کے اشعار لَے سے پڑھنے چاہئیں اور کس قسم کے سادہ اور موثر طریقے سے، موسیقی ہر کلام کے لئے موزوں نہیں ہوتی۔ یہ دور گذر گیا۔ اقبال ولایت سے واپسی پر بیرسٹری کرتے تھے، شاعری کم کرتے تھے، لیکن لوگ ان کی شاعری کے گرویدہ ہو چکے تھے۔ کبھی کبھار ان کی کوئی نظم شائع ہوتی تھی تو ارباب شوق کو محسوس ہوتا تھا کہ ایک بڑی نعمت آسمان سے نازل ہوئی ہے۔ ابھی تک اقبال کو پوری طرح یہ احساس نہیں تھا کہ میں شاعری سے کیا عظیم الشان کام لے سکتا ہوں اور شاید کسی قدر اس خیال کا اثر باقی تھا جو انھوں نے یورپ کے قیام کے دوران میں اپنے رفیق عبدالقادر کے سامنے ظاہر کیا تھا کہ شاعری کے ذوق نے ہماری قوم میں سے جوش عمل کو زائل کر دیا ہے، اس لئے ارادہ ہے کہ شاعری ترک کر دوں۔

مُدیرِ مخزن سے کوئی اقبالؔ جا کے میرا پیام کَہ دے

جوکام کچھ کر رہی ہیں قومیں، اُنھیں مذاقِ سخن نہیں ہے

[کلیات اردو، ص 162]

اقبال کے بیرسٹر بننے کی کوشش میں ایک بڑا افسوس ناک حادثہ سمجھتا ہوں۔اس فن سے ان کو کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا لیکن انھوں نے یہ پیشہ دو وجوہ سے اختیار کیا تھا۔ایک تو پیٹ پالنے کے لئے اور دوسرے اس لئے کہ اس میں ملازمت کے مقابلے میں انسان زیادہ آزاد ہوتا ہے۔آزاد ان معنوں میں کہ وکیل حکومت کا ملازم نہیں ہوتا اور مقدمہ لینا یا نہ لینا بھی اپنے اختیار کی بات ہے۔ لیکن غم روزگار ہمارے ملک میں اہل کمال کو پوری طرح آزاد نہیں ہونے دیتا۔علامہ خود ہی فرماتے ہیں:

وہ چیز نام ہے جس کا جہاں میں آزادی
سنی ضرور ہے، دیکھی کہیں نہیں میں نے

[باقیات، ص222]

میں نے ایک روز عرض کیا: ڈاکٹر صاحب! یہ وکالت کا پیشہ دنیا داری کا نچوڑ ہے۔ حرص، ہوس، بغض، ظلم، جھوٹ، بہتان۔ عدالتوں کی فضا اس تمام شیطنت سے لبریز ہوتی ہے، اس میں انسانوں کے ادنیٰ ترین جذبات کی نفسا نفسی اور افراتفری ہوتی ہے، آپ جیسے جذبات اور افکار کے انسان کے لئے تو یہ پیشہ کسی طرح بھی موزوں نہیں ہو سکتا۔فرمانے لگے کہ نہیں اس میں سے ایک بڑا فائدہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کی ان خباثتوں کو عریاں دیکھ کر طبیعت میں بڑا رد عمل پیدا ہوتا ہے اور اس کثافت سے گھبرا کر روح بے تابی سے لطافت کی طرف گریز کرتی ہے۔ مجھے خیال ہوا کہ علامہ محض طبیعت کی تسکین کے لئے جواز نکال رہے ہیں۔ وہ دل و دماغ جو اعلیٰ ترین جذبات

اور افکار کی آفرینش کا اہل تھا وہ اس جھگڑے میں الجھا رہتا تھا کہ زید اور عمرو دو حریصوں میں سے ایک حریص کو حق بجانب ثابت کیا جائے، جن کے آپ وکیل ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ فضول اور بے بنیاد مقدمے نہیں لیتے تھے۔ان کو روپے کی ضرورت ضرور تھی لیکن اس کی بے جا ہوس نہیں تھی۔ چنانچہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک موکل اصرار کر رہا ہے کہ آپ میرا مقدمہ لے لیں اور معقول نقد معاوضۂ محنت بھی پیش کر رہا ہے لیکن وہ اس کو سمجھائے جاتے ہیں کہ دیکھو بھائی تمہارے مقدمہ میں کچھ جان نہیں ہے، خواہ مخواہ اپنا روپیہ ضائع مت کرو۔اور موکل مصر ہے کہ آپ سے کیا، جیتنا ہارنا میری قسمت کا معاملہ ہے، آپ اُجرت لیجئے اور میری طرف سے پیش ہو جایئے۔ لیکن اقبال کو وہ آمادہ نہ کر سکا اور ناراض ہو کر واپس ہو گیا۔

ان کی اس وکالت کی زندگی کا ایک واقعہ مجھے یاد آ گیا جو ایک سبق آموز لطیفہ ہے۔ایک مولوی صاحب ان کے پاس آیا جایا کرتے تھے اور کچھ دینیات اور فقہ کے مسائل پر گفتگو کرتے تھے اور کچھ اپنے ورثۂ پدری کے جھگڑے کے متعلق۔ وہ اپنے والد مرحوم کے ترکے سے اپنی بہن کو حصۂ شرعی دینا نہیں چاہتے تھے اور انگریزی قانون کا سہارا ڈھونڈتے تھے۔ پنجاب میں دینداری کے بڑے بڑے مدعی صوم و صلوٰۃ کے پابند لوگ ورثے کے معاملے میں عدالت میں علی الاعلان کھڑے ہو کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہماری برادری یا ہمارے علاقے میں ورثہ شرع محمدی [ﷺ] کے مطابق تقسیم نہیں ہوتا بلکہ رواج کے مطابق ہوتا ہے اور رواج لڑکیوں کو ورثے میں حصہ نہیں دلاتا۔ اس بارے میں شہادتیں پیش کی جاتی ہیں اور عدالت رواج کے ثابت ہونے پر رواج کے مطابق فیصلہ کرتی ہے۔ یہ مولوی صاحب اقبال کو ہمیشہ طعنہ دیتے تھے کہ تم اس قدر علم دین رکھنے کے باوجود اور اسلام اور اس کے

نبی[ﷺ] سے اس قدر عشق کا دعویٰ کرنے پر بھی داڑھی کیوں نہیں رکھتے۔ آخر ایک روز تنگ آ کر اقبال نے کہا کہ دیکھئے مولوی صاحب علم اور ایمان کے باوجود ہر شخص کے عمل میں کچھ نہ کچھ کمزوری ہوتی ہے۔آپ کی کمزوری اور خلاف شرع حرکت یہ ہے کہ آپ بہن کو حصہ نہیں دیتے اور میری کوتاہی یہ ہے کہ میں داڑھی منڈاتا ہوں۔ لایئے ہاتھ بڑھایئے، اس وقت ایک معاہدہ ہو جائے جس سے آپ اور میری کمزوریاں بیک وقت رفع ہو جائیں۔ آپ بہن کو ورثے میں حصہ دے دیجئے اور میں داڑھی بڑھائے لیتا ہوں۔ لیکن مولوی صاحب کو ہمت نہ ہوئی...

اقبال وکالت میں کچھ زیادہ وقت صرف نہیں کرتے تھے۔اس کو محض پیٹ پالنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ صرف ہائی کورٹ میں اپیل[مرافعہ] کے مقدمے لیتے تھے جن میں درد سری کم ہوتی ہے اور علم و عقل اور نقطہ بینی سے زیادہ کام لینا پڑتا ہے۔ مقدمے بھی بہت چن کر تھوڑی تعداد میں لیتے تھے۔اس وجہ سے میرا خیال ہے کہ ان کی وکالت کی آمدنی کبھی ایک ہزار ماہوار سے زیادہ نہ ہوتی۔ وہ طبعاً شاعر اور عالم اور علم دوست شخص تھے، لیکن میں نے ایک بات ان کی زندگی میں ایسی دیکھی جو مشاہیر میں سے شاید ہی کسی کی زندگی میں ملے۔ان کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا اور ہر شخص ان کے پاس ہر وقت بے تکلف چلا آتا تھا۔ ان کے گھر اور ان کی صحبت پر حافظ کا یہ شعر صادق آتا ہے:

ہر کہ خواہد گو بیار ہر کہ خواہد گو برو
گیر و دار و حاجب و دربان دریں درگاہ نیست[2]

---

[2] ترجمہ:

جو چاہے آئے، جو چاہے چلا جائے

شاعری کی وجہ سے وہ ہر دلعزیز بہت تھے۔ نہ صرف طالب علموں اور علم دوست لوگوں کو ان سے ملنے کی آرزو رہتی تھی بلکہ ایسے لوگوں کو بھی جو ان کو بڑا شاعر اور صاحب کمال سمجھ کر ان سے ملاقات کو ایک نعمت سمجھتے۔ ان کے پاس مختلف امتحانوں کے پرچے آتے تھے۔ سال کے بعض مہینوں میں جب بھی میں ان سے ملا تو دیکھا کہ مہمل جوابات کی ورق گردانی ہو رہی ہے۔ مجھے ان کے اس مشغلے پر اس وقت افسوس نہیں ہوتا تھا جتنا اب ہوتا ہے کہ غم روزگار اور زندگی کی مجبوریوں نے اس یگانۂ عصر کے قیمتی اوقات اور قوتوں کو کن کاموں میں لگا رکھا تھا۔ اس جوہر ناشناس تمدن کو کیا کہیے جو ایک غیر معمولی صاحب کمال کو بھی معمولی سادہ زندگی بسر کرنے کے لئے غم روزگار سے بے نیاز نہ کر سکے۔ اسی وقت اور اسی محنت کو اگر وہ کسی علمی کام یا شاعری میں صرف کر سکتے تو لاتعداد انسان اس سے مستفید اور لطف اندوز ہوتے۔ اس زمانے میں ابھی اردو نثر و نظم لکھنے والے صاحب کمال ہونے پر بھی معقول معاوضہ حاصل نہ کر سکتے تھے۔

ایک مرتبہ اقبال نے مجھ سے فرمایا کہ اگر ہماری قوم میں اہل قلم اچھا روزگار پیدا کر کے اطمینان کی زندگی بسر کر سکتے تو میں اس کے سوا کوئی اور کام نہ کرتا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب اقبال ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے تو مشہور تھے لیکن ابھی تمام قوم کے دل و دماغ پر ان کا قبضہ نہیں ہوا تھا اور معقول قیمت پر اردو کتابیں خریدنے کا رواج نہیں تھا۔ مولانا شبلی جیسے مشہور مصنف بھی کوئی علمی کتاب پانچ سو سے زیادہ نہیں چھپواتے تھے۔ عرصے

اس درگاہ میں پکڑ دھکڑ، چوکیدار، دربان کچھ نہیں

مترجم: محمد سہیل عمر

سے احباب مصر تھے کہ اپنا مجموعۂ کلام چھپواؤ لیکن وہ سن کر ٹال دیتے تھے۔اس بارے میں یہاں تک ٹال مٹول ہوئی کہ حیدر آباد میں ایک صاحب نے اخباروں اور رسالوں سے ان کی تمام مطبوعہ نظمیں جمع کر کے، ان کی اجازت کے بغیر اور بغیر ان کو خبر کئے، ایک مجموعہ چھپوا کر فروخت کرنا شروع کر دیا جس سے وہ بہت برہم ہوئے۔کوئی اچھا شاعر اپنے مختلف زمانوں کا کلام جوں کا توں شائع کرنا نہیں چاہتا۔بعض نظموں کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ دنیا انھیں فراموش کر دے، بعض اشعار میں رد و بدل کرتا ہے، کہیں کچھ مٹاتا ہے، کہیں اضافہ کرتا ہے۔کچھ نہ پوچھئے کہ ان صاحب نے کیا غضب کیا اور اقبال کو ان پر کس قدر غصہ آیا۔

اقبال نے سب سے پہلے اسرارِ خودی کو اپنے صرفے سے طبع کرایا اور صرف پانچ سو نسخے چھپوائے۔ان میں بہت سے نسخے دوست احباب نے اچک لئے۔جن ملنے والوں کو وہ اس حکیمانہ شاعری کے سمجھنے اور لطف اٹھانے کا اہل سمجھتے تھے ان کو خود بھی ایک نسخہ تحفتاً عنایت فرما دیتے تھے۔میں اس زمانے میں ایم اے میں فلسفہ پڑھتا تھا اور جب کبھی موقع ملتا فیض صحبت کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا۔اپنے منشی طاہر دین کو بلایا اور کہا کہ ان کو ایک نسخہ دے دو لیکن ان سے قیمت نہ لینا۔فرمانے لگے کہ ہمارے زمانے کے امراء کی کتب بینی کا شوق ملاحظہ ہو، میرے ایک دوست نے اسرارِ خودی کا ایک نسخہ ایک بڑے دولت مند نواب صاحب کے پاس پہنچا دیا۔ نواب صاحب کے ایک بڑے بھائی بھی ہیں۔مجھے خبر ملی ہے کہ وہ دونوں نواب آپس میں اس ایک نسخے پر جھگڑ رہے ہیں کہ یہ کس کا ہے، میرا ہے یا تمہارا، لیکن اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ ایک روپیہ خرچ کر کے دوسرا نسخہ خرید لیں۔

اسی طرح ایک روز ناقدریٔ عالم کی شکایت کرنے لگے۔ میں نے اپنی عمر میں دو تین مرتبہ سے زیادہ کسی تعلی یا تفاخر کا فقرہ ان کی زبان سے نہیں سنا، اپنے آپ کو بڑا بنانا اور بتانا ان کی سیرت کا جزو نہیں تھا۔ کہنے لگے کہ دیکھو زمانے زمانے کا فرق ہے، فیضی کو اکبر مل گیا جس سے فیضی کے کمال نے بھی پرورش پائی اور شہرت دوام بھی حاصل کی۔ فیضی کے پاس کیا تھا جو میرے پاس نہیں ہے؟ لیکن زمانہ پلٹا کھا گیا ہے۔ اس زمانے میں ان کے دل میں یہ احساس پیدا ہو رہا تھا کہ میں اپنے افکار اور اپنی شاعری کی قوت سے قوم کے دل و دماغ میں انقلاب پیدا کر سکتا ہوں۔ یورپ میں کہی ہوئی دو نظموں میں یہ دو شعر اس احساس کے شاہد ہیں:

میں ظُلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفَس مرا شعلہ بار ہو گا
زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اُٹھے گا گفتگو کا
مری خموشی نہیں ہے، گویا مزار ہے حرفِ آرزو کا

[کلیات اردو، ص ۱۶۸، ۱۶۲]

اسی مضمون کے وہ اشعار بھی ہیں جن میں انھوں نے اپنے رفیق عبدالقادر کو مخاطب کیا ہے:

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں
شمع کی طرح جییں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

[کلیات اردو، ص 158]

اقبال کی گفتگو میں یہ خوبی تھی کہ ہر قسم کا شخص ان سے ملتا تھا اور وہ ہر شخص سے اس شخص کے مذاق کی بات کرتے تھے۔ وہ کافر کے کفر سے، ملحد کے الحاد سے، متقی کے تقویٰ سے اور گنہگار کی گنہگاری سے اور رند کی رندی سے براہِ راست واقف تھے اور ہر صنف سے جب وہ بات کرتے تھے تو ملنے والے کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ سنی سنائی باتیں کر رہا ہے اور ان کی اصلیت سے واقف نہیں، اس لئے ان کی گفتگو کبھی بے معنی اور پھیکی نہیں ہوتی تھی۔ اور ایک بڑی خوبی ان میں یہ تھی کہ ان میں تصنع کا نام و نشان نہیں تھا۔ ان کو یہ خواہش نہیں تھی کہ لوگ مجھے خواہ مخواہ متقی یا صوفی سمجھیں، تصوف کی باتیں صوفیائے کرام کی طرح کرتے تھے لیکن کبھی کسی کو ذلیل کرنے کے لئے اس کی ہنسی نہیں اڑاتے تھے۔ چونکہ وہ خود ظرافت پسند تھے اس لئے ان کے بے تکلف ہمنشیں بھی ان سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتے تھے۔ میرے سامنے کی بات ہے، لاہور کے ایک حکیم صاحب کبھی کبھی ان کے پاس آ بیٹھتے تھے۔ وہ ذرا رند مشرب تھے، ارباب نشاط کے کوٹھوں پر بھی نظر آتے تھے۔ اقبال نے ہنس کر پوچھا: "فرمایئے حکیم صاحب! آج کل اس طبقے میں کس کس کے ہاں آنا جانا ہے"۔ حکیم صاحب بولے "جی کہاں! اب تو بس یہیں آتا ہوں"

بعض اوقات علمی باتوں میں بھی ان کا اندازِ بیان ظریفانہ ہوتا تھا۔ ایک روز فرمانے لگے: دو چیزیں خاص انگریزوں کی ایجاد ہیں: ان میں ایک ہے پے انگ گیسٹ (یعنی وہ مہمان جس سے اپنے کھانے کی قیمت وصول کی جائے لیکن اس کے باوجود مہمان کہلائے)، اور دوسرے دیانت داری بہترین تدبر و مصلحت ہے۔ اور قومیں تو دیانت داری کو دین و ایمان اور اخلاق اور تزکیۂ نفس کے ساتھ وابستہ کرتی رہیں لیکن اس قوم نے اس کو بطور پالیسی کے

اختیار کرنے کی تلقین کی اسی طرح فرمایا کہ لوٹ، جبر، ظلم، ناجائز مطالبے، یہ سب کچھ پہلی جابرانہ اور بے آئین حکومتوں میں بھی تھا اور موجودہ آئینی حکومتوں میں بھی ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ اب حکومتیں یہ کرتی ہیں کہ جو کچھ کرنا ہو اسے پہلے لکھ لو اور اس کا نام رکھو ضابطہ اور قانون اور پھر جو جی چاہے کرو، بس اپنے ہر فعل میں کسی قانون اور ضابطہ کا حوالہ دے کر اس کو جائز بنا لو۔بس لکھ لینا اور بغیر لکھے کرنا: اصل فرق یہی ہے۔

اقبال کے ایک دوست [اغلباً سر شہاب الدین]بہت سیاہ فام تھے اور اقبال ان کی رنگت پر ہمیشہ طبع آزمائی کرتے رہتے تھے۔یہ صاحب نائٹ یعنی سر ہو گئے۔اقبال نے کہا: ''انگریزوں نے تم کو صحیح خطاب دیا ہے۔لیکن خطاب کیا ہے محض تمہاری حقیقت بیان کر دی ہے۔تم پہلے بھی نائٹ یعنی شب سیاہ ہی تھے''۔اسی طرح یہ صاحب ایک انگریزی ڈنر[عشائیہ] میں جس میں اقبال بھی تھے سیاہ سوٹ اور سیاہ موزے اور بوٹ پہنے ہوئے آئے۔جو رنگ جسم کا تھا وہی لباس کا۔اقبال نے بڑے تعجب سے ان کو دیکھ کر کہا کہ ارے تمہیں یہ کیا ہو گیا کہ تم برہنہ ہی اس دعوت میں چلے آئے۔میرا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص اقبال کے لطیفے اس کے ہم نشینوں سے پوچھ پوچھ کر جمع کر ے تو ظرافت کا ایک دلچسپ مجموعہ بن جائے۔

میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ ان کا گھر ہمیشہ ہر شخص کے لئے کھلا رہتا تھا۔بظاہر یہ تضیع اوقات معلوم ہوتی ہے، بعض لوگوں کے دل میں خیال پیدا ہوگا کہ یہ شخص مطالعہ کب کرتا تھا؟ بڑے بڑے مسائل کے متعلق سوچتا کب تھا اور ہر کس و ناکس کو کیوں اجازت عام تھی کہ جب تک چاہے اس کے پاس بیٹھ کر اس کا وقت ضائع کرے۔میں نے تو کبھی یہ سوال ان سے نہیں کیا۔شاید اس لئے کہ میں خود ان کا وقت ضائع کرنے

والوں میں تھا۔ بعض اور لوگوں نے ان سے کہا تو جواب دیا کہ میرا وقت ضائع نہیں ہوتا۔ رنگ رنگ کے لوگ میرے پاس آتے ہیں اور طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ بھی براہِ راست نوع انسان کے مطالعے کا ایک ذریعہ ہے۔ اصل مطالعہ انسانی فطرت کا مطالعہ ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی جو میں نے ان کی صحبت میں محسوس کی کہ خواہ کوئی شخص بھی ان کے پاس بیٹھا ہو اور کوئی بات بھی کر رہا ہو ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہے ہیں۔ سنانے والے کی بات بھی سن رہے ہیں اور خود سوچتے بھی جاتے ہیں۔ باتیں کرنے والے کو یہ وہم و گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ اس وقت کیا عجیب و غریب مضامین اقبال کے ذہن میں پیدا ہو رہے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اقبال جس محفل میں بھی ہوتے تھے وہ باہمہ اور بے ہمہ ہوتے تھے۔ سب کے ساتھ بھی ہیں اور سب سے الگ بھی۔ رقص و سرود کی محفل میں بیٹھے ہیں، سب لوگ گانے سے لطف اٹھا رہے ہیں اور اٹھکیلیاں کر رہے ہیں، اِدھر اُدھر کی چھیڑ چھاڑ ہو رہی ہے، لیکن یک بیک اقبال کی طرف جو دیکھا تو کمال رقت سے ان کی آنکھوں میں سے آنسو ٹپک رہے ہیں۔ مے و نغمہ جو دوسروں کے لئے نشہ اندوہ ربا تھا وہ اس شخص کو خدا جانے کس سوز و گداز کے عالم میں پہنچا دیتا تھا۔ اقبال کے بعض ہمنشین اس کے انداز طبیعت کو سمجھ گئے تھے۔ باتیں ہو رہی ہیں، انھوں نے دیکھا کہ اقبال خاموش ہے اور ایک خاص قسم کی کیفیت اس کے چہرے سے نمودار ہے۔ وہ سمجھ جاتے کہ اشعار نازل ہو رہے ہیں۔ چنانچہ وہ کچھ عرصے کے لئے اقبال کو اس کیفیت میں چھوڑ دیتے تھے۔ اس کے بعد ان کو معلوم ہوتا کہ مقدس لاجواب نظم ہم سے باتیں کرنے کے دوران میں ہی اس پر نازل ہوئی۔ اس سے آپ اندازہ کر لیجئے کہ اقبال کے لئے کوئی صحبت بھی

تضیع اوقات کا موجب نہیں بن سکتی تھی۔

ایسی طبیعت بھی خدا کی کیا بڑی نعمت ہے جس کو جلوت میں بھی خلوت حاصل ہو۔ یہ صوفیاء کے 'دست بکار و دل بیار' [ہاتھ کام میں مشغول، دل یادِ یار میں مصروف] والا معاملہ ہے۔ یہ لوگ انسانوں کے ساتھ اسی طرح رہتے ہیں جس طرح بطخ پانی میں۔ چاروں طرف سے پانی کے تھپیڑے پڑ رہے ہیں، لیکن پَر خشک کے خشک ہیں۔

۹

تحریک شبان المسلمین*

خواجہ عبدالوحید[1]

بیسویں صدی کے ربع اوّل میں اسلامیانِ ہند نے بڑی بڑی عظیم الشان تحریکیں چلائیں، جن کا تعلق براہِ راست برطانوی استعمار کے خلاف جدوجہد کرنے سے تھا۔ تحریک خلافت کے بعد مسلمانانِ ہند پر یاس و قنوطیت کا عالم چھا گیا۔ اس کے باوجود مختلف مقامات کے حساس مسلمانوں میں اعلاء کلمتہ اللہ [اللہ کا حکم قائم ہو] کے لیے جذبۂ عمل بیدار ہوا۔ ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ مختلف طرح کے لوگوں میں احیاء اسلام کے لیے سوچ بچار شروع ہو گئی تھی۔ علی گڑھ میں ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب صدر شعبہ فلسفہ، مسلم

---

* سہ ماہی، اقبالیات اردو، جلد ۸، شمار ۲، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، جولائی ۱۹۶۷ء۔

1 خواجہ عبدالوحید کی علامہ اقبال کے بارے میں دیگر تخلیقات کے لیے دیکھئے:
خواجہ عبدالوحید، "یاد ایام" مشمولہ، محمود نظامی، مرتبہ، ملفوظات، لاہور، لالہ نرائن دت سہگل، س ن: ___، "خواجہ عبدالوحید کی ڈائری میں ذکر اقبال" مشمولہ، خالد حامدی، مرتبہ، تلاشِ اقبال، دہلی، ادارۂ شہادتِ حق، ۱۹۸۰ء؛ ___، "اقبال کے حضور میں"، مشمولہ، جعفر بلوچ، مرتبہ، مجالس اقبال، لاہور، دارالتذکیر، ۲۰۰۲ء۔
تحریک شبان المسلمین کے بارے میں مزید جاننے کے لیے دیکھیے:
برہان احمد فاروقی، "ڈاکٹر سید ظفر الحسن اور خواجہ عبدالوحید کی کوششوں اور علامہ اقبال کی تائید اور مشورے سے قائم ہونے والی جماعت مجاہدین علی گڑھ اور جمعیت شبان المسلمین ہند کا تذکرہ"، علامہ اقبال اور مسلمانوں کا سیاسی نصب العین، لاہور، آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس، ۱۹۹۴ء۔
خواجہ عبدالوحید اور علامہ اقبال کے باہمی روابط کے بارے میں دیکھئے:
"ذکر اقبال، خواجہ عبدالوحید کی ڈائری میں"، مشمولہ، رحیم بخش شاہین، مرتبہ، اوراقِ گم گشتہ، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۷۵ء۔

یونیورسٹی، مشرقی پنجاب میں میر غلام بھیک نیرنگ جیسے لوگ اس موضوع پر سوچ بچار کر رہے تھے۔ اسی زمانہ میں لاہور کے چند نوجوان بھی اس طرف متوجہ ہوئے۔ ان سب لوگوں کے لیے اس سوچ بچار کے لیے مرکزی شخصیت ایک ہی تھی یعنی علامہ سر محمد اقبال۔ چنانچہ ان میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ ان سے زبانی یا تحریری طور پر تبادلہ خیالات کر رہا تھا۔

اوائل ۱۹۳۵ء میں جب علامہ اپنے مکان 'جاوید منزل' میں منتقل ہو چکے تھے، میں نے بھی میو روڈ کے دوسری طرف محلّہ محمد نگر میں مکان بنا لیا تھا اور اس لیے آپ کے ہاں آنے جانے کی آسانی ہو گئی تھی۔ اسی زمانے سے یہ داستان شروع ہوتی ہے۔ میرا اپنا دستور یہ رہا ہے کہ میں حضرت علامہ کی خدمت میں دوپہر کے وقت یا خاصی رات گئے حاضر ہوا کرتا تھا تاکہ اور لوگ ان کے پاس موجود نہ ہوں اور ان سے اطمینان اور سکون سے گفتگو ہو اور جب میں گھر واپس آتا تو سب سے پہلے یہی کام کرتا کہ علامہ مرحوم کے ملفوظات کو من و عن اپنی ڈائری میں درج کرتا۔ اس میں طرح طرح کے دینی اور سیاسی مسائل پر ان کے خیالات ملتے ہیں لیکن موجودہ مضمون میں، میں صرف وہی باتیں درج کروں گا، جو 'جمعیت شبان المسلمین' کی تجویز سے متعلق ہیں۔ اگر وقت نے ساتھ دیا تو انشاء اللہ کسی دوسرے موقع پر اور مسائل پر حضرت علامہ کے ارشادات عالیہ پیش کروں گا۔

۲۸ر فروری ۱۹۳۵ء: کل رات صوفی صاحب[2] کے ہاں اس غرض سے مجلس مشاورت منعقد ہوئی کہ سر محمد اقبال کے تجویز کردہ نظام 'شبان

---

[2] مراد صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ایم۔اے سے ہے جو تیس پینتیس برس ایسے معاملات میں میرے شریک کار رہے اور جن کے ہاں اکثر اس قسم کے اجتماعات منعقد ہوا کرتے تھے۔ وہ اس زمانہ میں مزار داتا گنج بخش کے عقب میں رہا کرتے تھے۔

المسلمین' پر غور کیا جائے۔ دراصل یہ سکیم جو ہمارے زیر غور ہے، میر غلام بھیک نیرنگ اور ڈاکٹر ظفر الحسن کی تجویز کی ہوئی ہے۔[3] جس کا مقصد "ہندوستان میں مسلمانوں کا عروج و اقبال" ہے۔ افسوس ہے کہ ان دونوں کی طرف سے آئے ہوئے کاغذات ڈاکٹر صاحب کے پاس ہیں اور وہ بھوپال گئے ہوئے ہیں۔ اس لیے اس مسئلہ پر صحیح طور پر غور نہیں ہو سکتا۔

۲۹؍مارچ ۱۹۳۵ء: ۲۶ تاریخ کو صوفی صاحب کے ہاں اجتماع ہوا اور شبان المسلمین ہند کے اصول اساسی کا مسودہ جو میں نے تیار کیا تھا زیر غور آیا اور بعد چند ترامیم منظور ہو گیا۔

۵؍اپریل ۱۹۳۵ء: کل حسب الارشاد علامہ سر محمد اقبال ایک مضمون مجوزہ 'جمعیت شبان المسلمین' تیار کیا[4] اور دفتر جاتے ہوئے حضرت علامہ کو دکھایا۔ انھوں نے پسند فرمایا۔ دفتر میں مسٹر محمد افضل بھٹی سے اس مضمون کی چار نقلیں کرائیں۔ اب ان پر لوگوں کے دستخط کرائے جائیں گے، پھر دستخط کرنے والوں کا اجلاس ہوگا، جس میں جمعیت کا رسمی طور پر قیام اور امیر کا انتخاب ہوگا اور اس کے بعد اس قیام و انتخاب کا اعلان کیا جائے گا۔

۱۲؍اپریل ۱۹۳۵ء: گذشتہ رات صوفی صاحب کی طرف گیا جہاں خود صوفی

---

[3] جس زمانہ میں میرے احباب کی توجہ اس طرف ہوئی تھی ہم میں سے کوئی بھی اس حقیقت سے واقف نہ تھا۔ جب پہلی مرتبہ علامہ مرحوم سے اس بارہ میں گفتگو ہوئی تو انھوں نے فرمایا کہ میر غلام بھیک نیرنگ اور ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب بھی ان خطوط پر سوچ رہے ہیں اور انھوں نے اپنے خیالات تحریر میں پیش بھی کیے ہیں۔ آپ لوگ ان سے خط و کتابت کر کے ان دونوں کی تجاویز حاصل کریں۔ چنانچہ میں نے دونوں بزرگوں سے خط و کتابت شروع کر دی، جس کا کچھ ذکر آئندہ اوراق میں آئے گا۔

[4] افسوس ہے کہ اس مضمون کی نقل مجھے تا حال اپنے کاغذات میں نہیں ملی۔ میرے پرانے کاغذات مختلف جگہوں پر محفوظ پڑے ہیں بہت ممکن ہے کہ وہ فائل جس میں، میں نے اس تجویز کے متعلق جملہ کاغذات رکھے تھے کبھی مل جائے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اس زمانہ کی میری ذاتی ڈائری محفوظ رہی، جس سے یہ معاملہ موجودہ نسل کے سامنے آ سکا ہے۔

صاحب اور شیخ حسام الدین صاحب[5] سے مجوزہ جمعیت شبان المسلمین کے متعلق تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔

۲۸ر اپریل ۱۹۳۵ء: آج شام جب سید صاحب[6] کے ہاں سے اپنے گھر آ رہا تھا تو علامہ سر محمد اقبال کے مکان کے عین سامنے ان کا ملازم علی بخش ملا، جس سے معلوم ہوا کہ باہر سے دو اصحاب ڈاکٹر صاحب کے پاس آئے تھے اور میرا پتہ دریافت فرما کر میری تلاش میں میرے دفتر[7] کی طرف چلے گئے تھے۔ جب گھر پہنچا تو ایک لفافہ ملا جس میں ایک رقعہ خود حضرت علامہ[8]

---

5 شیخ حسام الدین صاحب مجلس احرار کے بزرگ ترین راہنماؤں میں سے ہیں۔ امرتسر کے رہنے والے ہیں جو صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کا بھی وطن مالوف تھا۔ اب دونوں صاحبان لاہور میں مستقل طور پر مقیم ہیں۔ احرار کے اول درجہ کے راہنماؤں میں اب صرف شیخ صاحب ہی بقید حیات ہیں۔

6 سید صاحب سے مراد ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب ایم۔اے (عربی) ایم۔اے (فارسی) ڈی لٹ ہیں جو پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج کے پرنسپل ہو کر ریٹائر ہوئے۔ اور اب یونیورسٹی کے شعبہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام [دائرۂ معارفِ اسلامیہ] (اُردو) کے سربراہ ہیں۔ سید صاحب میرے ان احباب خاص میں سے ہیں جن کے ساتھ مل کر میں نے ایک ربع صدی تک بے شمار دینی، سیاسی اور علمی کاموں میں حصہ لیا۔ ۱۹۲۸ء میں جب لاہور میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ [ادارہ تحقیقاتِ اسلامی] کا قیام عمل میں آیا تو وہ پیش پیش تھے۔ بلکہ اگر ان کو اس کا محرک اول قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس انسٹی ٹیوٹ نے کم و بیش بیس برس کام کیا اور جب قیام پاکستان کے بعد میں نے لاہور چھوڑا تو اس کا کام ختم ہو گیا۔

7 دفتر سے مراد اکونٹنٹ جنرل [محاسبِ اعلیٰ] پنجاب کا دفتر ہے جس میں میں نے اکتوبر ۱۹۲۴ء سے ۱۹۴۷ء تک ملازمت کی۔

8 اس رقعہ کا مضمون حسب ذیل تھا:

My dear Khawja Wahid,

These gentlemen came from Aligarh to talk about the matter about which you wrote to Sayyid Zafar Hasan of Aligarh. Perhaps you and your friends would like to have a talk with them. If so, please come to my place any time in the evening. You can bring your friends who are in sympathy with you.

Yours,
Muhammad Iqbal.

ترجمہ:

کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔اور دوسرا ان نووارد حضرات کا جس سے معلوم ہوا کہ علی گڑھ سے ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب نے دو صاحبوں کو لاہور اس غرض سے بھیجا ہے کہ وہ ہم لوگوں سے مجوزہ جمعیت شبان المسلمین کے متعلق تفصیلی طور پر تبادلۂ خیالات کریں۔ان صاحبوں نے لکھا تھا کہ مغرب کے وقت میں مع اپنے دوستوں کے ڈاکٹر صاحب کے مکان پر[9] ان سے ملاقات کروں۔

میں جس وقت گھر پہنچا، دو بچے علیل تھے۔ میں نے ملازم کو سائیکل دے کر بھیجا تاکہ وہ ڈاکٹر عبدالغنی صاحب[10] کو بلا لائے، لیکن انھیں آنے میں دیر ہو گئی۔ادھر مغرب کا وقت ہو گیا۔ میں بہت پریشان ہوا کہ نہ ڈاکٹر صاحب آئے اور نہ ہی میں ان لوگوں تک پہنچ سکا۔ بالآخر دیر تک انتظار کرنے کے بعد میں سر محمد اقبال کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں علی گڑھ کے احباب[11] کے علاوہ حسرت صاحب[12] بھی بیٹھے تھے۔ موخرالذکر تو جلد اُٹھ کر

مائی ڈیر خواجہ وحید!

یہ صاحبان علی گڑھ سے اس امر کے متعلق گفتگو کرنے آئے ہیں جس کے بارے میں آپ نے علی گڑھ کے سید ظفر حسن کو لکھا تھا۔ غالباً آپ اور آپ کے دوست ان سے گفتگو کرنا پسند کریں گے، اگر یہ خیال صحیح ہے تو آپ شام کو کسی وقت بھی میرے ہاں آ جائیں۔آپ اپنے ان دوستوں کو بھی ہمراہ لا سکتے ہیں، جو آپ کے ہم خیال ہیں۔

آپ کا
محمد اقبال

[9] جاوید منزل۔

[10] ڈاکٹر عبدالغنی ایم۔بی۔بی۔ایس مرحوم میرے بڑے اچھے دوستوں میں سے تھے اور میرے قریب ہی رہتے تھے۔البتہ ان کا مطب فلیمنگ روڈ پر تھا جو جگہ میرے گھر سے خاصی دور تھی۔

[11] علی گڑھ سے آنے والے یہ صاحبان تھے:

(۱) ڈاکٹر ایم۔ایم احمد صاحب اور (۲) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی

اول الذکر اس زمانہ میں علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ میں اُستاد تھے اور فاروقی صاحب طالب علم۔ سید

چلے گئے اور ہم لوگ گفتگو کرنے لگے۔ رات کے ساڑھے نو بجے تک بہت سی باتیں ہوئیں اور پھر طے پایا کہ وہ دونوں صاحبان اگلے روز تین بجے (سہ پہر) میرے مکان[13] پر آئیں اور میرے دوستوں سے تبادلۂ خیالات کریں، جس کے بعد ہم سب لوگ حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ ساڑھے نو بجے رات وہ لوگ اُٹھے اور میں ان کے ساتھ میکلوڈ روڈ پر [کنگ ایڈورڈ] میڈیکل کالج کے ہوسٹل تک گیا۔

۲۵ مئی ۱۹۳۵ء: نماز جمعہ سے فارغ ہو کر انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ [بین الکلیہ اخوت مسلم] کے ارکان کے ساتھ مجوزہ 'جمعیت شبان المسلمین' کے متعلق گفتگو کی اور ان میں سے چار حضرات کے دستخط حاصل کیے۔

۳۰ مئی ۱۹۳۵ء: کل ۵ بجے کے بعد پروفیسر منیر الدین صاحب[14] تشریف لائے۔ میں نے ان کو اور راجہ حسن اختر صاحب[15] کو مجوزہ ''جمعیت

ظفر الحسن صاحب نے اپنے خط میں ان دونوں کو اپنا شاگرد لکھا تھا۔ ڈاکٹر احمد صاحب اب کراچی یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کے ہیڈ [سربراہ] ہیں۔ ڈاکٹر فاروقی صاحب قیام پاکستان کے بعد ایم۔اے۔او کالج لاہور میں کئی برس تک لیکچرار رہے۔ بعد میں کراچی آ گئے اور کم و بیش ایک سال تک اسلامک سنٹر [مرکزِ اسلامی] نارتھ [شمالی] ناظم آباد میں کام کرتے رہے اور غالباً یہاں کے اسلامیہ کالج سے منسلک ہو گئے تھے۔ ان کے موجود مشاغل سے میں واقف نہیں ہوں۔

12 مراد مولانا چراغ حسن حسرت ہے جو مدتوں مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ رہ کر صحافت کا بہت وسیع تجربہ حاصل کر چکے تھے اور اُردو زبان کے بہترین مزاح نگار تھے۔ مدتوں لاہور سے ایک ہفتہ وار پرچہ شیرازہ نکالتے رہے، جس نے مزاح نگاری کا بہت اونچا معیار قائم کر دیا۔ میرے بڑے کرم فرما تھے اور انھوں نے میرے مشاغل میں ہمیشہ میرے ساتھ تعاون کیا۔

13 میرا مکان 'قدیر منزل'، 'جاوید منزل' کے بالمقابل میو روڈ کے دوسری طرف قریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر تھا۔ یوں حضرت علامہ مرحوم کے ملنے والوں میں غالباً سب سے زیادہ ان کے قریب رہتا تھا۔

14 پروفیسر منیر الدین ایم۔ایس۔سی اسلامیہ کالج لاہور میں کیمسٹری [کیمیا] کے پروفیسر تھے اور احیاء اسلام کی تحریکوں میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔

15 راجہ حسن اختر صاحب پی۔سی۔ایس [Provincial Civil Services پراونشل سول سروسز: صوبائی

شبان المسلمین" کے متعلق مشورہ کرنے کے لیے بلایا تھا، لیکن چونکہ مؤخرالذکر تشریف نہ لائے اس لیے پروفیسر صاحب سے اسلامیہ کالج کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ ۷ بجے وہ تشریف لے گئے اور میں بھی گھر سے باہر نکلا۔ رات واپسی پر معلوم ہوا کہ راجہ صاحب میرے جانے کے بعد میرے ہاں تشریف لائے تھے۔ اور ان کے ہمراہ کوئی اور صاحب بھی تھے۔

۲۱ اگست ۱۹۳۵ء: آج ہمارے[16] ہاں مجوزہ جمعیت شبان المسلمین کے ہمدردوں کا جلسہ ہوا جس میں جمعیت کی بنیاد رکھ دی گئی۔ نیز ارکان نے تحریری طور پر اطاعتِ امیر کا عہد کیا[17] اور جمعیت کی امارت کے لیے علامہ سر محمد اقبال کا اسم گرامی تجویز ہوا۔ پروِژنل سیکرٹری [عبوری معتمد] کا کام ثاقب صاحب[18] کے سپرد ہوا اور خزانچی بدر صاحب[19] مقرر ہوئے۔

آج ہمارے ہاں کا اجلاس بہت کامیاب رہا، غیر معمولی رونق تھی، نذیر نیازی صاحب[20] نے گفتگو کو بہت پُر لطف بنا دیا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر

ملازمتِ دیوانی] تھے۔ بڑے اچھے اسلامی خیالات رکھتے تھے اور عمر بھر بڑے اچھے مشاغل میں معروف رہے۔ آخر عمر میں سرکاری ملازمت سے الگ ہو کر سیاست میں معروف ہو گئے تھے۔ وفات سے کچھ عرصہ پہلے اقبال اکیڈمی کی گورننگ کونسل کے رکن نامزد ہو گئے تھے اور کبھی کبھی اس کی کارروائی میں حصہ لینے کے لیے کراچی آتے رہتے تھے۔ یہیں میری ان سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔

16 یعنی میرے مکان 'قدیر منزل' پر۔

17 اس غرض کے لیے جو عہد نامہ طبع کرایا گیا تھا، اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

18 یعنی نجم الثاقب جو اس زمانہ میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور کے طالب علم تھے۔ میرے بڑے مستعد اور مخلص شریک کار تھے۔ جنگ عظیم میں غالباً برما کے محاذ پر راہئ ملک بقا ہو گئے تھے۔ مرحوم پنجاب کی مشہور ماہر تعلیم محترمہ خدیجہ بیگم صاحب کے چھوٹے بھائی تھے۔

19 بدر الدین بدر صاحب ایک مخلص نوجوان تھے اور اس زمانہ میں رہبر پریس، لاہور میں کام کرتے تھے۔

20 سید نذیر نیازی صاحب حلقۂ اقبال کے مشہور و معروف رکن ہیں، جو اب تک اقبال پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔

عبدالغنی بھٹی، ڈاکٹر عبدالحمید ملک،[21] ثاقب صاحب، افضل صاحب، بدر صاحب، طارق صاحب،[22] ابوالخیر صاحب،[23] پنی صاحب،[24] خواجہ غلام دستگیر صاحب[25]، ارمان صاحب[26] بھی تھے۔

۲۲/ اگست ۱۹۳۵ء: علامہ سر محمد اقبال کے دل میں اسلام کا جو درد موجود ہے اور اسلام کو دنیا میں بااقبال و سربلند دیکھنے کا جو جذبہ ان کے قلب میں موجزن ہے اس کے بروئے کار آنے کی شدید ضرورت ہے اور اس کی صورت یہی ہے کہ ان کے گرد فدائیوں کا ایک ایسا گروہ جمع کر دیا جائے جو صدقِ دل کے ساتھ اپنے آپ کو ان کے سپرد کر دینے پر آمادہ ہو۔اس صورت میں ایک طرف خود حضرت علامہ کے دل و دماغ میں ایک ایسی حرکت پیدا ہوگی جو قوم سے کام لے سکے گی اور دوسری طرف وہ جماعت

---

21 ڈاکٹر عبدالحمید ملک میو ہسپتال کے مشہور ڈاکٹر ہیں۔ان کی تمام عمر خدمت دین و ملت میں صرف ہوئی ہے۔انتہا درجہ کے صالح اور مخیّر مسلمان ہیں۔ میرے ساتھ ہر نیک کام میں انھوں نے اشتراک عمل کیا ہے۔

22 مراد عبدالرشید طارق صاحب سے ہے جو اس زمانہ میں طالب علم تھے اور ایم۔اے ہونے کے بعد سلسلۂ ملازمت میں منسلک ہوئے۔قیام پاکستان کے بعد وہ حکومت پاکستان کی وزارت معلومات [اطلاعات] میں آفیسر ہو گئے تھے۔

23 مراد مولانا ابوالخیر عبداللہ ایم۔اے سے ہے جو اب اسلامیہ کالج لاہور سول لائن میں لیکچرار ہیں۔

24 مراد مسٹر محمد شریف پنی بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی سے ہے جو ہمیشہ علمی اور تاریخی مسائل میں دلچسپی لیتے رہے ہیں اور آج کل اپنی قوم کی تاریخ مرتب کرنے میں منہمک ہیں۔

25 خواجہ غلام دستگیر صاحب دفتر اکونٹنٹ جنرل میں اسسٹنٹ اکاؤنٹس آفیسر [معاون افسر حساب] کے عہدہ سے ریٹائر ہو کر انجمن حمایت اسلام کے دفتر میں آنریری فنانشل سیکرٹری [اعزازی معتمد مالیات] ہو گئے تھے۔

26 مراد مولوی خدا بخش صاحب سے ہے جو اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ دروازہ میں اورینٹل ٹیچر [استاد علوم شرقیہ] تھے۔وہ اس زمانہ میں بچوں کا ایک ہفتہ وار اخبار نونہال بھی ایڈٹ [مرتب] کرتے تھے اور گاہے گاہے قومی اور اخلاقی نظمیں کہتے تھے جن میں ارمان تخلص استعمال کیا کرتے تھے۔عمر بھر دین و وطن کی خدمت میں ہر چھوٹی بڑی تحریک میں حصہ لیتے رہے۔ تحریک ہجرت سے لے کر تحریک جہادِ کشمیر تک بھی ما زبردست قربانیاں کرتے رہے۔اب ریٹائرڈ [فارغ شدہ] زندگی بسر کرتے ہیں۔

آپ سے وابستہ ہو چکی ہوگی جس میں زبردست قوتِ عمل بروئے کار آئے گی۔ خدا کرے کہ میرا یہ خواب سچا ثابت ہو اور نوجوانانِ اسلام کثیر تعداد میں ایک فعال جماعت کی صورت میں منظم ہو جائیں۔ اگر اس بارے میں میری کوششیں کامیاب ہو جائیں تو یہ میرے لیے بڑی ہی خوش نصیبی کا باعث ہوگا۔

یکم ستمبر ۱۹۳۵ء: آج 'جمعیت شبان المسلمین' کا اجلاس میرے مکان پر ہوا اور رکنیت کے مطبوعہ فارم[27] حاضرین میں تقسیم ہوئے۔ قرار پایا کہ کل ایک وفد حضرت علامہ کی خدمت میں پیش ہو کر اس جماعت کی طرف سے چند معروضات پیش کرے اور کوشش کی جائے کہ جلد از جلد کام شروع ہو جائے۔ آج کے اجتماع میں راجہ حسن اختر صاحب بھی شریک ہوئے اور اجلاس کے اختتام کے بعد بھی وہ دیر تک بیٹھے رہے۔

۲ ستمبر ۱۹۳۵ء: آج دفتر اسلام[28] کو جاتے ہوئے میں علامہ سر محمد

---

[27] اس فارم کا مضمون حسب ذیل تھا:

(۱) ہندوستان میں مسلمانوں کے عروج و اقبال کے حصول کے لیے جو جماعت قائم کی گئی ہے، میں اس کا رکن بننے کے لیے تیار ہوں اور اس بات کا عہد کرتا ہوں کہ امیر کی اطاعت قرآن و سنت کے مطابق بہرحال اور ہر وقت بلا چون و چرا کروں گا۔

(۲) میں متمنی ہوں کہ اس جماعت کی امارت علامہ سر محمد اقبال مدظلہ کے دست مبارک میں ہو۔

نام.................پتہ.................

دستخط

[28] اسلام، انجمن خدام الدین لاہور کا پندرہ روزہ انگریزی پرچہ تھا، جو ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۹ء تک بڑی باقاعدگی کے ساتھ نکلتا رہا۔ اس کی ترتیب و ادارت کا کام تمام تر میرے سپرد تھا۔ لیکن چونکہ اس میں انگریزوں کے خلاف شدید نکتہ چینی ہوتی تھی اور میں سرکاری ملازم تھا اس لیے بحیثیت مدیر مسئول اس پر نام خواجہ محمد رشید وائیں صاحب کا لکھا گیا تھا۔ خواجہ صاحب موصوف لاہور کی مشہور آسٹریلیا فیملی [خاندان] کے سب سے بڑے رکن ہیں اور ہمیشہ دینی تحریکات میں پورے جوش و خروش کے ساتھ شریک ہوتے رہے ہیں۔ اخبار اسلام جنگ عظیم ثانی کے شروع ہی میں بند کر دیا گیا تھا۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ میں نے اخبار کے صفحہ

اقبال سے ملا اور انھیں مطبوعہ فارم (رکنیت) دکھایا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ فارم ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب کو علی گڑھ بھیجا جائے۔

۳؍ستمبر ۱۹۳۵ء: کل چھ بجے شام پانچ نوجوانوں کے ہمراہ سر محمد اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بعد میں تین اور دوست جن میں راجہ حسن اختر شامل تھے، آ گئے۔ تقریباً آٹھ بجے تک یہ اجتماع قائم رہا۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ نے دورانِ گفتگو علم و حکمت کے دریا بہا دیئے۔ الہام اور عقل، تقدیر اور اہل نبوت اور تصوف ایسے بہت سے موضوع زیر بحث آئے۔ کاش کہ ایسے مواقع پر ان کے تمام الفاظ نقل کر لیے جایا کریں۔[29]

۲۲؍ستمبر ۱۹۳۵ء: ماہ ستمبر کے شروع میں جمعیت شبان المسلمین کے کام کی بنیاد رکھ دی گئی تھی اور ثاقب صاحب اس کے عارضی ناظم منتخب ہوئے تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک انھوں نے کوئی کارروائی نہیں کی۔

اول پر ایک مضمون 'ممالک مشرقی میں مغربی حکومتوں کے مظالم' کے عنوان سے لکھا جس میں مختلف انگریزی کتابوں کے اقتباسات جمع کر دیئے گئے تھے اور اپنی طرف سے کوئی اظہار رائے نہ کیا گیا تھا۔ سب کتابیں جن کے اقتباسات جمع کیے گئے تھے عام طور بازار اور لائبریوں [کتب خانے] میں موجود تھیں۔ لیکن اس کے باوجود حکومت پنجاب نے اخبار سے پانچ سو روپیہ کی ضمانت طلب کر لی۔ انجمن نے ہائی کورٹ میں اس حکم کے خلاف اپیل کی لیکن وہ چیف جسٹس [میر عدلیہ] نے رد کر دی۔ اس پر انجمن نے اخبار بند کر دیا اس لیے کہ اگر ضمانت داخل کی جاتی تو اس کے ضبط ہو جانے کا احتمال تھا۔ اس مقصد میں انجمن کی طرف سے مرحوم ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب نے، جو اپنے آخری دنوں میں پنجاب کی مجلس مقننہ کے اسپیکر [صدرِ مجلس] تھے، پیروی کی تھی۔

اسلام ہی وہ پرچہ تھا جس میں علامہ مرحوم کا معرکہ آرا انگریزی مضمون ''اسلام اور احمد [ی]ازم'' پہلی مرتبہ شائع ہوا تھا۔ علامہ مرحوم کے کئی اور بیانات بھی اس پرچہ میں شائع ہوئے تھے اور اس کے شذرات میں اکثر ان کے مشورے ہی سے لکھا کرتا تھا۔ آپ اس پرچہ کا التزام کے ساتھ مطالعہ فرمایا کرتے تھے، جو میرے ایسے ہیچمدان کے لیے بہت ہی ہمت افزائی کا موجب تھا۔

[29] میں اگرچہ حضرت علامہ کے ملفوظات گھر جا کر ضبط کر لیا کرتا تھا لیکن تعجب ہے کہ اس تاریخ کے ارشادات محفوظ نہیں۔

۱۴؍مارچ ۱۹۳۶ء: آج میرے مکان پر معتقدین اقبال کا اجتماع ہوا جس میں راجہ حسن اختر صاحب اور پروفیسر منیر الدین صاحب کے علاوہ ثاقب صاحب، پنی صاحب، ابوالخیر صاحب، ڈاکٹر بھٹی صاحب بھی شریک ہوئے اور ظاہر ہوا کہ لوگ اصل تجویز در بارہ[اس بارے میں] 'جمعیت شبان المسلمین' پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار نہیں، وہ سب محض اس بات کے حامی تھے کہ ایک دارالمطالعہ قائم کیا جائے جہاں اقبال کی کتابوں کا مطالعہ اور ان کی تعلیمات کی نشر و اشاعت ہوا کرے۔ چناں چہ اس پر اجلاس ختم ہو گیا۔[30]

ایک بڑی ہی خوش آیند تحریک کا یہ المناک انجام ہم لوگوں کے کمزور ارادوں کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

اس کے بعد ۱۹؍مارچ ۱۹۳۶ء کو اٹھارہ اُنیس احباب کا اجتماع ایک دوست کے مکان پر ہوااور 'بزم اقبال' کا قیام عمل میں آیا۔بزم کا مقصد اقبال کے کلام کا مطالعہ قرار پایا۔اس میں میرا انتخاب بحیثیت معتمد عمل میں آیا اور صوفی تبسم صاحب اور سید نذیر نیازی مجلس منتظمہ کے ارکان مقرر ہوئے۔

---

[30] شاید ایسے ہی حالات میں کبھی حضرت علامہ نے یہ شعر کہا تھا:

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
یہ اک مردِ تن آساں تھا ، تن آسانوں کے کام آیا

[کلیات اردو، ص386]

۱۰

اقبال کی بعض یادیں*

محمد شفیع (م۔ش)[1]

مارچ ۱۹۳۶ء سے جب قائد اعظم مسلم لیگ کی تنظیم جدید کے سلسلہ میں پہلی مرتبہ لاہور تشریف لائے، اواخر اپریل ۱۹۳۸ء تک جب حضرت علامہ اقبال کا وصال ہوا، مجھے پورے دو سال کم و بیش روزانہ ہی 'جاوید منزل' میں حضرت علامہ کی خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل رہی۔ مرض الموت کے آخری ایام میں تو میں نے حضرت علامہ کے ارشاد کے مطابق 'جاوید منزل' میں مستقل قیام اختیار کرلیا تھا۔ ان دو سالوں میں میرے خود اختیار کردہ فرائض میں خط و کتابت میں حضرت علامہ کو مدد دینے کے علاوہ مٹھی چاپی میں علی بخش کا ہاتھ بٹانا بھی شامل تھا۔ میرے ذہن کے کباڑ خانہ میں یادوں کا دفتر گڈ مڈ موجود ہے، جنھیں کبھی فرصت کے

---

* سہ ماہی، اقبالیات اردو، جلد ۸، شمار ۲، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، جولائی ۱۹۶۷ء۔

[1] میاں محمد شفیع (م۔ش) کی علامہ اقبال کے بارے میں دیگر تخلیقات کے لیے دیکھیے:
میاں محمد شفیع، "جاوید منزل میں اقبال کے ایامِ زندگی" مشمولہ، رحیم بخش شاہین، مرتبہ، ممنٹوز آف اقبال [یادگارِ اقبال]، لاہور، آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس، ۱۹۷۶ء؛ ________، "اقبال، چند یادیں"، مشمولہ، رحیم بخش شاہین، مرتبہ، اوراقِ گم گشتہ، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۷۵ء؛ ________، "اقبال کی بعض یادیں" مشمولہ، منتخب مقالات، مرتبہ، وحید قریشی، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۳ء؛ ________، "وہ کتاب جسے اقبال لکھنا چاہتے تھے" اور "بالِ جبریل پر ایک طائرانہ نگاہ" مشمولہ، طارق عزیز، مرتبہ، اقبال شناسی اور فولیو، لاہور، بزمِ اقبال، ۱۹۸۸ء۔

اوقات میں ترتیب دینا میری زندگی کی آرزوؤں میں سر فہرست ہے۔ ان میں سے چند یادوں کو ترتیب و تنظیم کے بغیر آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں:

۱۹۳۷ء میں گرمیوں کے دن تھے۔ حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ بنیان اور تہمد میں ملبوس اپنے ڈرائنگ روم [کمرہِ ملاقات] میں بیٹھے حقہ سے شغل فرما رہے تھے، علی بخش ان کے پاؤں دبا رہا تھا۔ میں انھیں اخبارات سے خبریں سنا ہی چکا تھا کہ ڈاکٹر عبدالحمید ملک جو کہ آج کل 'کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج' لاہور میں معلم ہیں اور اُن دنوں انٹر کالجئیٹ مسلم برادرہڈ کی روح و رواں تھے، تشریف لائے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کی خیریت دریافت کی پھر گفتگو کا ورد چلا۔ دفعتاً ڈاکٹر عبدالحمید ملک نے سلسلہ کلام کا رخ پھیرتے ہوئے نہایت بے تکلفی سے حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا ''ڈاکٹر صاحب! آپ حکیم الامت کیسے بنے؟'' حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے بلا توقف فرمایا ''یہ تو کوئی مشکل نہیں، آپ چاہیں تو آپ بھی حکیم الامت بن سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر ملک نے استعجاب سے پوچھا ''وہ کیسے؟'' حضرت علامہ نے فرمایا ''میں نے گن کر ایک کروڑ مرتبہ درود شریف کا ورد کیا ہے، آپ بھی اس نسخہ پر عمل کریں تو آپ بھی حکیم الامت بن سکتے ہیں۔'' میں سوچتا ہوں کہ حساب کیا جائے تو ایک کروڑ مرتبہ درود شریف کا مسلسل ورد کرنے کے لئے چار سال، نو ماہ اور چھ دن درکار ہیں۔ حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کو جب بھی فراغت ملتی تھی تو وہ آقائے دو جہان سرورِ کائنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں درود و صلوٰۃ کے تحائف بھیجتے تھے:

کافرِ ہندی ہُوں مَیں، دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و دُرود، لب پہ صلوٰۃ و دُرود

[کلیات اردو، ص 422]

انٹر کالجئیٹ مسلم برادرہڈ کا قیام ۱۹۳۱ء میں عمل میں آیا۔ یہ تنظیم لاہور کے کالجوں کے دین پسند طلبہ پر مشتمل تھی۔ پروگرام یہ ہوتا کہ اتوار کے اتوار اراکین ڈاکٹر ملک کے مکان پر اکٹھے ہوتے، جہاں اسلامی موضوعات پر مقالے پڑھے جاتے، کالجوں کے طلبہ کو غیر اسلامی اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے تدابیر پر غور کیا جاتا۔ اس تنظیم نے ہزاروں کی تعداد میں انگریزی زبان میں اسلامی موضوعات پر پمفلٹ چھاپ کر مفت تقسیم کیے۔ مفتی اعظم فلسطین نے جو پچھلے دنوں خوش قسمتی سے پاکستان میں ہمارے درمیان موجود تھے، لاہور اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں پہلی مرتبہ انٹر کالجئیٹ مسلم برادرہڈ ہی کے زیر اہتمام ایک ولولہ انگیز خطاب میں مسلمانوں کو فلسطین کے مسئلہ کی نزاکت سے آگاہ کیا تھا۔ یہ فخر بھی [انٹر کالجئیٹ مسلم] برادرہڈ کو حاصل ہے کہ اس نے حضرت علامہ اقبال کی زندگی میں اوّلین یوم اقبال منانے کی تحریک کی۔ یہ تقریب ۱۹ مارچ ۱۹۳۸ء کو سارے ہندوستان میں نہایت جوش و خروش اور عقیدت و احترام سے منائی گئی۔

اس موقع کے لیے [انٹر کالجئیٹ مسلم] برادرہڈ نے نہ صرف ہندوستان کے زعماء سے (قائد اعظم سمیت) بلکہ بیرونِ ملک علمی و ادبی حلقوں سے پیغامات حاصل کیے، جن میں حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کو ان کی بیش بہا خدمات پر تحسین و تبریک کے پھول پیش کیے تھے۔ کئی نامور افراد اور اداروں نے اس موقع پر حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تار، خط اور نظمیں ارسال کیں، جن میں ان کی درازی عمر کی دعائیں کی گئی تھیں۔ اس وقت ایک اندازے کے مطابق ایک ہزار سے زائد مقامات پر یوم اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی تقریبات منعقد ہوئیں۔ خود لاہور میں یوم اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی چار نشستیں منعقد ہوئیں جن میں مسلمان، ہندو اور سکھ سبھی مقرروں نے حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کو خراج عقیدت

پیش کیا۔ ان تقریبات کے خاتمہ پر جب[انٹر کالجئیٹ مسلم] برادرہڈ کے اراکین کا ایک وفد حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اپنی عقیدت کے اظہار کے لیے حاضر ہوا تو آپ نے اظہار خوشنودی کے طور پر فرمایا ''آپ کی تحریک کی کامیابی کو دیکھ کر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے جس زمین کو خونِ جگر سے سینچا، وہ شور ثابت نہیں ہوئی۔'' اس کے ساتھ ہی انھوں نے فرمایا ''مجھے پورے ہندوستان کے نقشہ سے اپنے ربط کا اب پتہ چلا ہے۔'' نیروبی (کینیا) سے ایک قرارداد جس میں حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ قائد اعظم اور اتاترک کی درازی عمر کی دعائیں کی گئی تھیں، کا جواب دیتے ہوئے وہاں کے مسلمانوں کی انجمن کو یہ پیغام پہنچایا ''میں اپنا کام ختم کر چکا ہوں۔ میرے بجائے اب آپ صرف قائد اعظم اور اتاترک کی درازی عمر کے لیے دعا کریں۔''

جب مارچ ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کی تنظیم جدید کے خیال سے قائد اعظم لاہور رونق افروز ہوئے تو وہ حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ملنے آئے۔ یہ وہ دن تھے جب علامہ کی صحت غیر معمولی طور پر سقیم تھی۔ طبّی اصطلاح کے مطابق وہ(Cardiac Asthma) کارڈیک استھما[قلبی ضیق النفس] کے مرض میں مبتلا تھے۔ ان کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ چلنے پھرنے سے اگرچہ معذور نہیں تھے، لیکن کیفیت یہ تھی کہ اپنے برادر نسبتی خواجہ عبدالغنی کی موت پر ان کے جنازے میں شرکت کے لیے میانی صاحب تک گئے اور شام کو جب تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر واپس 'جاوید منزل' پہنچے، تو ان کی حالت غیر تھی۔ ان کی زندگی خواب گاہ سے ڈرائنگ روم تک اور ڈرائنگ روم سے صحن تک آمد و رفت کی شکل میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ فرماتے تھے کہ ''میں اپنی زندگی کا مشن پورا کر چکا ہوں۔ اب مجھے زیادہ زندہ رہنے کی ہوس نہیں۔''

جب قائد اعظم نے ان سے مسلم لیگ کی تنظیم جدید کے متعلق مشورہ کیا تو حضرت علامہ نے فرمایا ”میں آپ کے مشن کی کامیابی کے لیے اپنی رگوں کا آخری قطرۂ خون نچوڑ دوں گا۔“ جس وقت حضرت علامہ اور قائد اعظم کے مابین یہ تاریخی ملاقات ہوئی، حضرت علامہ حسب معمول قمیض اور تہبند میں ملبوس تھے۔ وہ اپنے بستر میں گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر لیٹے تھے۔ قائد اعظم ان کے سامنے بید کی ایک کرسی پر فروکش تھے۔ علامہ کی ارضی زندگی کا یہ آخری سال تھا۔ ان دنوں ان کی ذہنی کیفیت دھوپ میں بیٹھے ہوئے یونان کے اس فلسفی سے مختلف نہ تھی، جس نے سکندر اعظم کی اس عرضداشت پر کہ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟ ایک شانِ استغناء سے جواب دیا تھا ”آپ میرے لیے دھوپ چھوڑ دیں۔“

ایسی جسمانی اور ذہنی کیفیت کے باوجود حضرت علامہ نے قائد اعظم کی حمایت کا نہ صرف زبانی وعدہ فرمایا، بلکہ [پنجاب] صوبہ مسلم لیگ کی صدارت، جو اس دور کے سیاسی سیاق و سباق میں کانٹوں کے تاج کا درجہ رکھتی تھی، بہ طیب خاطر قبول کی اور جب تک خان بہادر ملک زمان مہدی خان سرکاری ملازمت سے ریٹائر [سبکدوش] ہو کر یونی نسٹوں سے مقابلہ کے لیے سیاست میں نہیں آ گئے، اس منصب پر متمکن رہے۔ ملک زمان مہدی خاں کے صوبائی مسلم لیگ کا صدر منتخب ہونے کے بعد بھی حضرت علامہ نے قائد اعظم کے ایک سپاہی کے بیج [بلا] کی نشانی کے طور پر مسلم لیگ کی وائس پریذیڈنٹی [نائب صدارت] قبول کیے رکھی۔

جون ۱۹۳۶ء میں انٹر کالجیئیٹ مسلم برادرہڈ کے بعض اراکین حضرت علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے سامنے سیاسی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے حضرت علامہ نے فرمایا ”ہندی مسلمانوں کی یہ بڑی بدقسمتی

ہے کہ اُن کے اعلیٰ درجہ کے سیاسی دماغ یا تو حکومت کے کیمپ میں ہیں یا وہ[آل انڈیا] کانگرس سے منسلک ہو چکے ہیں۔ ملت اسلامیہ قابل اعتماد قیادت کی رہنمائی سے محروم ہونے کے باعث آج چوراہے پر کھڑی ہے۔ اس بظاہر مایوس کن ماحول میں اُمید کی ایک کرن مسٹر جناح کی شخصیت کی شکل میں نظر آتی ہے۔ وہ ہندوستان میں واحد شخص ہیں، جنھیں نہ تو ہندو خرید سکتا ہے اور نہ حکومت دبا سکتی ہے۔ مسٹر جناح نے مرکزی اسمبلی میں (۷ فروری ۱۹۳۶ء) اپنے تدبر سے انگریزی حکومت اور کانگرسی اپوزیشن[حزب اختلاف] کے مابین مٹھی بھر مسلم اراکین کو پاسنگ کی حیثیت دے کر ایک طرف کمیونل ایوارڈ [فرقہ وارانہ فیصلہ] کو منظور کروا لیا ہے اور دوسری طرف گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ[قانونِ حکومتِ ہند] ۱۹۳۵ء کے ماتحت مجوزہ مرکزی فیڈریشن [وفاق] کا منصوبہ بھی مسترد کروا لیا ہے۔ مسلمان نوجوان کا یہ فرض ہے کہ وہ ملی مفاد کے ایسے بے خوف اور با تدبیر نگہبان کی حمایت میں سرگرم عمل ہوں"۔ حضرت علامہ نے [انٹر کالجئیٹ مسلم] برادرہڈ کے اراکین کو یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ مسٹر جناح کی تائید میں ایک اخباری بیان جاری کریں۔ حضرت علامہ نے فرمایا "اس طرح یونی نسٹوں کو معلوم ہو جائے گا کہ مسلمانوں کی نئی نسل کس طرح سوچتی ہے۔"

انٹر کالجئیٹ مسلم برادرہڈ کے لیے، جس نے اس سے پہلے اپنی تمام تر توجہ مسلمان طلبہ کی اخلاقی اصلاح تک محدود کر رکھی تھی، یہ ایک نیا میدانِ عمل تھا۔ انھوں نے حضرت علامہ کے ارشاد کے مطابق مسلم لیگ کی حمایت میں بیان کا ایک مسودہ تیار کیا، جسے ان کی منظوری حاصل کرنے کے بعد اخبارات میں شائع کر دیا گیا۔ اس بیان کی اشاعت پر حضرت علامہ بہت مطمئن اور مسرور تھے۔ برسبیل تذکرہ یہاں یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ حضرت

علامہ کے ارشاد کے ماتحت انٹر کالجیئیٹ مسلم برادرہڈ کے جن چند اراکین نے ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کا جھنڈا اُٹھایا، وہ مسلسل گیارہ سال تک عواقب و نتائج سے بے نیاز ہو کر قیام پاکستان تک اس جھنڈے کو تھامے رہے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد حضرت علامہ کے مشورہ سے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا جس نے قائدِ اعظم کا دست راست بن کر پنجاب میں یونی نسٹوں کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں مدد دی۔ فیڈریشن کے پہلے صدر حمید نظامی مرحوم اور دوسرے عہدیدار جب حضرت علامہ سے نو تشکیل شدہ جماعت کے لیے پیغام حاصل کرنے کے لیے ملے، تو انھوں نے اپنے پیغام میں دوسرے امور کے علاوہ یہ بھی فرمایا ''طاقت حاصل کرنا بُری بات نہیں، لیکن طاقت کا غلط استعمال کرنا شیطان کا کام ہوتا ہے۔''

حضرت علامہ فطرتاً یک سو اور یک دل انسان تھے۔ منافقت اور مداہنت انھیں چھو تک نہ گئی تھیں۔ ان کی بے باکی کا یہ عالم تھا کہ جب مسجد شہید گنج کے انہدام کے بعد ایک ڈیپوٹیشن [وفد]، جس میں بعض ایسے مسلمان زعماء بھی شامل تھے جو در پردہ انگریز گورنر کو مسلمان کی رائے عامہ کی پروا نہ کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے، ان سے مشورہ کی غرض سے ان سے ملنے کے لیے آیا، تو انھوں نے بڑی بے تکلفی سے کہا ''بھئی یہ کیا غضب ہے کہ ایک طرف تو گرانے والوں کی پشت پناہی کرتے ہو اور دوسری طرف مجھ سے مسجد کی واگذاری کے لیے مشورہ طلب کرنے بھی آئے ہو پھر قرآن کریم کی ایک آیت پڑھی: وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ ءَامَنُوا قَالُوا ءَامَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَـٰطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُونَ [اور جب ایمان والوں سے ملیں تو کہیں ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوں تو کہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو یونہی ہنسی کرتے ہیں] (القرآن، البقرۃ: آیت 14) حضرت علامہ کے اس ارشاد

کو سن کر بعض بڑے بڑے طرہ بردار ماتھوں پر پسینہ آ گیا۔ جب ایک دفعہ حضرت علامہ نے مسلم لیگ کی حمایت کا اعلان کر دیا تو وہ تمام لوگ جن کا تعلق مسلم لیگ کی مخالف جماعتوں سے تھا، ان سے ایک ایک کر کے کٹ گئے۔ ان میں کرسی نشین مدعیان قیادت کے علاوہ بڑائی کے دعوے دار بڑے بڑے اخبار نویس بھی شامل تھے۔ حضرت علامہ کا تعلق صرف ان لوگوں سے رہ گیا جو مسلم لیگ کے ہم نوا تھے۔ ان میں چند وکلا ایک دو سرکاری ملازم چند اخبار نویس، چند اطبا اور چند علما تھے، لیکن حضرت علامہ کو اس کا قطعاً ملال بلکہ خیال تک نہ تھا۔ اخباروں میں روزنامہ احسان اور اخبار نویسوں میں مولٰنا مرتضٰی احمد خاں مکیش کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس دور میں موخر الذکر کی وساطت سے مقدم الذکر میں حضرت علامہ کا سیاسی کلام 'ایکس شاعر' کے قلمی نام سے شائع ہوا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ جناح سکندر پیکٹ کے بعد صوبہ کے چیف منسٹر سر سکندر حیات خان مرحوم علامہ کی عیادت کے لیے 'جاوید منزل' آئے۔ اس مختصر سی رسمی ملاقات میں علامہ تنبیہ سے باز نہ رہے۔ سر سکندر حیات خاں کو مخاطب کر کے فرمایا "سردار صاحب! ہندوؤں اور سکھوں کو راضی کرنے کے لیے آپ جو چاہیں کریں، لیکن ملت اسلامیہ کی سکی مول نہ لیں"۔

مارچ ۱۹۳۶ء سے اوائل ۱۹۳۸ء تک دو سال کی مدت میں حضرت علامہ نے تین ہنگامہ خیز مباحث میں ایک فریق کی حیثیت میں حصہ لیا۔ پہلے مباحثہ میں انھوں نے پنجاب کے گورنر سر ہربرٹ ایمرسن کو جنھوں نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے پلیٹ فارم سے صوبائی خود مختاری سے کماحقہ' فائدہ اٹھانے کے لیے مسلمانوں کو اپنی صفوں میں اتحاد قائم کرنے کی تلقین کی تھی، ایک جوابی بیان کے ذریعے یہ کہہ کہ بے نقاب کیا کہ مسلمانوں کے داخلی

انتشار کا باعث تو خود گورنمنٹ ہے، جس نے انھیں شہری اور دیہاتی کی مصنوعی تقسیم میں بانٹ رکھا ہے۔ اسی بنا پر دیہاتی مسلمان نوکر شاہی کے مرغ دست آموز بن کر رہ گئے ہیں۔

دوسرے تاریخی مباحثہ میں مولانا حسین احمد مدنی کے اس کلیہ کا، کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں، تار و پود اس مشہور قطعہ سے بکھیر دیا:

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دین ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبیست
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر زمقام محمدی عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی، تمام بولہبی است[2]

[کلیات اردو، ص۷۵۴]

[2] ترجمہ:

عجم ابھی دین کی باریکیاں اور حقیقتیں نہیں جانتا، ورنہ دیوبند سے حسین احمد ہوں، یہ کیا عجیب و غریب معاملہ ہے
انھوں نے منبر پر یہ راگ الاپا کہ ملت وطن سے ہے
کتنے بے خبر ہیں وہ محمد عربی ﷺ کے مقام سے
مصطفیٰ تک خود کو پہنچاؤ کیوں کہ دین سارے کا سارا وہ ہیں
اگر ان ﷺ تک نہ پہنچے تو پھر سب کچھ بولہبی ہے

مترجم: احمد جاوید

تیسرا مباحثہ پنڈت جواہر لال نہرو کی جانب سے قادیان فرقہ[کذاء: قادیانی مذہب] کو اسلام کا صحیح ترجمان قرار دینے کی تردید سے شروع ہوا۔ حضرت علامہ نے اپنے مفصل بیانوں میں شرک فی النبوۃ [نبوت میں شرک] کے عمرانی مقتضیات کی عصری اصطلاحات میں کھول کر وضاحت کی۔ ایمان عقیدہ ختم نبوت کی عقلی توجیہہ تحریک پاکستان کے ارتقاء میں ایک بڑا سنگ میل ثابت ہوئی۔ عام مسلمانوں کے دینی عقائد اور جدید سیاسی قومیت، مملکت اور ہوم لینڈ[وطن] کا باہمی ربط اس طرح واضح ہو گیا کہ مسلم عوام اور خواص دونوں پہلی مرتبہ مطالبہ پاکستان پر ہمنوا ہی نہیں یک دل بھی ہو گئے۔

ان ہنگامہ خیز بحثوں کے ساتھ انہی دو سالوں میں ارمغان حجاز کی بیشتر نظمیں بھی زیورِ تخلیق سے آراستہ ہوئیں۔ دراصل جیسا کہ علامہ نے خود فرمایا ہے ''ان کا پیکر خاکی دو روحوں کا نشیمن تھا، ایک سراپا سوز و مستی اور دوسری سراپا تاب و تب تھی''۔ سوز و مستی والی روح جھکڑ چلے یا آندھی آئے، اولے برسیں یا طوفان اُٹھیں، اپنے کام میں مصروف رہتی تھی۔ ایک دن ان کے ایک بے تکلف دوست سردار امراؤ سنگھ مجیٹھیہ ملنے آئے، تو شروع گفتگو میں سردار صاحب انگریزی میں پوچھنے لگے۔How is the Muse? [ہاو اِز دی ماؤز] (روح شاعری کیسی ہے؟) اس پر حضرت علامہ نے حقہ کا کش بھرتے ہوئے فرمایا ''ایہہ شاعری پری نہیں، اک ڈاہڈا جن اے، جھدی اک فرمائش پوری کرو، تاں دوسری فرمائش لے کے چمڑ جاندا اے، مینوں تے ایہدے کولوں پچھا چھڈاناں محال ہو گیا ہے۔''[3]

---

[3] ترجمہ: یہ شاعری پری نہیں، بلکہ ایک سخت جن ہے جس کی ایک فرمائش پوری کرو تو دوسری فرمائش لے کر

والدہ جاوید کے انتقال کے بعد گھر کی نگہبانی اور کم سن جاوید اور منیرہ کی بہ نفس نفیس خبر گیری کے مسائل حضرت علامہ کے لیے خاصے پریشان کن تھے۔ علی بخش کے علاوہ رحمان اور مسیتا دو اور ملازم تھے۔ مسیتا باورچی تھا۔ حضرت علامہ فرمایا کرتے تھے کہ جب مسیتا مجھ سے صبح آ کر یہ پوچھتا ہے کہ آج کیا پکے گا؟ تو مجھے سخت ذہنی اُلجھن کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ آج مجھے کیا کھانا چاہیے؟ کچھ عرصہ تک گھر کا انتظام حضرت علامہ کے ایک بھتیجے اور ان کی بیوی کے زیر اہتمام لشتم پشتم چلتا رہا، لیکن جب گھر کا بوجھ بڑھنے لگا تو حضرت علامہ نے علی گڑھ میں اپنے ایک دوست رشید احمد صدیقی کو خط لکھ کر تاکید کی وہ اس جرمن خاتون کو جو کہ وہاں اپنی شادی شدہ بہن کے ہاں مقیم تھیں، لاہور آنے کے لیے آمادہ کریں تاکہ وہ گھر کی خبر گیری کے علاوہ جاوید اور منیرہ کی دیکھ بھال بھی کر سکیں۔ حضرت علامہ جرمن قوم کے بڑے مداح تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ کھری ہڈی کے لوگ ہیں۔ چنانچہ جب ۱۹۳۷ء کے موسم گرما میں مس ڈورالنٹ ویئر نے 'جاوید منزل' کا چارج لیا تو حضرت علامہ گھر کے روزانہ کے انتظامات سے بڑی حد تک بے فکر ہو گئے۔ اس جرمن خاتون نے نہ صرف حضرت علامہ کی توقعات کے مطابق جاوید خصوصاً منیرہ کے دلوں میں امی کے مقام کی خلا پُر کر لی بلکہ اپنے حسن انتظام اور سلیقہ شعاری سے گھر کے اخراجات میں معتدبہ کفایت کے ساتھ بہتر خانہ داری کا نمونہ بھی پیش کیا۔ یہ خاتون جو ان دنوں مغربی جرمنی میں مقیم ہیں، جاوید منزل میں قیام کے دوران حضرت علامہ کے حسن سلوک سے اس حد تک متاثر ہیں کہ جاوید اور منیرہ کو دیکھنے کے لیے ہر سال پاکستان آتی ہیں۔ اس معمول کے مطابق گذشتہ سال

چمٹ جاتا ہے۔ مجھے تو اِس سے پیچھا چھڑانا محال ہو گیا ہے۔ مترجم: مرتب

جب وہ 'جاوید منزل' میں فروکش تھیں اور انھوں نے علامہ اقبال کے پوتے منیب اقبال کو اپنی گود میں لے رکھا تھا تو ان کے چہرے کی کیفیت دیدنی تھی۔

۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کی تمام شب میں حضرت علامہ کے بستر مرگ کے نزدیک حاضر رہا۔ میں نے پانچ بجے صبح حالت نزع کا بھی مشاہدہ کیا۔ دم مرگ وہ اپنے اس شعر کا مجسم مرقع تھے کہ:

نشان مرد حق دیگر چہ گویم
چو مرگ آید تبسّم بر لب اوست[4]

[کلیات فارسی، ص ۸۴۷]

---

[4] ترجمہ:

مرد حق کا یہ نشاں ہے کہ جب آتی ہے موت
مسکراتے ہوئے دنیا سے گزر جاتا ہے

[صدیقی، ص ۱۹۵]

۱۱

یادِ ایام: میری ذاتی ڈائری میں ذکر اقبال*

خواجہ عبدالوحید

بیسویں صدی عیسوی کے عشرۂ اوّل کے نصف آخر میں لاہور میں ایک مکان 'للی لاج' (Lily Lodge) کے نام سے تھا۔ بازار حکیماں سے بازار سید میٹھا کو جو راستہ جاتا ہے اور جو اب تحصیل بازار کہلاتا ہے اس کے مشرقی سرے سے ذرا پہلے دائیں ہاتھ کو ایک محلّہ تھا جسے 'تھڑیاں بھابھڑیاں' کہتے تھے۔ اس محلّہ کی بیشتر آبادی جینیوں کی تھی۔ 'للی لاج' اسی محلّہ میں واقع تھا۔ جس زمانہ کا یہ ذکر ہے اس زمانہ میں اس مکان میں لاہور کے روشن خیال مسلمان بزرگوں کا ہر شام اجتماع ہوتا تھا۔ خاصی رات گئے تک اہم علمی، ادبی اور قومی مسائل پر گفتگو ہوتی تھی۔ اس اجتماع میں شرکت فرمانے والے بزرگوں میں سر محمد اقبال، سر عبدالقادر، سر شہاب الدین ایسے حضرات شامل تھے۔[1] اسی محفل میں مولانا ظفر علی خاں نے حیدر آباد سے آنے کے بعد لاہور سے زمیندار شائع کرنے کا پہلی بار اعلان کیا تھا۔

مذکورہ بالا بیشتر بزرگ شہر کے اسی حصے میں رہتے تھے۔ سر عبدالقادر تو تھڑیاں بھابھڑیاں سے ملحق ایک گلی میں رہتے تھے، سر شہاب الدین بازار

---

* سہ ماہی، اقبالیات اردو، جلد ۹، شمار ۴، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، جنوری ۱۹۶۹ء۔

[1] اس زمانہ میں یہ حضرات صرف 'ڈاکٹر شیخ محمد اقبال'، 'شیخ عبدالقادر' اور 'چودھری شہاب الدین' کے ناموں سے موسوم تھے۔ نائٹ ہڈ [سرداری] کا خطاب ان حضرات کو مدتوں بعد ملا۔

جج عبداللطیف میں رہتے تھے جو بازار حکیماں سے جانب مغرب واقع ہے۔ اس محفل کے ایک اور اہم رکن مولوی احمد دین صاحب مصنف سرگزشتِ الفاظ۹ لوہاری منڈی کی ایک گلی میں قیام رکھتے تھے۔ سر محمد اقبال جو اس زمانے میں یورپ سے ڈاکٹریٹ اور قانون کی سند لے کر آ چکے تھے، ۱۹۰۸ء میں اس محفل میں شرکت فرمانے لگے تھے۔[2] وہ اس زمانے میں انار کلی بازار میں رہتے تھے۔

'للی لاج' تین بھائیوں، خواجہ کریم بخش صاحب، خواجہ رحیم بخش صاحب اور خواجہ امیر بخش صاحب کی مشترکہ جائداد تھی۔ خواجہ کریم بخش صاحب ان تین بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ راقم الحروف انہی کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔[3]

میں نے علامہ مرحوم کو اس زمانے میں کم و بیش دس برس قریب سے دیکھا اور یہ موقع مجھے اپنے مکان 'للی لاج' ہی میں ملتا رہا۔ خود ان کے مکان واقع انار کلی میں جانے کا موقع نہ ملا۔ جب میرے چچا زاد بھائی خواجہ فیروز الدین احمد[4] کی شادی حضرت علامہ کی خواہر نسبتی سے ہوئی تو اس کے بعد

---

[2] یہ محفل ۱۹۱۸ء میں منتشر ہو گئی اس لیے کہ والد مرحوم خواجہ کریم بخش سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو کر وسط ہند کی ایک ریاست میں چلے گئے تھے اور عم محترم خواجہ رحیم بخش بھی بسلسلۂ ملازمت مشرقی پنجاب میں رہنے لگے تھے۔ میرے دوسرے چچا خواجہ امیر بخش صاحب کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہو چکا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں تھڑیاں بھابھڑیاں کے تمام مکانات نذرِ آتش ہو گئے۔ ۱۹۶۰ء میں، میں نے اس آتش زدہ علاقے کو دیکھا تو تمام علاقہ جھونپڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ۱۹۱۸ء سے اقبال مرحوم نے بازار حکیماں میں مولوی احمد دین صاحب مصنف سرگزشت الفاظ کے مکان کی محفلوں میں بیٹھنا شروع کر دیا۔

[3] میں نے ۸، ۱۰ برس کی عمر میں 'للی لاج' کی محفلوں میں بیٹھنا شروع کیا تھا۔ اگرچہ میں اس عمر میں ان بزرگوں کی بہت سے باتیں نہ سمجھ سکتا تھا لیکن ان سب کو قریب سے دیکھنے کا موقع مجھے مدت تک حاصل رہا۔

[4] خواجہ فیروز الدین مرحوم میرے چچا زاد بھائی تھے (خان بہادر خواجہ رحیم بخش کے صاحب زادے)۔ وہ اس

میرا آنا جانا ان کے ہاں شروع ہو گیا، لیکن وہاں مجھے ان کے پاس بیٹھنے اور ان کی باتیں سننے کا موقع بہت کم ملتا تھا۔ میں ان کے ہاں بالعموم ان دنوں جایا کرتا تھا جب کہ ان کے صاحب زادے آفتاب اقبال گجرات سے آ کر وہاں قیام کیا کرتے تھے۔ آفتاب صاحب میرے ہم عمر تھے اور خواجہ فیروز الدین احمد صاحب کی شادی کے دوران ان سے میرے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے تھے جو آج تک بدستور قائم ہیں۔[5]

اس زمانے میں حضرت علامہ مرحوم ہمارے ہاں آتے ہی حقہ طلب فرمایا کرتے تھے اور بارہا میں خود ان کے سامنے حقہ لا کر رکھا کرتا تھا۔[6]

۱۹۱۶ء میں میں نے اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ دروازہ لاہور سے انٹرنس [اعلیٰ ثانوی] کا امتحان پاس کیا تو خواہش ہوئی کہ گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا جائے۔ لیکن اس میں دقت یہ آ پڑی کہ گورنمنٹ کالج میں صرف فرسٹ ڈویژن [درجہ اوّل] میں انٹرنس پاس کرنے والوں کو داخلہ ملتا تھا اور میں سیکنڈ ڈویژن [درجہ دوم] میں پاس ہوا تھا۔ چوں کہ حضرت علامہ اس کالج میں پروفیسر رہ چکے تھے اس لیے لیفٹیننٹ کرنل جے سٹیفنسن (Lt. Col. J. Stephenson) پرنسپل گورنمنٹ کالج کے ان سے گہرے مراسم تھے۔ چنانچہ

زمانے میں علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں وہ انگلستان چلے گئے اور ۱۹۱۷ء میں وہاں سے بیرسٹری کی سند لے کر واپس آئے اور لاہور میں انھوں نے وکالت شروع کر دی۔ قیام پاکستان سے قبل وہ لاہور کے چوٹی کے وکلا میں شمار ہوتے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں جب رولٹ ایکٹ کے نفاذ پر پنجاب میں مارشل لا لگا تو لاہور میں سب سے پہلے جو سرکردہ لوگ سیاسی کار گزاریوں کی بنا پر گرفتار ہوئے ان میں خواجہ صاحب موصوف بھی شامل تھے۔ اُن کے ساتھ گرفتار ہونے والوں میں سید محسن شاہ صاحب ایڈووکیٹ لاہور بھی تھے۔

[5] آفتاب اقبال صاحب بعد میں انگلستان سے بیرسٹری کی سند لے کر آئے اور آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ اس وقت ان کا شمار ممتاز وکلا میں ہوتا ہے۔

[6] میں نے حضرت علامہ کو شروع سے لے کر اُن کی وفات تک (تقریباً تیس برس) حقہ پیتے دیکھا اور کبھی یہ نہیں سنا کہ انھوں نے اس تمام زمانے میں شراب کو ہاتھ لگایا ہو۔

میں نے حضرت علامہ سے ایک سفارشی رقعہ ان کے نام لیا اور مجھے بغیر کسی دقت کے کالج میں داخلہ مل گیا۔[7]

۱۹۱۸ء میں 'للی لاج' کا مجلسی مرکز ختم ہو گیا جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ پرانی محفلیں ختم ہو گئیں اور ان میں شامل ہونے والے سب بزرگ ادھر اُدھر منتشر ہوگئے۔ حضرت علامہ اب میرے رشتہ کے عم محترم مولوی احمد دین صاحب کے مکان پر جو بازار حکیماں میں واقع تھا، بیٹھنے لگے۔ مولوی صاحب مرحوم اس زمانے میں لوہاری منڈی سے نقل مکانی فرما کر اس مکان میں آ چکے تھے۔ مولوی صاحب لاہور کے نامور وکلا میں سے تھے اور برسوں اسلامیہ کالج کمیٹی کے سکریٹری رہے۔ خاموشی سے ٹھوس علمی کام کرنے والے بزرگ تھے۔ عزیزی مشفق خواجہ نے حال ہی میں ان کے علمی کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔[8]

جیسا کہ میرے محترم بزرگ حکیم احمد شجاع صاحب مرحوم نے، اپنی تحریروں[9] میں ذکر فرمایا ہے 'للی لاج' کی محفلوں میں حضرت علامہ سر محمد اقبال کی صلاحیتوں کو پنپنے کا بہترین موقع ملا اس لیے کہ ان محفلوں میں جو لوگ شریک ہوتے تھے وہ بہترین ادبی ذوق رکھتے تھے۔ یہ محفلیں شعر و ادب کا بہترین گہوارہ تھیں۔ علامہ محترم 'للی لاج' کی ان محفلوں میں اپنی شعری تخلیقات پیش فرماتے اور داد پاتے۔ آپ نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں جو طویل نظمیں اس زمانے میں پڑھیں وہ اکثر آپ نے انجمن

---

[7] داخلے کے لیے انٹرویو [مصاحبہ] کے وقت پرنسپل نے حضرت علامہ کی سفارش کی وجہ سے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔

[8] دیکھیے، [مشفق خواجہ]، ''اقبال اور مولوی احمد دین'' اقبال ریویو، جلد ۸، شمارہ ۲، جولائی ۱۹۶۷ء۔

[9] حکیم احمد شجاع، خون بہا. لاہور، تاج کمپنی، س-ن؛ ______، ''لاہور کا چیلسی''، مجلہ نقوش لاہور، شمارہ نمبر ۱۰۴، جنوری ۱۹۶۶ء۔

کے جلسے سے پہلے اس محفل میں سنائیں۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ یہ تمام نظمیں میں نے 'للی لاج' میں حضرت علامہ کے قریب بیٹھ کر سنیں۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ میں ان کی بہت کم باتیں سمجھ سکتا تھا۔

'للی لاج' کی محفلیں ختم ہونے کے دس برس بعد یعنی ۱۹۲۸ء میں میں نے لاہور میں ایک علمی ادارے "اسلامک ری سرچ انسٹی ٹیوٹ" کی بنیاد رکھی۔ اسی سال لاہور میں آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس [کل ہند اجلاسِ شرقیہ] کا پانچواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے شعبۂ عربی و فارسی کی صدارت حضرت علامہ اقبال نے فرمائی۔ میں نے ان کے زیر صدارت ایک مقالہ "قرآن حکیم اور سائنٹیفک سپرٹ [سائنسی روح]" بزبان انگریزی پڑھا۔[10] اب میرا ملنا جلنا حضرت علامہ سے از سر نو جاری ہو گیا، تا آنکہ ۱۹۳۴ء میں انجمن خدام الدین (شیرانوالہ دروازہ لاہور) نے اپنا پندرہ روزہ انگریزی اخبار اسلام جاری کیا جس کی ادارت کا فریضہ میرے سپرد ہوا۔ حضرت علامہ مرحوم اس اخبار میں دل چسپی لینے لگے اور اس میں شذرات لکھنے میں بارہا میری راہنمائی فرماتے۔ ان کے متعدد مضامین اور بیانات بھی اس اخبار میں شائع ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت علامہ تحریک قادیانیت پر بڑی کڑی تنقید کرنے لگے تھے۔ آپ کا معرکہ آرا مضمون "اسلام اور احمد ازم" سب سے پہلے اسی اخبار اسلام بابت ۷ مئی ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا۔ حضرت علامہ اس اخبار کو بالالتزام ملاحظہ فرمایا کرتے تھے اور اس کے مضامین شائع ہونے سے پہلے پڑھ کر یا مجھ سے سن کر ان میں رد و بدل بھی تجویز فرماتے تھے۔[11]

---

[10] اس مقالے کا اُردو ترجمہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے اپنے مشہور ماہنامہ معارف بابت جنوری و فروری، ۱۹۳۰ء میں دو اقساط میں شائع فرمایا۔

[11] انجمن خدام الدین کا یہ ترجمان اسلام ۷ جون ۱۹۳۴ء کو جاری ہوا اور مارچ ۱۹۴۰ء میں بند ہو گیا۔ اس تمام

۱۹۳۴ء میں جب حضرت علامہ نے اپنا مکان 'جاوید منزل' میو روڈ پر تعمیر کرایا تو اسی زمانے میں میں نے بھی اس سڑک کی دوسری طرف محلہ محمد نگر میں مکان بنا لیا تھا، اس لیے میرا آنا جانا آپ کے ہاں روزمرہ کا معمول ہو گیا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ میں گھر سے دفتر جانے کے لیے نکلتا اور یہ معلوم ہونے پر کہ حضرت علامہ گھر پر اکیلے بیٹھے ہیں، میں ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا اور اطمینان سے ان کی باتیں سنتا رہتا۔ اسی طرح رات کو جب میں دوست احباب سے مل کر گھر واپس لوٹتا تو پھر حضرت علامہ کے ہاں رُکتا اور یہ معلوم ہونے کے بعد کہ اب ان کے پاس کوئی صاحب نہیں بیٹھے ہیں میں ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا اور پھر خاصی رات گئے تک ان کی باتیں سنتا رہتا۔

میں نے کبھی حضرت علامہ سے کسی مسئلے پر بحث نہیں کی بلکہ ہمیشہ ایک آدھ سوال کر دیا کرتا جس کے جواب میں حضرت علامہ علم کے موتی بکھیرتے رہتے۔ میں بغور ان کی باتیں سنتا اور گھر آ کر اپنی ڈائری میں ان کو انھیں کے الفاظ میں محفوظ کر لیتا۔ خوش قسمتی سے میری اس زمانہ کی ڈائری کے بعض اجزاء آج تک محفوظ رہ گئے ہیں، یہ یادداشت انھیں سے مرتب کی گئی ہے۔

اسی سال ۱۹۳۴ء میں جب علامہ مرحوم ابھی اپنی میکلوڈ روڈ والی قیام گاہ میں مقیم تھے، جامعہ ملیہ نے مشہور عالم مجاہد حسین رؤف بے کو توسیعی لیکچروں کے لیے دہلی آنے کی دعوت دی۔ میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے خط و کتابت کی اور غازی رؤف بے کو لاہور آنے کی دعوت بھیجی۔ چنانچہ وہ فروری ۱۹۳۵ء میں لاہور تشریف لائے اور اسلامک ری سرچ انسٹی ٹیوٹ

عرصے میں اس کی اشاعت میں کبھی ناغہ نہیں ہوا۔

کے زیر اہتمام پنجاب یونیورسٹی ہال میں ایک جلسۂ عام میں انھوں نے تقریر کی، اس جلسے کی صدارت حضرت علامہ نے فرمائی۔ اس موقع پر خاصی رقم صرف ہوئی، اس لیے کہ خود مہمان عزیز کے دہلی سے لاہور آنے اور واپسی کے اخراجات کے علاوہ ایک بڑے پیمانے پر عصرانے کے اخراجات بھی ادا کرنے پڑے تھے۔ اس رقم کی فراہمی میں حضرت علامہ نے میری بہت امداد فرمائی۔ انھوں نے خود بھی ان کاموں کے لیے چندہ دیا اور لاہور کے کئی ایک رؤسا سے بھی چندہ دلوایا۔

غازی حسین رؤف بے دورِ حاضر کے عظیم ترین ترک مجاہدین میں سے تھے۔ جنگ عظیم اوّل میں ان کے زیر کمان بحیرۂ روم میں ترکی جنگی جہاز 'حمیدیہ' نے تہلکہ مچا رکھا تھا۔ انقلاب ترکیہ کے بعد وہ جمہوریہ ترکیہ کے پہلے وزیر اعظم مقرر ہوئے تھے۔ بعد میں مصطفیٰ کمال پاشا سے اختلاف کی بنا پر انھیں اپنا وطن چھوڑ دینا پڑا تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے ہندوستان میں اپنے لیکچروں میں ایک لفظ بھی مصطفیٰ کمال پاشا کے خلاف نہیں کہا۔

اس زمانے کا ایک دلچسپ قصہ یہ ہے کہ، جیسا اُوپر بیان کر آیا ہوں، میں اکثر اخبار اسلام کے شذرات اور اداریوں کے لکھنے میں حضرت علامہ سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ ان مشوروں کے وقت خان بہادر چودھری محمد حسین صاحب (جو حضرت علامہ کے بہت ہی مخلص دوست تھے) اکثر موجود ہوتے تھے۔ وہ اس زمانے میں پنجاب گورنمنٹ کے پریس ایڈوائزر[مشیر اشاعت] تھے۔ ادھر میں حضرت علامہ کے مشورے سے اخبار میں مضمون لکھتا، اُدھر چودھری صاحب کی طرف سے سرکاری چٹھی آ جاتی کہ ایڈیٹر اسلام آکر پریس ایڈوائزر سے ملے۔ اگرچہ سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے اخبار پر میرا نام بحیثیت ایڈیٹر نہیں ہوتا تھا لیکن چودھری صاحب سے ملنے کے لیے ہمیشہ میں

ہی جاتا اور وہ فرماتے ''آپ کے اخبار کا فلاں مضمون حکومت کی پالیسی کے خلاف ہے، آیندہ ایسا مضمون نہ لکھیے گا''۔ میں ''بہت اچھا'' کہہ کر واپس آ جاتا۔ اب جنگ عظیم ثانی شروع ہو چکی تھی۔ میں نے ایک مضمون اسلام کے صفحۂ اول پر بعنوان ''مشرقی ممالک میں اہل مغرب کے مظالم'' شائع کیا جس میں مختلف انگریزی کتابوں کے ایسے اقتباسات جمع کر دیئے گئے تھے جن میں مسلمانوں پر اہل مغرب کے مظالم کی بڑی درد انگیز تفصیل تھی۔ اس پر پریس ایڈوائزر کی طرف سے اطلاع آ گئی کہ اسلام کے ناشر مبلغ پانچ سو روپے کی ضمانت داخل کریں۔ ہم نے ہائی کورٹ میں اس حکم نامے کے خلاف اپیل کی جو نامنظور ہوئی۔ اس پر بجائے زرِ ضمانت داخل کرنے کے اخبار بند کر دیا گیا تاکہ ضمانت ضبط ہونے کا امکان باقی نہ رہے۔

حضرت علامہ سے میری آخری ملاقات ان کی وفات سے ایک روز پیشتر ہوئی۔ میں جاوید منزل کے صحن میں کھڑا ہوا علی بخش مرحوم سے حضرت علامہ کی صحت کا حال دریافت کر رہا تھا۔ حضرت علامہ نے کمرے کی بند کھڑکی کے شیشے میں میرا عکس دیکھا اور دوسرے ملازم رحمان سے جو ان کے پاؤں دبا رہا تھا پوچھا کہ باہر کون کھڑا ہے اور جب اس نے میرا نام لیا تو آپ نے اس سے کہا کہ ''انھیں اندر بلاؤ''۔ چنانچہ میں حسب الارشاد حاضر ہوا۔ مزاج پرسی کے بعد آپ نے گفتگو شروع فرمائی جو بہت ہی پُر اثر اور فکر انگیز تھی۔ اس روز آپ کی باتوں میں بہت جوش تھا اور آپ بار بار بستر پر اُٹھ کر بیٹھ جاتے اور پھر تھک کر لیٹ جاتے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ آپ کو شدید تکلیف ہو رہی ہے، لیکن آپ کے جوش کا یہ عالم تھا کہ گفتگو ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ بالآخر میں نے موقع پا کر اجازت لی اور اس احساس کے ساتھ باہر نکلا کہ آج میری وجہ سے آپ کو بہت زحمت ہوئی۔

اگلے روز علی الصبح معلوم ہوا کہ گزشتہ شب حضرت علامہ اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ [الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا] إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعونَ[جب ان پر کوئی مصیبت پڑے تو کہیں ہم اللہ کے مال ہیں اور ہم کو اسی کی طرف پھرنا ہے](القرآن، البقرۃ:آیت 156)

ایک اور واقعہ یہاں قابل ذکر ہے۔ ۱۹۳۲ء میں جب حضرت علامہ دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت فرما کر واپس وطن تشریف لائے تو میں نے پہلی مرتبہ اسلامک ری سرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام 'یوم اقبال' کی تقریب کا اہتمام کیا۔ یہ تقریب بہت ہی کامیاب رہی۔ اس سلسلے میں ایک عصرانہ بھی حضرت علامہ کے اعزاز میں دیا گیا۔ اس کی مکمل کارروائی روزنامہ انقلاب مورخہ ۷ ستمبر ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ لیکن حضرت علامہ کی وفات کے بعد جو 'یوم اقبال' لاہور کی انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ کے زیر اہتمام منایا گیا تھا اسے عام طور پر 'پہلا یوم اقبال' کہا جانے لگا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ ڈاکٹر تاثیر مرحوم جو میرے بہت ہی مخلص دوست اور رفیق کار تھے اور جنھوں نے ۶ ستمبر ۱۹۳۲ء کے اجلاس 'یوم اقبال' میں ایک مقالہ بھی پڑھا تھا، خود انھوں نے لاہور کے انگریزی روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ میں قیام پاکستان کے بعد ایک مضمون بعنوان 'پہلا یوم اقبال' لکھا، جس میں ۱۹۳۸ء میں ہونے والے 'یوم اقبال' کو پہلا یوم اقبال قرار دیا۔ میں نے مولانا عبدالمجید سالک کے فرزند ارجمند ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کو متوجہ کیا تو انھوں نے روزنامہ انقلاب کی فائلوں میں سے ۷ ستمبر ۱۹۳۲ء کا پرچہ برآمد کر لیا اور پھر انھوں نے روزنامہ کوہستان لاہور کی اشاعت ۲۱ر اپریل ۱۹۶۲ء میں ایک مضمون بعنوان 'پہلا یوم اقبال' شائع کیا جس میں ۶ مارچ ۱۹۳۲ء کی تقریب کی پوری کارروائی نقل کی گئی تھی۔

اب میں اپنی ڈائری کے وہ حصے یہاں نقل کرتا ہوں جن میں علامہ اقبال سے ملاقاتوں کی تفصیل ہے۔

۸ر اکتوبر ۱۹۳۴ء

آج رات ۸ بجے کے قریب ریلوے اسٹیشن سے گھر[12] آتے ہوئے جب میں علامہ اقبال کی کوٹھی[13] کے سامنے سے گزر رہا تھا تو خیال آیا کہ حضرت علامہ سے ملاقات کر لوں۔ چنانچہ وہاں پہنچ کر کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوا اور دیکھا کہ آپ سامنے برآمدے میں چارپائی پر لیٹے ہوئے ایک چھوٹی سی کتاب دیکھ رہے ہیں۔ سوائے ایک ملازم کے جو آپ کے پاؤں[14] دبا رہا تھا اور کوئی آپ کے پاس نہ تھا۔ میں پونے نو بجے شب سے پونے گیارہ بجے شب تک آپ کے پاس بیٹھا رہا۔ بڑی ہی پُر لطف صحبت رہی۔ بے شمار باتیں آپ نے مختلف موضوعات پر فرمائیں اور اس تمام مدت میں ان کے اور میرے علاوہ اور کوئی شخص وہاں نہ آیا۔

جو لطف اور خوشی میں نے ان دو گھنٹوں میں حاصل کی وہ میری زندگی کا ایک بے بہا سرمایہ ہے۔ یقیناً یہ دو گھنٹے میری زندگی کے بہترین اوقات میں سے تھے۔[15]

---

[12] میں اس زمانے میں مزار داتا گنج بخش علیہ الرحمۃ سے ذرا آگے بڑھ کر ایک نئی آبادی میں رہتا تھا جو بعد میں 'بلال گنج' کے نام سے موسوم ہوئی۔

[13] حضرت علامہ اس وقت تک میکلوڈ روڈ والے مکان میں رہتے تھے اور 'جاوید منزل' کی تکمیل تک آپ اسی میں رہے۔

[14] اس زمانہ میں حضرت علامہ کی صحت بگڑ چکی تھی اور اکثر ایک آدمی آپ کا جسم دبایا کرتا تھا۔

[15] میں نے اس زمانے میں یہ دستور بنا لیا تھا کہ حضرت علامہ کے پاس اسی وقت بیٹھتا جب دوسرا کوئی اور شخص نہ ہوتا۔ اس لیے کہ یہ زمانہ [آل انڈیا نیشنل] کانگریس اور [آل انڈیا مسلم] لیگ کے جھگڑوں کا تھا۔ اور اکثر لوگ اسی قسم کے جھگڑے چھیڑ دیا کرتے تھے۔ میں حضرت علامہ کی خدمت میں ان کے ارشادات

جی چاہتا ہے کہ وہ تمام باتیں جو حضرت علامہ نے میرے سامنے ارشاد فرمائیں لفظ بلفظ یہاں دہرا دوں۔ لیکن آپ کے ملفوظات کی کثرت مانع ہو رہی ہے۔ ایک بہت بڑی خوش خبری آپ نے یہ سنائی کہ ''میں اپنے دل میں اس بات کی بڑی زبردست خواہش رکھتا ہوں کہ قرآن حکیم پر اپنے خیالات تفصیل سے ایک کتاب میں ظاہر کروں''۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ ''میں نے اپنے خیالات کا اظہار بڑی تفصیل سے اپنے اشعار میں کر دیا ہے، لیکن ابھی میرے دل میں اس سے بھی ایک بڑی چیز ہے جو قرآن حکیم کی شرح کی صورت میں ظاہر کرنے کی آرزو رکھتا ہوں''۔ اس کے بعد آپ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ اس کام کو ایک ہی صورت میں یکسوئی کے ساتھ کر سکتے ہیں کہ کم از کم پانچ سال کے لیے ان کو افکارِ روزگار سے فرصت مل جائے۔[16]

افسوس ہے کہ دنیائے اسلام کے اس عدیم النظیر فلسفی اور حکیم کے لیے مسلمان قوم فراغت کا سامان مہیا نہ کر سکی۔ مسلمان قوم کی بے سر و سامانی کا اس سے بڑھ کر بین ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔

دورانِ گفتگو میں حضرت علامہ نے مسلمانانِ ہند کے متعلق فرمایا کہ

عالیہ علمی موضوعات پر سننے کے لیے جاتا تھا اور اس بات کی بھی خاص کوشش کرتا تھا کہ خود کچھ نہ کہوں صرف آپ کو سنتا رہوں۔ چنانچہ میرا اکثریہ دستور تھا کہ کوئی سوال اسلام کی تاریخ یا تمدن کے متعلق کر دیتا اور اس کے جواب میں جو کچھ وہ فرماتے بغور سنتا رہتا۔ اور پھر اپنے گھر پہنچ کر وہ تمام باتیں من و عن اپنی ڈائری میں ضبط تحریر میں لے آتا۔ میری کوشش تو یہی رہی کہ میں مرحوم کے الفاظ من و عن لکھوں۔ تاہم ہو سکتا ہے کہ کہیں کوئی لفظ یا جملہ ان کی زبان سے نہ نکلا ہو لیکن اس کے باوجود امید ہے کہ مفہوم آپ ہی کا ہوگا۔

16 حضرت علامہ عمر بھر روپیہ جمع نہ کر سکے۔ [کذا؟ حضرت علامہ نے عمر بھر روپیہ جمع نہ کیا] اب انھیں اس بات کی فکر لاحق ہو چکی تھی کہ دو چھوٹے بچوں کے لیے زندگی کا کچھ سر و سامان مہیا کریں۔ اور اس میں سب سے پہلی ضرورت سر چھپانے کے لیے مکان کی تھی۔ اس کے لیے وہ جدوجہد کر رہے تھے اور ہائی کورٹ میں وکالت کا کام چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اوپر کے الفاظ اسی صورت حال کی غمازی کر رہے ہیں۔

''میرا مدت العمر کا مطالعہ اور مشاہدہ مجھے یقین دلا چکا ہے کہ یہ لوگ بالکل بے کار ہو گئے ہیں بالخصوص ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ مسلمان''۔آپ کا خیال تھا کہ اگر کبھی کام آ سکتے ہیں تو غریب مزدوری پیشہ یا دکان دار لوگ جن کے لیے ان کے دل میں محبت اور احترام ہے اور جن سے مل کر انھیں حقیقی خوشی حاصل ہوتی ہے۔[17] لیکن جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کا گروہ ان کے نزدیک مستحق التفات نہیں، یہاں تک کہ اگر وہ 'ڈکٹیٹر' [آمر] بن جائیں تو وہ اس گروہ کو ختم کر دیں[18] ایک موقع پر آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اسلام کا مستقبل دنیا کے دوسرے مسلمانوں پر منحصر ہے نہ کہ ہندی مسلمانوں پر۔

اس بات کا افسوس ہے کہ میری ڈائری صرف ۱۴ جولائی ۱۹۳۰ء سے محفوظ ہے۔اس لیے ان اوراق میں اس تاریخ سے قبل کے اندراجات نہ ملیں گے۔

چودھری ظفر اللہ خاں صاحب کا ذکر آ گیا تو آپ نے فرمایا کہ چودھری صاحب اور سر فضل حسین صاحب کے ذریعہ حکومت برطانیہ نے پراونشل آٹانومی [صوبائی خود مختاری] کی روح نکال لی۔ مؤخر الذکر کے متعلق

---

[17] بارہا ایسا دیکھا گیا کہ شہر اور بیرونِ شہر کے سیدھے سادے اَن پڑھ لوگ آپ کے پاس آ جاتے تو گھنٹوں آپ کی خدمت میں بیٹھے رہتے۔آپ خود بھی کھل کر ان سے باتیں کرتے اور ان کی باتیں سنتے بھی۔اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ جہاں ان کے ہاں بڑے لوگوں کے گرم جوشانہ استقبال کا کوئی اہتمام نہ تھا، وہاں غریبوں کے لیے آپ تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ہر شخص آپ تک بہ آسانی پہنچ سکتا تھا اور ایسے لوگوں سے آپ بہت محبت اور اخلاص سے ملتے تھے۔

[۱۸] حضرت علامہ نے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا ہے: ''مسلمانوں کا مغربیت زدہ طبقہ سخت پست فطرت ہے'' (شیخ عطا اللہ، اقبال نامہ، حصہ اول، ص ۱۶۹) ان الفاظ سے بھی حضرت علامہ کی رائے تعلیم یافتہ گروہ کے متعلق صاف ظاہر ہوتی ہے۔

آپ نے فرمایا کہ ان کا وجود ہمیشہ مسلمانوں کے لیے باعث مضرت رہا ہے اور وقت آ رہا ہے کہ ان کی مزعومہ اسلام دوستی اور مسلم نوازی کے بے حقیقت راز سے پردہ اُٹھ جائے۔[19]

کرنسی آفس[دفتر سکّہ رائج الوقت] کے مسلمانوں کو نمازِ جمعہ کی اجازت نہ ملنے کا معاملہ میں نے آپ کے سامنے پیش کیا۔آپ نے فرمایا کہ ان کے چند نمائندوں کو میرے پاس لائیں تو میں انھیں مناسب مشورہ دوں گا۔[20]

ایک موقع پر جاپان کا ذکر آ گیا تو آپ نے فرمایا کہ جاپان میں تبدیلیٔ مذہب دنوں یا ہفتوں کا کام ہے نہ کہ یورپین[یورپی] ممالک کی طرح صدیوں کا۔آپ کا خیال تھا کہ اگر اسلام کا چرچا جاپان میں شروع ہو گیا تو چند ہفتوں میں پوری جاپانی قوم مسلمان ہو جائے گی۔اس کی وجہ زیادہ تر سیاسی ہے۔جاپان کے لیے مسلمان ہو جانے میں یہ فائدہ ہوگا کہ روس کے خلاف اسے چین اور ترکستان کی زبردست اسلامی قوت کی امداد و حمایت حاصل ہو جائے گی۔[21]

---

[19] سر فضل حسین مرحوم پنجاب میں مسلم لیگ کے خلاف ہندو، مسلمان اور سکھ زمینداروں کی باہمی تنظیم 'یونینسٹ پارٹی' کے بانی اور زبردست حامی تھے۔اس پارٹی نے آخر تک حصولِ پاکستان کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ تقسیم ملک سے تھوڑی مدت پہلے مسلم لیگ کو یونینسٹ گورنمنٹ کے خلاف جب زبردست جدوجہد کرنی پڑی اور مسلمانوں اور حکومت پنجاب کے درمیان شدید کشیدگی پیدا ہو گئی تو اس وقت حکمران یونینسٹ پارٹی کی قیادت سر خضر حیات خاں ٹوانہ کر رہے تھے جو سر سکندر حیات خاں کے بعد ان کے جانشین اور یونینسٹ پارٹی کے قائد منتخب ہوئے تھے۔

[20] کرنسی آفس اس زمانہ میں وہی کام کرتا تھا جو بعد میں ریزرو بینک اور پھر اسٹیٹ بینک کے سپرد ہوا۔اس زمانے میں اس دفتر کے سربراہ یعنی کرنسی آفیسر ایک سخت متعصب ہندو مسٹر کالی چرن تھے جو مسلمان عملے کو طرح طرح سے پریشان کرنے کے عادی تھے۔ان دنوں وہ مسلمان عملے کو ظہر کی نماز اور نمازِ جمعہ کی ادائی سے روکا کرتے تھے۔بعد میں ان کی شکایت وائسرائے کی مجلس منتظمہ کے فنانس ممبر[رکنِ مالیات] کو پہنچائی گئی جس کے نتیجے میں تحقیقات کے بعد اُن کا تبادلہ لاہور سے کسی دوسری جگہ ہو گیا۔

[21] علامہ مرحوم کا یہ خیال تھا کہ کسی بڑی آزاد قوم کا حلقہ بگوش اسلام ہو جانا دنیا میں اسلام کے لیے موجب

۱۴/ اکتوبر ۱۹۳۴ء

گزشتہ شب میں سیر کرتا ہوا پھر حضرت علامہ کے دولت کدے پر جا نکلا۔ اس وقت آپ کے پاس قیصر صاحب[22]، استاد عشق لہر[23] اور ایک حکیم صاحب[24] بیٹھے تھے۔ وہ لوگ دس بجے کے بعد چلے گئے اور میں حضرت علامہ کے ارشاداتِ عالیہ سننے کے لیے اکیلا رہ گیا۔ قریباً ایک گھنٹہ تک بہت ہی پُر لطف صحبت رہی۔ دورانِ گفتگو یہ مسئلہ چھڑ گیا کہ یورپ والے جن باتوں کا صدیوں تک تجربہ کرتے رہے اب ان سے متنفر ہو چکے ہیں۔ یورپ کے ایشیائی مقلدین انھیں چیزوں کے پیچھے لگے ہیں۔ مثلاً عورتوں کی بے مقصد آزادی۔ اس پر حضرت علامہ نے فرمایا: I have no faith in

---

احیاء ہوگا۔ اس لیے ان کی یہ آرزو تھی کہ جاپانی یا جرمن ایسی کوئی قوم مسلمان ہو جائے۔ ان کی یہ آرزو عین منشائے ایزدی کے مطابق تھی اس لیے کہ قرآن میں کہہ دیا گیا ہے کہ اگر مسلمان اسلام کے لیے جدوجہد کرنے سے احتراز کریں گے تو اللہ تعالیٰ کوئی اور قوم کھڑی کر دے گا جو اللہ کی راہ میں مارنے اور مرنے سے گریز نہ کرے گی۔ ہم عصر مسلمان ملکوں اور قوموں کے متعلق بھی حضرت علامہ کی رائے بالعموم اچھی نہ تھی، اس لیے کہ بیشتر ممالک یا تو مغربی استعمار کے پنجے میں پھنسے ہوئے تھے یا مغربی تمدن کے مقلد ہو چکے تھے۔ ان کا یہ خیال بھی تھا کہ جب تک مسلمان قومیں مغربی اقوام کی غلامی سے آزاد نہ ہوں احیائے اسلام کا کام نہیں ہو سکتا۔ عمر کے آخری حصے میں وہ کھلم کھلا مغرب کے خلاف مسلمانوں کو بغاوت پر آمادہ کرنے لگے تھے جیسا کہ پس چہ باید کرد اے اقوام شرق کے صفحات سے صاف عیاں ہے۔

22 ملک لال دین قیصر لاہور کے مشہور سیاسی کارکن اور پنجابی زبان کے کہنہ مشق شاعر تھے۔ اکثر تحریکوں میں حصہ لیتے رہے۔ لاہور کی ککے زئی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ اس برادری نے قبل از تقسیم ملک اور بعد قیام پاکستان بہت سے ممتاز کارکن اور سرکاری افسر مہیا کیے۔ مثلاً قائد اعظم کی وفات کے بعد ملک غلام محمد صاحب جو پاکستان کے گورنر جنرل [حاکم اعلیٰ] ہوئے، وہ اسی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی طرح پاکستان کے سپریم کورٹ [عدالتِ عظمیٰ] کے چیف جسٹس مسٹر محمد منیر، اسٹیٹ بنک [آف پاکستان] [بنک دولتِ پاکستان] کے سابق گورنر مسٹر عبدالقادر اور اٹامک انرجی کمیشن کے سابق چیئرمین ڈاکٹر نذیر احمد، سب اسی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔

23 استاد عشق لہر پنجابی زبان کے مشہور و معروف شاعر تھے۔

24 ان حکیم صاحب سے میں واقف نہ تھا اور نہ ان سے اس موقع پر تعارف ہوا۔

women یعنی مجھے عورتوں پر کوئی اعتبار نہیں۔[25]

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ عورتیں اپنے مخصوص مشاغل (مثلاً خانہ داری) میں بھی بلند ذہنیت کا ثبوت نہیں دیتیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ عورت کو دماغ کمزور ملا ہے اس لیے کہ اس کی تخلیقی قوت اس کے رحم سے تعلق رکھتی ہے۔ مرد دماغ سے تخلیق کا کام لیتا ہے اور عورت رحم سے۔ جن عورتوں کا رحم اپنا طبعی کام کرتا ہے یعنی جو بچے جنتی ہیں وہ زیادہ ذہین اور سمجھ دار ہوتی ہیں، بمقابلہ ان عورتوں کے جنھوں نے کبھی بچہ نہیں جنا۔

۳۰ نومبر ۱۹۳۴ء :

گزشتہ یک شنبہ [سوموار] کے روز میں تین چار دوستوں کے ہمراہ حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہم لوگ قریباً دو گھنٹے آپ کی خدمت میں حاضر رہے۔ علامہ محترم نے سیاسیات، اقتصادیات، تصوف، شریعت سبھی طرح کے مسائل پر حکمت و معرفت کے دریا بہائے۔ ایک موقع پر آپ نے فرمایا کہ ایک قوم یا فرد کو حالات کی نامساعدت اور بخت کی ناموافقت سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیے۔ افلاس اور فقر سے بھی انسان بے شمار فائدے

---

[25] اس سے مراد محض یہ تھی کہ قومی زندگی میں قیادت عورتوں کے بس کی چیز نہیں۔ ورنہ حیاتِ اجتمائی میں عورتوں کے مقام کے متعلق ان کے خیالات عالیہ ان کے کلام میں بہ کثرت ملتے ہیں۔ ان کے کلام میں جا بجا عورت کے فرائض اصلیہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور ان فرائض میں ان کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت عورت کا فریضۂ ''امومت'' ہے اور تہذیب حاضرہ کے بد ترین نتائج میں سے عورت کی اولاد سے محرومی ہے۔ چناں چہ ایک موقع پر اس تہذیب کا خلاصہ آپ کے ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

مرد بے کار، زن تہی آغوش

[کلیات اردو، ص ٦٠٥]

حاصل کر سکتا ہے۔ایک مفلس آدمی جس کے پاس چھن جانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے، حق و صداقت کی راہ میں وہ دلیری دکھا سکتا ہے جو ایک صاحب مال و زر نہیں دکھا سکتا۔

پھر آپ نے فرمایا:

میں ملکی سیاسیات میں فرقہ وارانہ مناقشات میں حصہ لینے کے لیے شامل نہ ہوا تھا، بلکہ محض اس لیے کہ ہندوستان کے آیندہ سیاسی نظام میں مسلمانوں کی حیثیت واضح و متعین کر دوں اور یہ ظاہر کر دوں کہ اس ملک کے سیاسی ارتقا میں حصہ لیتے ہوئے مسلمانوں کو دوسری قوموں میں مدغم نہ ہو جانا چاہیے''۔آپ نے واضح طور پر یہ بھی فرمایا کہ ''میں نے گول میز کانفرنس میں اس کے سوا اور کسی کارروائی میں حصہ نہیں لیا۔

تعلیم کا ذکر آیا تو آپ نے فرمایا:

مسلمانوں نے دنیا کمانے کے لیے دنیوی تعلیم حاصل کرنا چاہی لیکن نہ تو دنیا حاصل کر سکے اور نہ دین سنبھال سکے۔یہی حال آج مسلم خواتین کا ہے جو دنیوی تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں اپنا دین کھو رہی ہیں۔

یکم اپریل ۱۹۳۵ء

کل میں نے حضرت علامہ سے ادب لطیف کی تعریف پوچھی تو آپ نے 'ادب' اور 'آرٹ' پر اظہارِ خیال فرمایا۔آپ نے ارشاد فرمایا کہ آرٹ کے متعلق دو نظریے ہیں۔اول یہ کہ آرٹ کا مقصد محض حسن کا احساس پیدا کرنا ہے۔دوم یہ کہ آرٹ انسانی زندگی کو بہتر بناتا ہے۔ان کا ذاتی خیال یہ ہے کہ آرٹ زندگی کے ماتحت ہے۔ہر چیز کو انسانی زندگی کے لیے وقف ہونا چاہیے اور اس لیے ہر وہ آرٹ جو انسانی زندگی کے لیے مفید ہو جائز ہے اور وہ آرٹ جو زندگی کے لیے مضر ہو ناجائز ہے۔وہ آرٹ جو انسان کی ہمت کو پست اور اس کے جذبات عالیہ کو مردہ کرنے والا ہو قابل نفرت ہے اور

اس کی ترویج حکومت کی طرف سے ممنوع قرار دی جانی چاہیے۔

اس کے بعد حکومت کے فرائض پر اظہارِ خیال ہوا اور حضرت علامہ نے فرمایا :

حکومت کا سب سے بڑا فرض افراد کے اخلاق کی حفاظت ہے۔ لیکن اس سب سے بڑے فرض کو جدید دنیا تسلیم ہی نہیں کرتی۔ حکومتیں محض سیاسیات سے تعلق رکھتی ہیں اور افراد کے اخلاق کو درست کرنا اپنے فرائض میں داخل نہیں سمجھتیں۔

پھر اسلام اور تہذیب حاضرہ کا ذکر ہوا۔ فرمانے لگے کہ اسلام تہذیب حاضرہ کی تمام ضروری اور اصولی چیزوں کا دشمن ہے اس لیے مسلمانوں کو اسے تباہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے نہ کہ ان چیزوں کو جزوِ اسلام بنا لیا جائے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ دنیا اب اسلام کی طرف آ رہی ہے۔ اس لیے اگر آج تہذیب مغربی تباہ ہو جائے تو اسلام کا بول بالا ہونے کا امکان ہے۔ جونہی تہذیب مغربی کا خاتمہ ہو مسلمانوں کو اسلام کا علم بلند کر دینا چاہیے۔

آرٹ کے مضر اثرات کے متعلق آپ نے یہ بھی فرمایا کہ بعض قسم کا آرٹ قوموں کو ہمیشہ کی نیند سلا دیتا ہے، چنانچہ ہندوؤں کی تباہی میں ان کی موسیقی کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔

۲۹ر اپریل ۱۹۳۵ء

پرسوں رات حضرت علامہ نے بہت پُرجوش باتیں کیں۔ میں جب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ ضبط تحریر میں لے آؤں لیکن یہ اس وقت تو ممکن نہیں ہوتا اور گھر آ کر سب باتیں محفوظ کر لینا میرے بس کی بات نہیں۔ اس روز آپ نے دورانِ گفتگو فرمایا:

Character is a kind of energy. The more it is dissipated, the

weaker it becomes.

(سیرت ایک قسم کی قوت ہے۔ جتنا اسے بے کار صرف کیا جاتا ہے اتنی ہی یہ کمزور ہو جاتی ہے)

حضرت علامہ کی رائے میں دنیائے اسلام کی فلاح سلطنت برطانیہ کی تباہی پر منحصر ہے۔

۱۲ مئی ۱۹۳۵ء

آج صوفی صاحب،[26] بدر صاحب[27] اور طارق صاحب[28] پروفیسر منیر الدین صاحب کی طرف جاتے ہوئے میرے ہاں آئے۔ انھوں نے فرمایا کہ علامہ اقبال کا وہ بیان جو احمدیوں کے متعلق حال ہی میں شائع ہوا ہے، پمفلٹ[29] کی صورت میں شائع کیا جائے۔ میں نے وہ بیان پڑھا اور کہا کہ میرے خیال میں یہ بیان بہت مختصر ہے۔

۲۴ مئی ۱۹۳۵ء

گزشتہ شام چھ بجے میں اور عزیزم خواجہ عبدالرشید[30] ایک دوست کے

---

26 صوفی صاحب سے مراد صوفی غلام مصطفیٰ تبسم صاحب ہیں جو مدتوں گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی کے استاد رہے اور پنشن [وظیفہ حسن خدمت] پا کر مختلف قسم کے علمی مشاغل میں منہمک رہتے ہیں۔ آج کل، سنا ہے ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ ہیں۔

27 بدر صاحب سے مراد ہمارے مرحوم دوست بدر الدین بدر ہیں جو اس زمانے میں رپن پریس لاہور میں کام کرتے تھے۔

28 طارق صاحب سے مراد عبدالرشید طارق صاحب ہیں جو اس زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم تھے اور قیام پاکستان کے بعد مرکزی حکومت کی وزارت اطلاعات میں افسر ہو گئے۔

29 یہ بیان بعد میں ایک پمفلٹ کی صورت میں مندرجہ ذیل عنوان سے شائع ہوا تھا Islam and Qadianism [اسلام اور قادیانیت]

30 یعنی میرے برادر زادہ لفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید جو اس زمانے میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور کے طالب علم تھے اور اب جناح پوسٹ گریجویٹ میڈیکل سینٹر کراچی کے ڈائریکٹر ہیں۔ ان کی نگارشات سے

ہمراہ حضرت علامہ کی طرف اس غرض سے گئے کہ ان سے آیندہ اتوار کے روز ملاقات کے لیے وقت لیا جائے۔[31] جب ہم لوگ ان کی کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئے تو علی بخش سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ (والدۂ جاوید) کا ساڑھے پانچ بجے شام انتقال ہو چکا ہے۔[اَلَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا] إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ[جب ان پر کوئی مصیبت پڑے تو کہیں ہم اللہ کے مال ہیں اور ہم کو اسی کی طرف پھرنا ہے](القرآن، البقرة :آیت 156)۔اس وقت حضرت علامہ کے پاس صرف صوفی تبسم صاحب اور رشید طارق صاحب بیٹھے تھے۔ہم لوگ بھی خاموش بیٹھ گئے۔رات کے سوا دس بجے جنازہ اٹھایا گیا اور بارہ بجے تدفین سے فراغت ہوئی۔[32]

۲۵ مئی ۱۹۳۵ء

کل صبح دفتر جانے سے پہلے جاوید منزل تعزیت کے لیے گیا۔

۱۶ جون ۱۹۳۵ء

کل دفتر[33] میں عارف صاحب[34] نے مجھے ایک رسالہ دیا جو دراصل

پاکستان اور ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ بخوبی روشناس ہے۔ان کے متعدد اردو اور انگریزی مضامین مقتدر علمی رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

[31] بالعموم حضرت علامہ سے ملاقات کے لیے وقت لینے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔البتہ کسی خاص مقصد کے لیے جب ملاقات کرنی ہوتی تھی تو اس لیے پہلے سے وقت لے لیا جاتا تھا تاکہ حضرت علامہ وہ وقت کسی اور کو نہ دے دیں اور متعلقہ معاملے پر گفتگو یکسوئی اور اطمینان سے ہو سکے۔

[32] یہ سانحہ ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو وقوع پذیر ہوا۔

[33] دفتر سے مراد ہے قبل از تقسیم ملک کے زمانہ کا دفتر اکاؤنٹنٹ جنرل [محاسبِ اعلیٰ] پنجاب، جہاں میں اس زمانے میں ملازم تھا۔

[34] عبدالحمید عارف صاحب، عبدالمجید سالک مرحوم کے بھائی جو اس زمانے میں اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب کے دفتر میں ملازم تھے۔یہ صاحب قادیانی ہیں اور بحث مباحثہ کے بڑے شائق۔

مرزا بشیر الدین محمود احمد کا وہ خطبہ ہے جو انھوں نے علامہ اقبال کے حالیہ بیانات کے خلاف دیا تھا۔آج میں گھر سے دفتر اسلام جاتے ہوئے راستہ میں حضرت علامہ سے ملا تاکہ وہ رسالہ آپ کو دکھاؤں۔وہاں جو ٹھہرا تو ساڑھے بارہ بج گئے۔حضرت علامہ نے گفتگو کے دوران میں مجھ سے پوچھا کہ تمہارا پرچہ[35] آیندہ کب چھپے گا۔میں نے عرض کیا اس کا دوسرا شمارہ پریس میں جا رہا ہے، تو انھوں نے فرمایا کہ مرزا صاحب کے جواب میں میرا ایک بیان اس میں شائع کر دو۔چنانچہ آپ نے یہ بیان مجھے لکھوایا۔پھر خاصی دیر تک اس میں کانٹ چھانٹ ہوئی۔اس دوران میں چودھری صاحب[36] اور نیازی صاحب[37] بھی آ گئے تھے ان سے بھی مشورہ ہوتا رہا۔اس بیان کے علاوہ حضرت علامہ نے مجھے اپنی اس چٹھی کی ایک نقل بھی دی جو حال ہی میں اسٹیٹسمین[38] میں شائع ہوئی تھی تاکہ اسے بھی اسلام میں بطور مضمون شائع کر دیا جائے۔ساڑھے بارہ بجے وہاں سے اٹھ کر گھر آیا۔

۱۴ جولائی ۱۹۳۵ء

---

35 اس سے مراد انجمن خدام الدین (شیراں والا دروازہ) لاہور کا پندرہ روزہ انگریزی اخبار اسلام ہے جو ابھی ابھی نکلنا شروع ہوا تھا، اور جس کے ادارتی فرائض میں انجام دیتا تھا۔ یہ پرچہ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک بالالتزام نکلتا رہا۔ میں چونکہ سرکاری ملازم تھا اس لیے پرچے کا ڈیکلریشن [اقرار نامہ] خواجہ محمد رشید وائیں صاحب کے نام سے تھا جو لاہور کی مشہور 'آسٹریلین فیملی' کے رکن ہیں۔ اسی پرچے میں حضرت علامہ کا معرکہ آرا مضمون "Islam and Ahmadism" (اسلام اور احمدیت) اول بار شائع ہوا تھا۔ جنگ عظیم ثانی کے شروع ہی میں یہ پرچہ بند کر دینا پڑا۔

36 خان بہادر چودھری محمد حسین صاحب جو اس زمانے میں حکومت پنجاب کے پریس ایڈوائزر تھے اور جن کو علامہ مرحوم سے خصوصی تعلق تھا۔

37 سید نذیر نیازی صاحب جن سے محبان اقبال بخوبی واقف ہیں۔

38 حضرت علامہ اور پنڈت جواہر لال نہرو کے درمیان اس زمانے میں احمدیوں کے متعلق خط و کتابت اس روزنامے میں چھپتی رہی تھی۔

کل رات علامہ اقبال کے ہاں گیا تو وہاں پیر تاج الدین صاحب مع اپنے دو ساتھیوں کے بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر میں وہ حضرات چلے گئے تو حضرت علامہ کے اور میرے درمیان باتیں شروع ہوئیں۔ کچھ دیر کے بعد چودھری محمد حسین صاحب تشریف لے آئے۔ حضرت علامہ کی تمام گفتگو بڑے دقیق فلسفیانہ موضوعات پر تھی۔ آپ نے نبوت پر عمومی اور نبوتِ محمدیہ [ﷺ] پر خصوصی طور پر روشنی ڈالی۔ حضرت علامہ کا پختہ خیال ہے کہ نبوتِ محمدیہ [ﷺ] کی معنوی حیثیت کو ابھی تک انسان نہیں سمجھا۔ ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ بزرگانِ سلف بھی اس کی تہہ کو نہیں پہنچے۔ وہ مدعی تھے کہ خود ان کو اس حقیقت کو سمجھنے کی توفیق حاصل ہوئی ہے اور اس موضوع پر وہ تفصیل سے اپنی مجوزہ کتاب تمہید القرآن میں روشنی ڈالیں گے۔

۱۶ جولائی ۱۹۳۵ء

کل شام میں اتفاقاً حضرت علامہ کے ہاں جب گیا تو خلاف معمول[39] وہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھے اور پاؤں میں گرگابی تھی اور قریب ہی کرسی پر کوٹ [صدری] اور ٹوپی بھی پڑی تھی۔ میں سمجھا کہ آج کہیں باہر جانا ہوا ہوگا لیکن معلوم ہوا کہ آپ اس وقت بھوپال جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بھوپال سے واپسی تقریباً ڈیڑھ ماہ کے بعد ہوگی۔

۳ دسمبر ۱۹۳۵ء

آج حضرت استاذی المحترم مولانا احمد علی صاحب کے فرزند اکبر مولوی

---

39 خلاف معمول اس لیے کہ گرمیوں کے موسم میں بالعموم حضرت علامہ گھر پر لنگی اور بنیان میں ملبوس رہنے کے عادی تھے۔

حافظ حبیب اللہ صاحب کے ہمراہ حضرت علامہ کی خدمت میں طویل مدت کے بعد حاضر ہوا۔ گھنٹے سوا گھنٹے تک باتیں ہوتی رہیں اور زیادہ تر موضوعِ گفتگو تصوف رہا۔

۱۹ دسمبر ۱۹۳۵ء

آج پھر حافظ حبیب اللہ صاحب[40] کی معیت میں حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ باتوں باتوں میں جہاد پر گفتگو چھڑ گئی۔ میں نے پوچھا کہ جہاد دفاعی ہونا چاہیے یا جارحانہ۔ فرمایا کہ عام طور پر تو دفاعی ہے لیکن بوقت ضرورت جارحانہ بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی قوم بد اخلاقی میں اس قدر بڑھ جائے کہ اس سے دنیا میں نسل انسانی کی تباہی کا امکان ہو تو مسلمان حکومتوں کا فرض ہے کہ بزورِ شمشیر اس قوم کو بد اخلاقی سے روکیں۔ چنانچہ سلطان ٹیپو نے مالابار کے وحشی باشندوں کو حکم دیا کہ بجائے برہنہ رہنے کے کپڑے پہننا شروع کر دیں ورنہ وہ بزورِ شمشیر انھیں کپڑے پہننے پر مجبور کرے گا، اس لیے کہ ان کی برہنگی کا اثر ہمسایہ قوموں کے لوگوں پر ہوگا، اور ان میں مسلمان بھی شامل ہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ مسلمانوں کو 'امر بالمعروف' [نیکی کا حکم] اور 'نہی عن المنکر' [برائی سے منع کرنے] کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اشاعت حق کے پیچھے طاقت کی حمایت ہونی چاہیے، ورنہ بغیر طاقت کے 'امر و نہی' [کرنے کا حکم، نہ کرنے کی ہدایت] کیسے ممکن ہے۔ اگر مسلمان 'امر و نہی' کے فرائض ادا کرنا چاہتے

---

[40] محترمی حافظ حبیب اللہ صاحب بعد میں ہجرت فرما کر مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے تھے اور آج تک وہیں ہیں۔ اب سننے میں آیا ہے کہ انھوں نے قیام مکہ مکرمہ میں فرما لیا ہے۔

ہیں تو ان کے بازوؤں میں طاقت[41] ہونا ضروری ہے۔

۱۹ جنوری ۱۹۳۶ء

گزشتہ دو ہفتے سے میں اس کوشش میں تھا کہ حضرت علامہ کا وہ انگریزی بیان جو پنڈت جواہر لال نہرو کے مضامین مطبوعہ ماڈرن ریویو کے لیے لکھا گیا تھا، انجمن خدام الدین کی طرف سے شائع ہو۔ الحمد للہ کہ یہ کوشش کامیاب ہوئی اور یہ بیان Islam and Ahmadism (اسلام اور احمدیت) کے عنوان سے اسلام کے پرچے بابت ۲۲ جنوری ۱۹۳۶ء میں چھوٹی تقطیع کے ۵۲ صفحات پر شائع ہو گیا۔[42] اس شمارے میں تمام تر وہی

---

[41] حضرت علامہ کی تمام کتابوں میں جہاد پر زور دیا گیا ہے اور جہاد کے لیے طاقت مہیا کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ ایک مقام پر تو آپ نے یہاں تک فرما دیا کہ: عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد۔ [کلیات اردو، ص ۳۹۶]

[42] حضرت علامہ کے اس مضمون کی اشاعت کا معاملہ خاصا دلچسپ ہے۔ یہ مضمون میں نے خود ٹائپ کیا اور جب میں یہ لے کر حضرت علامہ کے پاس گیا تو آپ نے میرا قلم جس میں سبز روشنائی بھری ہوئی تھی، مجھ سے لے کر اس میں کانٹ چھانٹ شروع کی اور ہر صفحے پر کثرت سے تغیر و تبدل کر دیا۔ بعض جگہ بہت بڑا حصہ کاٹ کر اس کی جگہ حاشیے پر نیا مواد درج فرما دیا اور بعض جگہ پورا صفحہ کاٹ کر پشت پر نیا مواد درج فرما دیا اور مضمون کے آخر میں یہ الفاظ درج فرمائے:

I authorise the Anjuman Khuddamuddin to publish the above in the form of a pamphlet for free circulation.

یعنی "میں انجمن خدام الدین کو مندرجہ بالا مضمون ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع کرنے کا اختیار سونپتا ہوں، جو مفت تقسیم ہوگا۔" اس کے نیچے حضرت علامہ نے اپنے دستخط مع تاریخ ثبت فرما دیے۔ اسلام کا یہ شمارہ تیار ہو جانے کے بعد ایک نیا ٹائیٹل لگا کر اس مضمون کو پمفلٹ کی صورت دے دی گئی جسے حضرت علامہ نے پسند فرمایا۔

حضرت علامہ کے اپنے ہاتھوں سے ترمیم کردہ اصل ٹائپ شدہ مضمون میرے پاس محفوظ پڑا رہا۔ بارہا یہ مضمون احباب لے گئے لیکن پھر واپس آ گیا۔ آخری مرتبہ احرار کے مشہور رہنما حضرت مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی مرحوم کے پاس دو تین برس یہ مضمون پڑا رہا اور پھر وہ خود ہی کراچی آ کر میرے مکان پر چھوڑ گئے۔ پندرہ بیس برس کے بعد ربوہ کے قادیانی پرچے الفضل میں ایک طویل سلسلہ مقالات افتتاحیہ

مضمون چھپا ہے دوسری اور کوئی چیز نہیں۔ اس مضمون میں احمدیت کے متعلق بہت سے اہم حقائق واضح کیے گئے ہیں۔ بلا مبالغہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ آج تک احمدیت پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے مقابلے میں اس مضمون سے احمدیت پر بڑی زبردست ضرب لگی ہے۔ اس مضمون کی اشاعت نے واقعی احمدیوں کو بوکھلا دیا ہے۔

کا شائع ہوا جس میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ یہ مضمون اقبال کا لکھا ہوا نہیں بلکہ جعلی ہے۔ اور اندرونی شہادتوں سے اس دعوے کی تصدیق کی ناکام کوشش کی گئی۔ اس پر میں نے اپنے پندرہ روزہ انگریزی اخبار الاسلام میں جو میں کراچی سے تقریباً دس برس تک شائع کرتا رہا ہوں، ایک مضمون صفحہ اول پر شائع کیا اور یہ واضح کیا کہ اس مضمون کا اصل مسودہ (Typescript) میرے پاس اب تک محفوظ ہے جس کے آخر میں حضرت علامہ کے دستخط مع تاریخ موجود ہیں۔ چنانچہ میں نے اس کے آخری صفحے کا عکس بھی الاسلام کے صفحہ اول پر چھاپ دیا۔ اس کے بعد قادیانیوں کو خاموشی اختیار کر لینا پڑی۔

اس مضمون کا اصل مسودہ (Typescript) اقبال اکادمی کراچی نے مجھ سے حاصل کر لیا تھا اب یہ بطور امانت کراچی نیشنل میوزیم [قومی عجائب گھر] میں محفوظ پڑا ہے۔

سب سے بڑی دلیل جو الفضل کے مقالات میں اس مضمون کے خلاف دی گئی یہ تھی کہ حضرت علامہ ایک مدت تک مرزا غلام احمد اور ان کی تحریک کے حامی رہے ہیں۔ لیکن اس دلیل میں کچھ وزن نہیں، اس لیے کہ گو یہ دعویٰ صحیح ہے لیکن مدت العمر کے غور و فکر کے بعد حضرت علامہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ یہ تحریک ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ابدی غلامی کی الہامی سند مہیا کرنے کے لیے وجود میں آئی تھی۔ اس لیے انھوں نے بالآخر اس کے خلاف شدید قلمی جہاد کیا۔

اس سلسلے میں یہ دلچسپ چیز قابل لحاظ ہے کہ خود مرزا غلام احمد ایک مدت تک اپنے نبی ہونے کا انکار کرتے رہے کہ

من نیستم رسول و نیاوردہ ام کتاب [میں نہ تو رسول ہوں اور نہ کوئی کتاب لے کر آیا ہوں] بلکہ اپنی ایک کتاب میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''میں بھی عام مسلمانوں کی طرح یہ مانتا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں لیکن وحی الٰہی نے بارہ برس تک بارش کی طرح نازل ہو کر مجھے یقین دلا دیا کہ عیسیٰ علیہ السلام مر گئے ہیں۔''

ظاہر ہے کہ اگر مرزا صاحب کے خیالات میں اس قسم کا بنیادی تغیر آ سکتا ہے اور وہ بھی بارہ برس کے بعد، تو حضرت علامہ نے تو کبھی دعویٰ نبوت نہیں کیا، ان کے خیالات میں اگر تغیر ہوا تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟

۱۲ جون ۱۹۳۶ء

پرسوں صبح دفتر[43] کے ریفرشمنٹ روم[کمرہ آرام] میں شیخ محمد دین صاحب شرقپوری[44] نے مجھ سے کہا کہ پنجاب پی۔ڈبلیو۔ڈی[پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ]سکریٹریٹ کے ایک عیسائی سپرنٹنڈنٹ مسٹر جے۔اراٹون (Mr. J. Arratoon) مائل بہ اسلام ہیں۔ان سے ملیے۔بعد میں دو آدمی مولانا مظہر علی اظہر[45] کی چٹھی لے کر میرے پاس آ گئے جس میں انھوں نے تحریر فرمایا تھا کہ آج ہی مسٹر اراٹون سے ملنا چاہیے، مبادا غلط قسم کے حضرات ان تک پہنچ جائیں۔میں نے اسی وقت ایک رقعہ مسٹر اراٹون کے نام ان حضرات کے ہاتھ بھیجا جس میں ان کو دعوت دی کہ وہ (مسٹر اراٹون) کل ساڑھے پانچ بجے سہ پہر میرے مکان پر چائے نوش فرمائیں۔انھوں نے میری دعوت قبول فرمائی، اور کل وہ میرے دفتر کے دو تین مسلمان رفقاء کے ہمراہ چائے نوشی کے لیے تشریف لے آئے۔میرے چند دوست بھی مدعو تھے۔اراٹون صاحب

---

43 مراد اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب کا دفتر ہے جہاں کے مسلمان اس زمانے میں ہر طرح کے دینی اور سماجی کاموں میں دلچسپی لیا کرتے تھے۔اس دفتر کے لوگوں میں سے بہت سے کارکن انجمن حمایت اسلام لاہور کو میسر آئے۔انجمن کے فنانشل سکریٹری[معتمدِ مالیات] بیشتر اسی دفتر کے لوگ رہے۔منشی نظام الدین صاحب، حاجی محمد حفیظ صاحب، خان عبدالرحمان خاں صاحب، یہ سب لوگ یہیں ملازم تھے اور عمر بھر انجمن کی خدمت کرتے رہے۔آج انجمن کے آنریری[اعزازی] فنانشل سکریٹری خواجہ غلام دستگیر صاحب بھی اس دفتر سے ریٹائر ہونے والے اصحاب میں سے ہیں۔

44 شیخ محمد دین صاحب شرق پوری بہت مخلص، دیندار اور محنتی نوجوانوں میں سے تھے اور میرے دفتر کے ساتھیوں میں سے تھے۔اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔

45 مولانا مظہر علی اظہر بزرگان مجلس احرار میں سے ہیں۔تمام عمر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں صرف کر چکے ہیں۔قید و بند کے خطرے نے انھیں کبھی اعلانِ حق سے نہیں روکا۔بڑے ہی مخلص بزرگ ہیں۔اللہ تعالیٰ انھیں تادیر سلامت رکھے۔مجھے دین کی خدمت کے سلسلے میں ان کا تعاون ہمیشہ حاصل رہا۔مجلس احرار پنجاب کے چوٹی کے راہنماؤں میں سے اب یہی ایک بقید حیات ہیں۔

فوراً مشرف بہ اسلام ہونے پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ اسی وقت ہم سب لوگ انھیں ہمراہ لے کر حضرت علامہ اقبال کی خدمت میں 'جاوید منزل' حاضر ہوئے۔ وہاں راجہ حسن اختر صاحب اور سید نذیر نیازی صاحب موجود تھے۔ حضرت علامہ سے ہم لوگوں نے اپنی حاضری کا باعث بیان کیا۔ حضرت مولانا عبدالحنان[46] صاحب کو وہیں بلا لیا گیا اور انھوں نے اراٹون صاحب کو مشرف بہ اسلام کر لیا۔ الحمد للہ علیٰ ذالک [اس سب پر اللہ کا شکر ہے][47]

شام کے بعد ہم لوگوں نے اس واقعہ کی اطلاع مسلمان اخباروں میں اشاعت کے لیے پہنچا دی۔ اراٹون صاحب کا اسلامی نام ''جمیل'' رکھا گیا۔ آج وہ نمازِ جمعہ شاہی مسجد میں ادا فرمائیں گے۔

میں سوچتا ہوں کہ آج جو کچھ ترقی اسلام کی ہو رہی ہے وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہو رہی ہے، اس میں مسلمانوں کی تبلیغی کوششوں کا کچھ دخل نہیں ہے۔ اگر ہم مسلمان تبلیغ کا کام باقاعدگی کے ساتھ کریں تو اسلام کی اشاعت وسیع پیمانے پر ہو سکتی ہے۔ ابھی چند روز ہوئے گاندھی جی کا فرزند اکبر ہیرا لال مسلمان ہوا تھا۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء

---

[46] حضرت مولانا عبدالحنان صاحب اس زمانے میں آسٹریلیا مسجد نزد لاہور ریلوے اسٹیشن میں خطیب تھے۔ آپ ہمیشہ تبلیغی کاموں میں اور جہادِ آزادی میں پیش پیش رہے اور ہر قسم کی قربانیاں خندہ پیشانی سے دیتے رہے۔

[47] اس وقت ایک اعلان مسٹر اراٹون کی طرف سے ان کے مشرف بہ اسلام ہونے کا تیار کیا گیا جس میں ان کے دستخط کے نیچے تمام حاضرین نے بطورِ شہادت اپنے اپنے دستخط ثبت فرما دیے۔ ان دستخط کنندگان میں حضرت علامہ مرحوم بھی شامل تھے۔ یہ کاغذ آج تک محفوظ ہے اور اقبال اکادمی کراچی کے ریکارڈ [ذخیرہ] میں شامل ہے۔

گزشتہ شنبہ[اتوار] کے روز حضرت علامہ کی ایک نظم[48] روزنامہ احسان[49] کے سالنامے میں شائع ہوئی جو مجھے بہت ہی پسند آئی۔ فرماتے ہیں:

---

[48] یہ نظم بعد میں شائع ہونے والی کتاب پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق کا ایک بند تھا۔

[49] روزنامہ احسان حضرت علامہ مرحوم کی توجہات کا ہمیشہ مرکز رہا۔ آپ کے بیشتر خصوصی اعلانات اسی اخبار میں شائع ہوئے۔ ان اعلانات میں سے دو بہت اہم ہیں۔ اول مسجد شہید گنج کے بارے میں، جس کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ مسجد شہید گنج ایک تاریخی مسجد لاہور ریلوے اسٹیشن کے قریب لنڈا بازار کے شروع میں واقع تھی جس پر سکھوں کا قبضہ تھا۔ مسلمانوں نے اس کی واگزاری کے لیے قانونی چارہ جوئی کی۔ اس مقدمے میں، جب وہ ہائی کورٹ میں پیش تھا، قائدِ اعظم مرحوم نے مسلمانوں کی طرف سے پیروی کی تھی۔ جب ہائی کورٹ نے مسلمانوں کی اپیل خارج کر دی تو لاہور کے مسلمانوں میں زبردست ہیجان پیدا ہوا۔ ایک روز اخبارات میں یہ اعلان شائع ہوا کہ علامہ اقبال کے مکان پر ایک جلسے میں یہ طے ہوا ہے کہ مسجد شہید گنج کے فیصلے کے خلاف پریوی کونسل[مجلسِ مشیران] میں اپیل کی جائے۔ اس کے لیے تیس ہزار روپیہ درکار ہوگا۔ لہٰذا مسلمانوں سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ یہ رقم مہیا کر دیں۔ اس اعلان پر چار بزرگوں کے نام تھے:

(۱) نواب ممدوٹ

(۲) خان سعادت علی خاں

(۳) خان بہادر حاجی رحیم بخش ریٹائرڈ سیشن جج

(۴) خاں بہادر نواب مظفر خاں صاحب۔

ان میں سے ہر ایک تیس ہزار کی رقم بآسانی اپنی جیب سے ادا کر سکتا تھا۔ لیکن مقصد یہ تھا کہ روپیہ غریبوں کی جیبوں سے نکلے اور نیک نامی خود ان بزرگوں کو حاصل ہو۔ اس سلسلے میں یہ چیز بھی دلچسپ ہے کہ جب مسجد گرائی گئی تھی تو اس زمانے میں نواب مظفر خاں صاحب کے سامنے کونسل میں یہ معاملہ پیش ہوا ہوگا اور وہیں یہ فیصلہ ہوا ہوگا کہ مسجد گرا دی جائے۔ چنانچہ مسجد گرانے کے لیے سرکاری بل ڈوزر وغیرہ استعمال ہوئے۔ لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس وقت نواب مظفر خاں صاحب نے کیا رائے دی تھی۔ آیا وہ مسجد گرانے کے حق میں تھے یا مخالف۔ یہ معاملہ آخر تک معرضِ اخفا میں رہا۔ بہرحال اگلے روز علامہ مرحوم کا ایک بیان روزنامہ احسان میں چھپا جس کا ملخص یہ تھا کہ جلسہ میرے مکان پر ضرور ہوا تھا لیکن میں پریوی کونسل میں اپیل کرنے کے خلاف تھا۔ میں نے یہ خیال ظاہر کر دیا کہ اس اپیل کے دائر کرنے سے مسلمانوں کا تیس ہزار روپیہ ضائع ہوگا، لیکن اعلان کرنے والے حضرات مصر ہوئے کہ اپیل ضرور ہونی چاہیے۔ اس پر میں اظہارِ بریت کے لیے محفل سے اٹھ کر گھر کے اندر چلا گیا (جلسہ 'جاوید منزل' کے صحن میں ہو رہا تھا) ان لوگوں نے میرے اُٹھ جانے کے بعد فیصلہ کر لیا کہ اپیل ہوگی اور مسلمانوں سے تیس ہزار روپیہ طلب کیا جائے اور رات ہی کو اخبارات میں اعلان کر دیا۔ میں اس فیصلہ میں شریک نہیں تھا اور اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ یہ اپیل بے کار ہوگی اور غریب مسلمانوں کا تیس ہزار روپیہ ضائع ہوگا۔

جلوۂ حق گرچہ باشد یک نفس
قسمت مردان آزاد است و بس
مردی آزادے چو آید در سجود
در طوافش گرم رو چرخ کبود
ما غلامان از جلالش بیخبر
از جمال لازوالش بے خبر
در بدن داری اگر سوز حیات
ہست معراج مسلمان در صلوٰت
ور ندارے خون گرم اندر بدن
سجدۂ تو نیست جز رسم کہن
عید آزاداں شکوہ ملک و دین
عید محکومان ہجوم مؤمنین[50]

دوسرا واقعہ یوں ہوا کہ دہلی کے ایک پبلک جلسے میں حسین احمد مدنی نے ایک جملہ کہا تھا کہ 'قومیں اوطان سے بنتی ہیں'۔ اس پر مسلم لیگی پریس [نشرواشاعت] نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ جس طریق سے اس خبر کو چھاپا گیا اس سے متاثر ہو کر حضرت علامہ مرحوم نے ایک مختصر لیکن بہت ہی زور دار نظم ارقام فرمائی جس کا اخبارات میں بہت چرچا ہوا۔ اس پر مسلم لیگیوں اور حضرت مولانا مرحوم کے طرف داروں میں زبردست مباحثہ ہوا۔ بالآخر حضرت علامہ مرحوم کا ایک بیان روزنامہ احسان میں شائع ہوا جس میں انھوں نے اعلان کیا کہ چونکہ مولانا نے واضح فرما دیا ہے کہ انھوں نے 'اوطان' والا جملہ خبر کے طور پر کہا تھا نہ کہ اپنی رائے کے طور پر، اس لیے اب میرے اور ان کے درمیان اس معاملے میں کوئی اختلاف نہیں رہا اور آخر میں حضرت علامہ نے مولانا کے شاگردوں سے یہ فرمایا کہ ''مولانا کی عقیدت میں میں ان سے پیچھے نہیں ہوں''۔ اس تمام معاملے کے بعد آج تک اس قصے کو اچھالا جا رہا ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ ارمغانِ حجاز اگر حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی زندگی میں چھپتی تو یہ نظم اس میں شامل نہ ہوتی۔

[50] ترجمہ:

دیکھنا جلوہ خدا کا گرچہ پل بھر کی ہے بات
یہ فقط آزاد مردوں کے مقدر کی بات ہے
مرد حر جس دم خدا کے آگے سجدہ کرتا ہے

[کلیات فارسی، ص ۸۰۷]

۴ نومبر ۱۹۳۶ء

حضرت علامہ کی مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق شائع ہو گئی ہے۔[51] میں نے اسلام کے آیندہ پرچہ کے لیے اس پر ریویو [تبصرہ] لکھا ہے جس میں قریباً چالیس اشعار نقل کیے ہیں۔

قادیانیوں کے اُردو رسالہ ریویو آف ریلیجز میں حضرت علامہ کی کتاب ضربِ کلیم پر پچھلے دنوں ریویو کیا گیا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ ''یہ کتاب بال جبریل سے بھی گری ہوئی ہے''۔ میں نے وہ پرچہ حسرت صاحب[52] کو

طوف ہیم چرخ نیلی فام اس کا کرتا ہے
ہم غلام اس کے شکوہ و شان سے ہیں بے خبر
اس کے حسن لازوال اور آن سے ہیں بے خبر
تو اگر اپنے بدن میں رکھتا ہے سوز حیات
اک مسلماں کے لے معراج ہے اس کی صلوٰۃ
اور اگر عاری ہے خون گرم سے تیرا بدن
تیرے سجدے کی حقیقت کیا ہے جز رسم کہن
عید آزاداں شکوہ ملک ودیں کا نام ہے
عید محکوماں ہجوم مومنیں کا نام ہے

[صدیقی، ص ۱۳۶۵]

[51] حضرت علامہ کی زندگی میں ان کی شائع ہونے والی کتابوں میں یہ آخری کتاب تھی۔ ارمغانِ حجاز آپ کی وفات کے بعد شائع ہوئی تھی۔

[52] مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم جو اس زمانے میں ہفتہ وار شیرازہ کی ادارت فرماتے تھے اور روزنامہ زمیندار کے لیے 'مطالبات' کا کالم لکھتے تھے۔

دیا۔ انھوں نے 'مطالبات' میں اس تنقید کا خوب مذاق اُڑایا۔ طارق صاحب[53] نے ریویو آف ریلیجز کے جواب میں ایک مضمون لکھا جسے لے کر وہ میرے پاس آئے تاکہ میں اسے اپنے پندرہ روزہ انگریزی پرچہ اسلام میں شائع کر دوں۔

۱۱ نومبر ۱۹۳۶ء

اسلام کے تازہ شمارے میں[54] مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق پر میرا تبصرہ شائع ہو گیا ہے۔

---

53 عبدالرشید طارق صاحب۔

54 بابت ۷ مئی ۱۹۳۶ء۔

۱۲

شاعر مشرق سے میری ملاقات*

حجاب امتیاز علی

شاعر مشرق علامہ اقبال سے میری ملاقات کو اتنا عرصہ گذر چکا ہے کہ اب اس کی تفصیلات میرے ذہن میں وضاحت سے محفوظ نہیں، وقت کی گرد نے انھیں دھندلا دیا ہے۔ تاہم چند باتیں آج بھی روزِ روشن کی طرح میری یادوں کو درخشاں کر رہی ہیں۔ یہ خوشگوار یادیں میرے بچپن کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک دفعہ ممتاز حسن صاحب نے بھی فرمایا تھا کہ میں علامہ صاحب سے اپنے بچپن کی ملاقات کے سلسلے میں کچھ لکھوں، مگر اس کا مجھے موقع نہ ملا۔

مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن نے علامہ اقبال کو پنجاب سے جنوبی ہند، چند اہم لکچرز دینے کے لیے کالے کوسوں بلایا تھا۔ اس وقت میری عمر چھوٹی تھی۔ جب میرے والد سید محمد اسمٰعیل مرحوم نے یہ مژدہ مجھے سنایا کہ علامہ صاحب آ رہے ہیں تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی، اس لیے کہ میرا تمام بچپن ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' اور ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' گاتے گزرا تھا اور میں یہ ترانہ چھ سات سال کی عمر ہی میں بہت خوشی اور ولولے سے گایا کرتی تھی اور اپنے لکھنے پڑھنے کے کمرے میں بلیک بورڈ [تختہ سیاہ] پر یہ ترانہ لکھا بھی کرتی تھی۔ اب قومی ترانے کے اس عظیم

---

* سہ ماہی اقبال، جلد ۱۷، شمارہ ۴، لاہور، بزم اقبال، اپریل ۱۹۶۹ء

شاعر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا سنہرا موقع نصیب ہو رہا تھا۔ غرض کچھ نہ پوچھیے شوق ملاقات نے مجھے کس درجے بیتاب کر دیا تھا۔ میں نے اپنے والد سے کہہ دیا تھا کہ میں علامہ کے دور قیام میں تمام وقت ان کے ساتھ رہوں گی۔ میرے والد نے مجھے سمجھایا کہ وہ ایک مقصدی سفر پر آ رہے ہیں۔ ان کا قیام بہت مختصر اور مصروف ہوگا۔ دعوتی رقعے میرے نام بھی آئے ہیں، میں تمھیں بھی ساتھ لے جانے کی کوشش کروں گا۔ اس کے باوجود میں بضد ہوئی اور جس دن علامہ مدراس پہنچ رہے تھے میں اپنے والد کے ساتھ مدراس سے ایک اسٹیشن دور ان کے استقبال کے لیے جا پہنچی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ مدراس کے اسٹیشنوں پر علامہ صاحب کے استقبال کے لیے لوگوں کا ہجوم ہوگا۔ اسٹیشن جانے سے پہلے مجھے خیال آیا کہ علامہ کے لیے کوئی تحفہ بھی لے جانا چاہیے۔ بہت سوچا کوئی چیز سمجھ میں نہ آئی۔ آخر اپنی ڈریسنگ ٹیبل [سنگھار میز] پر رکھی ہوئی ''یوڈی کلون'' [آبِ معطر] کی چھڑکاؤ کی ایک کٹ گلاس کی خوبصورت صراحی لے لی تاکہ علامہ کو تحفہ دوں۔ مگر جب میرے والد نے اسے دیکھا تو کہا کہ بھلا انھیں صراحی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ وہ ایک سنجیدہ علمی آدمی ہیں۔ کوئی تحفہ دینا ہی تھا تو پہلے سے سوچ لیا ہوتا۔ میں بہت مایوس ہوئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارا ملک (جو سچ پوچھیے تو ہمارا نہیں بلکہ برٹش [برطانوی] حکومت کا تھا) انگریزیت میں رچا بسا تھا۔ تعلیم، معاشرت، زمیں، آسمان، سبھی کچھ انگریزی ہوتا تھا۔ جب میں شاعر مشرق کے استقبال کے لیے اپنے والد ماجد کے ساتھ مدراس سے ایک اسٹیشن پہلے ''بیسن برج'' پہنچی تو میرا لباس انگریزی تھا اور جنوبی ہند میں یہ کوئی نہیں چیز نہ تھی۔ سبھی یہ لباس پہنتے تھے میرے والد بھی انگریزی سوٹ میں تھے۔ پلیٹ فارم پر ابھی ٹرین [ریل گاڑی] آئی نہ تھی اور میں شوق اور ولولے کے ساتھ اپنی تصوراتی دنیا میں

غرق تھی۔ خیال تھا صبح کا وقت ہے علامہ صاحب ایک اعلیٰ درجے کے ہلکے رنگ کے سوٹ میں ملبوس ہوں گے۔ نکٹائی بھی میچ [ملتے جلتے رنگ کی] کر کے لگا رکھی ہوگی۔ انگلیوں میں موٹا سا سگار سلگ رہا ہوگا۔

ٹرین پلیٹ فارم پر آکر رکی۔ میں اور میرے والداور والد کے چند اور دوست جو وہاں مل گئے تھے فرسٹ کلاس [درجہ اول] کے ڈبوں میں جھانک جھانک کر دیکھتے رہے مگر خلاف توقع علامہ صاحب سیکنڈ کلاس [درجہ دوم] میں تھے۔ اس وقت مجھے انتہائی حیرت ہوئی کہ اتنا عظیم آدمی اور سیکنڈ کلاس میں سفر! میں نے اپنے والد سے سرگوشی میں کہا کہ اگر کوئی انجمن مجھے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ بھیج کر بلواتی یا میں علامہ اقبال ہوتی، صاف انکار کر دیتی۔ میرے والد نے کہاکہ بڑے لوگ چھوٹی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ مگر مجھے ذہنی دھچکا لگ چکا تھا۔ ٹرین کھڑی ہوگئی اور مدراس سے ایک اسٹیشن دور ہونے کے باوجود بہت لوگ استقبال کے لیے پھولوں کے ہار لیے موجود تھے مگر اس ہجوم کو نظر انداز کرتے ہوئے شوق دید میں کمپارٹمنٹ میں چلی گئی۔ استقبال کرنے والے میزبانوں میں شہر کے کئی معززین ایسے تھے جو میرے والد کو جانتے تھے۔ انھوں نے میرے والد کا تعارف علامہ سے کروایا۔

شاعر مشرق سے میری ملاقات

شاعر مشرق نے کھڑے ہوکر ہاتھ ملائے اور رسمی باتیں کرنے لگے۔ میں ورطۂ حیرت میں غوطہ زن ایک کونے میں کھڑی انھیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی، یعنی اپنے بچپن کے گیتوں کے ہیرو کو! کیا یہی علامہ اقبال ہیں جنھوں نے ”چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا“ لکھا ہے؟ وہ نہ اعلیٰ درجے کے ہلکے رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھے نہ ان کی انگلیوں میں موٹا سا سگار

جل رہا تھا۔ انھوں نے پنجابی شلوار پہن رکھی تھی اور کرتے پر واسکٹ اور پاؤں میں دیسی جوتی جیسی کہانیوں کی کتابوں میں مَیں نے جادوگروں کو پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ بڑی حیرت ہوئی۔ میرے تصورات کی جنت پارہ پارہ ہوگئی۔ وہ خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے کے الف لیلوٰی بغداد کا ایک کردار نکلے۔ بات یہ تھی کہ میں نے پنجابی لباس کبھی دیکھا نہیں تھا، آنکھیں عادی نہ تھیں، اس لیے قبول کرنے میں کچھ دقت ہو رہی تھی۔ اور تو اور انگلیوں میں موٹے مصری سگار کی بجائے سامنے حقہ اوراس پر چلم رکھی تھی۔ ذہن کو دھچکے پر دھچکے لگ رہے تھے۔ میں انھی خیالات میں غلطاں وپیچاں تھی کہ اچانک میرے والد نے نہ جانے کیا کہہ کر میرا تعارف کروایا۔ یہ بھی کہا کہ ان کے قومی ترانے میری گھٹی میں پڑے ہیں۔ میں حیران اور ذرا شرمندہ سی ہو رہی تھی کہ اب ان سے کیا بات کروں۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ مجھے ملنے کے لیے کھڑے ہو گئے اور شفقت سے مسکراتے ہوئے مجھے بغور دیکھ رہے تھے۔ (کیا معلوم میرا انگریزی لباس ان کو اتنا ہی عجیب لگ رہا تھا جتنا مجھے ان کا پنجابی لباس اُعجوبہ معلوم ہو رہا تھا!) پھر مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ بٹھاتے ہی ایک سگریٹ کا ڈبہ کھول کر مجھے سگریٹ پیش کیا۔ اس پر میرے والد کے ایک دوست نے جو [آل انڈیا] مسلم لیگ کے ممبر تھے اور علامہ کے استقبال کے لیے آئے تھے مسکرا کر کہا ''سگریٹ؟ ابھی تو یہ سینٹ تھامس کانونٹ [عیسائی تبلیغی مدرسہ] میں پڑھتی ہیں۔'' میرے والد بھی ہنسنے لگے تھے اور میں گھبرا کر خاموش ہو گئی تھی۔ کانونٹ کا نام سن کر علامہ میری طرف متوجہ ہو گئے۔ مسکرا کر فرمانے لگے ''بتایئے، کانونٹ میں عیسائیت کا آپ نے اب تک کتنا اثر قبول کیا ہے؟'' میں نے کہا ''بہت تھوڑا سا''۔ اس پر علامہ صاحب ہنس پڑے۔ ٹرین چلنے لگی۔ اب میں نے بھی علامہ صاحب سے کچھ سوالات شروع کیے جن کی تفصیل اس وقت مجھے یاد نہیں مگر اتنا یاد ہے کہ میں نے ان سے پوچھا تھا

کہ آپ اتنے دلنشیں ترانے مثلاً ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' کیسے لکھ لیتے ہیں ؟ اس پر شاعر مشرق نے بے حد شگفتگی سے فرمایا: ''اب میں مان گیا کہ عیسائیوں کے کانونٹ کا آپ نے ذرا بھی اثر قبول نہیں کیا، جبھی تو آپ کا 'مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا' پر ایمان ہے۔ آپ کے عقائد، آپ کے طرز و ادا اور آپ کی باتوں کو سن کر میں ایک تجویز یہ پیش کرتا ہوں کہ آپ کا نام 'شیریں' ہونا چاہیے تھا''۔ پھر میرے والد کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور پوچھا: ''کیوں سید صاحب! آپ کو اس پر کوئی اعتراض ہے؟''

گفتگو یہاں تک پہنچی تھی کہ مدراس کا لمبا چوڑا اسٹیشن آ گیا۔ مجھے بہت صدمہ ہوا کیونکہ ابھی بھی میری ملاقات تشنہ معلوم ہو رہی تھی اوران سے دوبارہ ملنے کی مجھے امید نہ تھی۔ لوگ ان کے استقبال کے لیے چیونٹیوں کی طرح پر چڑھ آئے اور علامہ کو پھولوں کے ہاروں سے لاددیا۔ علامہ نے بہت سے ہار میرے گلے میں ڈال دیے۔ بعض لوگوں کو دھوکا ہوا کہ میں بھی ان کے ساتھ آئی ہوں اور مہمان ہوں۔

میرے والد نے علامہ کو خدا حافظ کہا اور جانے کے لیے مڑے مگر عین وقت پر میں نے علامہ سے پوچھ ہی لیا کہ میں دوبارہ کب ملوں۔ اس پر انھوں نے مسکرا کر کہا جس وقت آپ کا دل چاہے۔ یہ سن کر میرے والد قریب آگئے۔ انھوں نے علامہ سے کہا کہ آج سوا بجے بساٹو ہوٹل (ڈیان جیلیز ہوٹل) میں آپ کا استقبالیہ لنچ ہے۔ میں اور حجاب بھی موجود ہوں گے۔ یہ کہہ کر وہ علامہ سے ہاتھ ملا کر مڑ گئے۔ مجھے اس لنچ کی خبر نہ تھی نہ میرے والد نے ذکر کیا تھا۔ بہت ہی خوش خوش گھر پہنچی۔ اب مجھے شاعر مشرق کا لباس اور دیسی جوتیاں بری نہ لگتی تھیں کیونکہ ان کی گفتگو بہت شائستہ اور دلچسپ تھی۔

سوا بجے میں اپنے والد کے ساتھ لنچ کے لیے بساٹو ہوٹل پہنچی جو شہر کا سب سے بڑا ہوٹل سمجھا جاتا تھا۔اس زمانے میں اس کا نام ڈیان جیلیز تھا۔ظاہر ہے کہ لنچ بہت بڑا تھا۔بے شمار مسلم لیگی، شہر کے روؤسا اور بہت سے لیڈر خدا جانے کون کون شریک تھا۔لنچ سے پہلے استقبالی کمرے میں مہمانوں کا ہجوم تھا۔مجھے موقع ہی نہ ملا کہ میں علامہ کے قریب جاتی۔لیکن اتفاق کی بات کہ ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔انھوں نے وہیں سے ہاتھ ہلا کر مجھے سلام کیا۔اس وقت میں نے دیکھا کہ وہ لباس تبدیل کر چکے تھے۔اب وہ ایک ہلکے نیلگوں رنگ کے سوٹ اور کالی ٹوپی میں ملبوس تھے۔یہ دیکھ کر میں بہت خوش ہوئی کہ وہ نارمل [عام] لباس بھی پہنتے ہیں۔میرے والد تو دوستوں سے بات چیت میں لگے ہوئے تھے اور میں ایک کونے میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ نہ معلوم مجھے علامہ سے کچھ باتیں کرنے کا موقع ملے گا بھی یا نہیں۔مجھے ابھی کئی باتیں ان سے کرنا تھیں۔ایک ارادہ یہ تھاان سے کہوں کہ انگریزی کی مشہور نظم ''ہوم سویٹ ہوم، دیئر از نو پلیس لائک ہوم'' [گھر، پیارا گھر، گھر جیسی جگہ اور کہاں] جیسی ایک نظم وہ ضرور لکھیں اور اس پر یہ بھی ضرور لکھیں کہ یہ حجاب اسماعیل کی فرمائش پر لکھی گئی ہے۔(اس زمانے میں مَیں حجاب اسماعیل کہلاتی تھی۔)

کمرۂ طعام میں داخل ہوئے تو لمبی لمبی میزوں پر شراب کے گلاسوں کے پاس مہمانوں کی نشست کے لیے ان کے نام لکھے ہوئے تھے۔یہ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اب مجھے شاعر مشرق سے بات کرنے کا موقع ہر گز نہ ملے گا۔ظاہر ہے کہ مہمان خصوصی کے دائیں بائیں سر محمد عثمان یاسر سی۔حکیم جیسے بزرگ بیٹھیں گے اور نہ جانے میری نشست کا کارڈ شراب کے کس جام کے سایے تلے ہوگا؟

مہمان کارڈ دیکھ دیکھ کر اپنی نشستوں پر بیٹھنے لگے تو مجھے تشویش سی

ہوئی کہ جانے میرا کیا حشر ہو اور کہاں بٹھائی جاؤں۔ مگر میرے تعجب اور شاید کئی اور لوگوں کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب علامہ صاحب نے خود اپنے سیدھے ہاتھ کی طرف کرسی کھینچتے ہوئے میری طرف دیکھ کر فرمایا "کیا مضائقہ ہے اگر آپ یہاں تشریف رکھیں؟" مجھے معلوم تھا کہ میرے یہاں بیٹھنے سے نشستوں کی ترتیب میں بے ترتیبی ہو جائے گی، اس لیے میں ذرا تامل کر رہی تھی کہ سیٹھ حمید حسن صاحب جو منتظمین میں سے تھے مجھے کہنے لگے "چلیے چلیے، علامہ صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔" اس خلاف توقع عزت افزائی پر مجھے دلی خوشی ہوئی۔

کھانا شروع ہوا۔ علامہ صاحب میزبانوں اور دوسرے مہمانوں سے مصروف گفتگو تھے اور موقع دیکھ کر میں بھی ان سے باتیں کر رہی تھی۔ جب میرے اور علامہ صاحب کے آگے رکھے ہوئے گلاسوں میں مختلف قسم کی شراب بیروں نے ڈالنی شروع کی تو ایک بیرے سے میں نے آہستہ سے کہا : "میرے لیے لیمونیڈ [لیموں کا مشروب] لے آؤ۔" تھوڑی دیر علامہ صاحب چپ رہے پھر بولے : "آپ صرف لیمونیڈ پئیں گی؟" میں نے کہا: ہاں، میں شراب نہیں پیتی۔ آپ پی لیتے ہیں؟" ہنس کر کہنے لگے: "بالکل نہیں۔ آپ کو شاید معلوم نہیں میں نے اپنے قیام انگلستان کے دوران بھی کبھی شراب کا ایک قطرہ نہیں چکھا۔" یہ فقرہ سن کر آس پاس جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔

شام کو لالی ہال میں علامہ کی تقریر تھی جس میں مَیں بھی شریک تھی اور اس کے بعد ان کی وہاں ہونے والی ساری تقاریر میں باقاعدگی سے شریک ہوتی رہی۔

اس کے بعد ایک اور ملاقات، جو علامہ صاحب کے ہوٹل کے کمرے میں ہوئی جہاں ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، انھوں نے میرے پوچھنے پر

اپنے کچھ حالات بیان کیے جن کی تفصیل مجھے یاد نہیں۔ شمس العلما مولوی سید ممتاز علی مرحوم، تہذیب نسواں اور پھول کا بھی انھوں نے ذکر کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک لطیفہ بھی سنایا کہ تہذیب نسواں کی ایک تہذیبی بہن نے مجھے خط لکھ کر کوئی سوال کیا اور خواہش ظاہر کی کہ میں اس کا جواب ''محفل تہذیب'' کے ذریعے انھیں دوں۔ میں یہ بھی کرتا مگر مجبوری یہ تھی کہ ان کے سوال کی نوعیت کچھ ایسی تھی جس کا جواب میں نہ جانتا تھا۔ جاتے ہوئے انھوں نے کہا: ''مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ آپ ایک جوشیلی اور پر خلوص مسلمان بچی ہیں۔''

۱۳

علامہ اقبال سے ایک مختصر ملاقات*

سید مہدی حسن[1]

کچھ آٹھ برس کا زمانہ بنگلور کی تجربہ گاہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس میں گذارنے کے بعد اپنے سابقہ وطن حیدر آباد دکن واپس ہوا۔ یہ ۱۹۲۵ء کا زمانہ ہے۔ روزی کی تلاش کرتے ہوئے پتہ چلا کہ مہاراجہ سر کشن پرشاد جی سی آئی ای[2]، جو سابق مدارالمہام حیدر آباد رہ چکے تھے، ان کو ایک پرائیویٹ سیکرٹری کی ضرورت ہے جو انگریزی خط و کتابت کر سکے۔ اس خدمت کو قبول کرنا پڑا مگر شوق کی وجہ سے اپنے پرانے شغل یعنی سائنس کی خدمت جوں توں جاری رکھنی پڑی۔ جنوری ۱۹۲۶ء میں تمام ہندوستان کی سائنس کانگرس [آزمودہ علم کی مجلس] کا جلسہ لاہور میں ہونے والا تھا اور میں نے لاہور جانے کے لیے کچھ دنوں کی رخصت چاہی۔ مہاراجہ بہادر نے فرمایا جب تم لاہور جا رہے ہو تو سر محمد اقبال سے ضرور ملنا اور میرا خط دینا۔ چنانچہ جب تمام جلسے ختم ہو چکے تو میں علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا اور مہاراجہ بہادر کا خط پیش کیا۔ اس ملاقات کی اصلی گفتگو کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

---

* سہ ماہی، اقبالیات اردو، جلد ۱۰، شمار ۲، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، جولائی ۱۹۶۹ء۔

[1] ڈاکٹر سید مہدی حسن پاکستان سائنٹفک کونسل کے ممتاز رکن رہ چکے ہیں۔ [مدیر اقبالیات اردو]

[2] (GCIE) Knight Grand Commander نائٹ گرینڈ کمانڈر، برطانوی ہند کا سب سے نمایاں اعزاز تھا جسے ملکہ وکٹوریہ نے ۱۸۷۸ میں جاری کیا۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: http://en.wikipedia.org/wiki/GCIE (مرتب)

علامہ اقبال: آپ کا لاہور کس سلسلہ میں آنا ہوا؟

خاکسار: سائنس کانگرس کا جلسہ اس سال لاہور میں منعقد ہونے والا تھا اس لیے میری حاضری یہاں ضروری تھی۔

آپ کا مہاراجہ بہادر کے پاس ہوتے ہوئے سائنس سے کیا تعلق ہے؟

میری اصلی دلچسپی تو سائنس ہی سے ہے مگر روزی کے لیے مہاراجہ بہادر کے ہاں ملازمت قبول کرنی پڑی۔

جب آپ کو سائنس سے اس قدر لگاؤ ہے تو مہاراجہ کے ہاں آپ کی کیسے گذرتی ہے؟

صرف دو باتوں کی وجہ سے اچھی گزرتی ہے۔ اولاً ان کو بچے بہت پسند ہیں۔ کوئی نہ کوئی بچہ ان کے ارد گرد ہر وقت موجود رہتا ہے۔ مجھے خود بچے بے حد عزیز ہیں اور اسی طرح سے میرے والد کو بھی (جو اس وقت باحیات تھے) گویا یہ بات میرے خون میں ہے۔ دوسری بات جس کا مجھے کبھی خیال بھی نہیں آ سکتا تھا وہ تصوف ہے۔ میں ایک شیعہ گھرانے کا فرد ہوں۔ صوفیوں کا ذکر گاہے بگاہے سنا کرتا تھا۔ مگر مہاراجہ کے پاس ہر روز اسی کا چرچا رہتا ہے اور میرا دل خواہ مخواہ ان باتوں کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اس لگاؤ کا مجھے کبھی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ بات سننی تھی کہ حضرت اقبال نے ایک تقریر شروع کی۔ کچھ مضمون کی برکت کچھ ان کے کلام کی برکت تھی کہ مجھ پر ایک وجد کی سی حالت طاری ہوئی جس کا اثر یہ ہوا کہ بقول ایک شاعر:

کیا اس نے کہا تھا یہ مجھے کچھ یاد نہیں ہے

اس مختصر قصہ کا تذکرہ ایک دن محبی بشیر احمد ڈار صاحب سے ہوا۔ ان

کے دوبارہ ارشاد پر ناظرین کی خدمت میں بھی پیش ہے۔

۱۴

اقبال کی صحبت میں ذکر غالب*

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی[1]

---

* سہ ماہی، اقبالیات اردو، جلد ۱۰، شمار ۲، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، جولائی ۱۹۶۹ء۔

[1] محمد عبداللہ چغتائی کی علامہ اقبال کے بارے میں دیگر تخلیقات کے لیے دیکھئے:
محمد عبداللہ چغتائی، ''اقبال اور سید سلیمان ندوی''، مشمولہ، گوہر نوشاہی، مرتبہ، مطالعۂ اقبال، لاہور، بزم اقبال۔ [۱۹۷۱ء]؛____، ''اقبال کا گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلق''، مشمولہ، طاہر تونسوی، مرتبہ، حیاتِ اقبال، مکتبۂ عالیہ، ۱۹۷۷ء؛ ____، ''اقبال کا جنوبی ہند کا سفر''، سید عبداللہ، مرتبہ، متعلقاتِ خطباتِ اقبال، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۷ء؛ ____، ''اقبال کا نظریۂ تعلیم''، بیادِ اقبال، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، [۱۹۷۷ء]؛____، ''علامہ اقبال''، مشمولہ، عرش صدیقی + اے بی [احمد بختیار] اشرف، مرتبین، اقبال اور قائداعظم، ملتان، بہاؤالدین زکریا یونی ورسٹی، [۱۹۷۸ء]؛____، ''لاہور میں علامہ اقبال کی قیام گاہیں''، مشمولہ، یونس جاوید، مرتبہ، صحیفۂ اقبال، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۸۶ء؛ ____، ''اقبال کا نظریۂ فنِ تعمیر کے بارے میں''، مشمولہ، یونس جاوید، مرتبہ، اقبالیات کی مختلف جہتیں، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۸۸ء؛ ____، مترجم ''پیامِ مشرق از آر اے نکلسن''، مشمولہ، محمد اکرام چغتائی، مرتبہ، اقبال اور گوئٹے، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان بہ اشتراک علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، ۲۰۰۱ء۔

اقبال اور غالب کے بارے میں مزید جاننے کے لیے دیکھئے:
''غالب، پیش رو اقبال''، سید عبداللہ، مشمولہ مقاماتِ اقبال، لاہور، ناشرین، ۱۹۵۹ء؛ فرمان فتح پوری، ''اقبال اور غالب''، مشمولہ، اراکین بزم اقبال، مرتبین، نذرِ اقبال (مضامین یومِ اقبال)، کراچی، سندھ مسلم کالج، ۱۹۶۶ء؛ ''اقبال اور غالب''، مشمولہ، رشید احمد صدیقی، اقبال؛ شخصیت اور شاعری، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۶ء؛ ''غالب اور عظمتِ آدم''، مشمولہ قدر امتیاز، اقبال اور عظمتِ آدم، حیدر آباد دکن، شالی مار پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء؛ محمد دین تاثیر، ''غالب اور اقبال، ایک شعر کی شرح''، اقبال، فکر و فن، مرتبہ، افضل حق قرشی، لاہور، فیب پبلی کیشنز، ۱۹۷۷ء؛ ''غالب''، مشمولہ، عبدالشکور احسن، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۷ء؛ ''علامہ اقبال اور مرزا غالب''، مشمولہ، محمد منصور، علامہ

اقبال کی فارسی غزل. کراچی، ایوانِ اردو،۱۹۷۷ء ؛ کے این سود، ''غالب کے سوانح اور ان کی شاعری پر تبصرہ، غالب کی منتخب غزلوں کاترجمہ''، سلیکشنز فرام غالب اینڈ اقبال [منتعباتِ غالب و اقبال]، دہلی، سٹرلنگ پبلشر، ۱۹۷۸ء؛ حامدی کاشمیری، اقبال اور غالب، سری نگر،ادارۂ ادب، ۱۹۷۸ء؛ عبدالمغنی، ''اقبال اور غالب''، مشمولہ، طاہر تونسوی، مرتبہ، اقبال اور مشاہیر، لاہور، سنگ میل، ۱۹۷۸ء ؛ ''غالب اور اقبال''، اسلوب احمد انصاری، نقش اقبال. دہلی، مکتبۂ جامعہ، ۱۹۷۹ء؛ یوسف حسین خاں، غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات، دہلی ،غالب اکیڈمی،۱۹۷۹ء؛ حامدی کاشمیری، ''اقبال اور غالب ، صوفیانہ فکر کا مطالعہ''، مشمولہ، آل احمد سرور ، اقبال اور تصوف، سری نگر، اقبال انسٹی ٹیوٹ،کشمیر یونی ورسٹی، ۱۹۸۰ء ؛ ''اقبال اور غالب، صوفیانہ فکر کا مطالعہ''، مشمولہ، حرفِ راز، دہلی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۳ء؛ ''غالب اور اقبال کا تقابلی مطالعہ''، مشمولہ، اے بی اشرف، غالب اور اقبال ، ملتان، بیکن بکس، ۱۹۸۸ء؛ منظور حسین بھٹی، ''اقبال اور غالب''، مشمولہ، بیدار ملک، مرتبہ، اقبال شناسی اور افشاں ،نظر ثانی، محمد عبداللہ قریشی، لاہور ، بزم اقبال، ۱۹۸۸ء؛ محمد علی صدیقی،''غالب اور اقبال، ایک تقابلی مطالعہ''، مشمولہ، سلیم اختر، مرتبہ، اقبال شناسی اور فنون، لاہور، بزمِ اقبال، ۱۹۸۸ء ؛ وارث کرمانی،''غالب اور اقبال کی فارسی غزلوں کا موازنہ''، مشمولہ، اقبال اور غزل، سری نگر ، اقبال انسٹی ٹیوٹ ، ۱۹۸۸ء ؛ ادیب سہیل،''غالب ، اقبال اور بیدل''، مشمولہ، انور سدید ، مرتبہ، اقبال شناسی اور اوراق، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۸۹ء؛ ''اقبال اور غالب کے ذہنی رشتے''،مشمولہ، عبدالحق ، فکر اقبال کی سرگذشت، جون پور، صائمہ حق و شفا حق، ۱۹۸۹ء ؛ ''موازنۂ اقبال و غالب''، رفیع الدین ہاشمی، مرتبہ، تنویرِ اقبال، لاہور، مکتبۂ تعمیر انسانیت، ۱۹۹۰ء ؛ خلیق انجم، ''غالب اور اقبال کی مکتوب نگاری''، مشمولہ، آفاق احمد، مرتبہ، بیاںہ مجلسِ اقبال. حصہ سوم. بھوپال، کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز، ۱۹۹۳ء؛ یوسف حسین خاں،''غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات''، مشمولہ، بشیر فاروق،مرتبہ، دگر دانائے راز آید کہ ناید، کراچی، فاروق اکیڈیمی، ۱۹۹۳ء؛ عبدالمجید خان ساجد، ''اقبال اور بعض شاعر (حافظ۔ رومی۔ بیدل۔ غالب۔ اکبر۔ حالی۔ گرامی)''، اقبال. حیات عصر. ملتان،ادارہ تحقیق و ادب۔۱۹۹۴ء؛ وقار عظیم، ''اقبال پر غالب کا اثر اور ان کی گرفت ،تبصرہ : ترجمانِ اسرار (جسٹس ایس اے رحمان)''، مشمولہ، سید معین الرحمٰن، جہانِ اقبال، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۷ء؛ عبدالحق،''اقبال اور غالب شناسی''، مشمولہ، اقبال کی شعری و فکری جہات، دہلی ، دہلی یونی ورسٹی، ۱۹۹۸ء ؛ شاہ ولی الرحمٰن ولی، ''غالب اور اقبال''، مشمولہ،یونس جاوید، مرتبہ، غالب. اقبال اور ٹیگور. پٹنہ ،خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری،۱۹۹۹ء ؛ ''اثرات: عصری تناظر: (مولانا روم۔ غالب۔ نطشے)''،منظر اعجاز ، اقبال .عصری تناظر. مظفر پور (بہار) ،مکتبہ انعکاس، ۲۰۰۰ء: خلیق انجم،'' غالب اور اقبال''، مشمولہ، بیاںہ مجلسِ اقبال. حصہ ہشتم، بھوپال، علامہ اقبال ادبی مرکز، ۲۰۰۱ء؛ ''اقبال و غالب' ایک تقابلی جائزہ''، محمد علی صدیقی، تلاش اقبال، کراچی، پاکستان سٹڈی سنٹر جامعہ کراچی، ۲۰۰۲ء؛ شیلا میکڈونو،''غالب اور اقبال''، مشمولہ، محمد اکرام چغتائی، مرتبہ، اقبال: نیوڈائمینشنز[اقبال: نئی جہات]، لاہور، سنگِ میل، ۲۰۰۲ء؛

۱۹۲۶ء میں پروفیسر محمد دین تاثیر مرحوم کی ترغیب و مشورہ سے یہ طے پایا کہ عبدالرحمان چغتائی دیوان غالب کا ایک مصور ایڈیشن شائع کریں گے، جس کے لیے تمام انتظامات بھی اعلیٰ معیار پر کئے گئے تھے۔ اُردو دیوان کے متن کو خطی اور مطبوعہ نسخوں سے مقابلہ کر کے مرتب کیا گیا تھا اور منتخب شدہ تصاویر کو یورپ کی اعلیٰ فرموں سے اپنے اصلی رنگوں میں طبع کیا گیا تھا۔ اس اثناء میں ہم اکثر علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کو کام کی رفتارِ اشاعت سے باخبر رکھتے تھے اور وہ نہایت شوق اور حوصلہ افزائی سے دلچسپی لیتے تھے۔

عبدالرحمان چغتائی کی تجویز پر یہ طے ہو چکا تھا کہ اس کتاب میں ڈاکٹر ہنری کوزنز کا انگریزی زبان میں ایک مقدمہ ہوگا جس کے لیے خود چغتائی صاحب نے ڈاکٹر موصوف سے ان کو مدراس لکھ کر درخواست کی تھی۔ وہ ہندوستان میں اس وقت جدید مصوری کے محقق شمار ہوتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے وہ مقدمہ لکھ کر ارسال کر دیا۔ جب تاثیر صاحب نے دیکھا تو معاً خیال کیا کہ اس کے ساتھ انگریزی زبان میں ایک 'پیش لفظ 'اسلامی نقطہ نگاہ سے بھی شامل ہونا چاہیے۔ آخر کافی بحث و تمحیص کے بعد یہ

عبدالحق، اقبال کی غالب شناسی، مشمولہ، بیابہ مجلسِ اقبال. حصہ دہم. علامہ اقبال ادبی مرکز، ۲۰۰۳ء؛ ''اقبال کی نظم ''مرزا غالب'' دو شعروں کا تخلیقی محرک''، ''تنقید غالب میں اقبال کا حصہ''، مولانا صبغتہ اللہ بختیاری ، اقبال' نئی تفہیم، لاہور، سنگ میل، ۲۰۰۳ء ؛ ''مرزا غالب''، خواجہ طارق محمود، پونیورسٹی آف علامہ اقبال، نئی دہلی، ستار پبلی کیشنز، ۲۰۰۴؛ آفتاب احمد، میر. غالب اور اقبال، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء؛ ''غالب اور گوئٹے''، سید محمد اکرم ''اکرام''، اقبال' ایک تحریک، لاہور، شعبہ اقبالیات پنجاب یونی ورسٹی، ۲۰۰۴ء ؛ ''اقبال اور غالب''، سید شبیر احمد بخاری، کلامِ اقبال کے اعلام و مشاہیر. سری نگر، سن رائز پرنٹرز، ۲۰۰۸ء؛ عبدالوہاب سوری، ''فکر اقبال پر غالب شرح و توجیہ کے بظاہر اُنحل دائروں کو سمجھنے کی ایک تنقیدی کاوش''، مشمولہ، ایم ایچ قاضی، ریویزننگ اقبال، ہائیڈل برگ، دروپدی ورلج، ۲۰۱۰ء۔

طے پایا کہ علامہ اقبال سے درخواست کی جائے کہ وہ اس پر ایک 'پیش لفظ' تحریر کریں جس کے لیے ہم اگلے روز بعد دوپہر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ گفتگو کی ابتدا میں نے تیاری اشاعت کے ذکر سے کی اور تاثیر مرحوم نے ڈاکٹر کوزنز کے مقدمے کا ذکر کیا اور ساتھ ہی آپ سے ایک تعارف نامہ لکھنے کی درخواست بھی کی۔ اس ضمن میں پروفیسر تاثیر نے اس وقت کے دیگر ہندوستانی مصوروں کے کارناموں کا بھی ذکر کیا، جن میں خاص کر بنگال اسکول کے مصوروں کا کام اس سے قبل متعارف ہو چکا تھا۔ اس امر نے علامہ کو مطمئن کر دیا تھا کہ یہ ضرور ہونا چاہیے۔ چنانچہ آپ نے وعدہ کر لیا، اگرچہ آپ کے لیے یہ ایک بالکل نیا موضوع تھا۔

علامہ اقبال مرحوم کا یہ قاعدہ تھا کہ جس نظم یا تحریر کو لکھنا ہوتا تھا وہ اس کے لیے ہر وقت دماغی طور پر کوشاں رہتے اور ذہنی طور پر کام کرتے رہتے۔ انھوں نے مجھ سے اس موضوع پر اس کے بعد اکثر گفتگو بھی کی اور خاصی دلچسپی اور توجہ کا اظہار فرمایا۔ چنانچہ انھوں نے اس اثناء میں ایک خط کے ذریعے بنگال اسکول کے نمونوں کو دیکھنے کی خواہش بھی کی۔ آپ کا وہ خط ملاحظہ ہو:[2]

۷ ستمبر ۲۶ء

ڈیئر ماسٹر صاحب![3]

السلام علیکم!

اگر آپ کے پاس ہندوستانی مصوروں کی بنائی ہوئی تصویروں کا کوئی چھپا ہوا مجموعہ ہو تو ایک دو روز کے لیے مرحمت کیجیے۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔

---

2 شیخ عطا اللہ، مرتبہ، اقبال نامہ، جلد دوم، لاہور، [شیخ محمد اشرف]، ۱۹۵۱ء، ص، ۳۳۱-۳۳۲۔

3 علامہ اقبال عموماً راقم کو 'ماسٹر' کے لفظ سے خطاب کرتے تھے۔

اگر ایسا کوئی مجموعہ نہ ہو تو چند مشہور تصاویر کے نام ہی سہی۔ ان کے ساتھ ان کا مضمون بھی ہونا ضروری ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستانی مصور بالعموم کیسے مضامین اپنے فن کی نمائش کے لیے منتخب کرتے تھے۔

بنگال اسکول کی تصاویر کے نام خاص کر چاہئیں۔ اس کے علاوہ مغلوں کے آرٹ پر اگر کوئی کتاب ہو تو وہ بھی ساتھ لائیے۔

محمد اقبال

میں اس خط کے وصول ہونے کے بعد آپ کی خدمت میں چیئر جی ایلبم کے چند حصے اور بعض دوسری کتابیں لے کر حاضر ہو گیا۔ اگرچہ بادی النظر میں یہ موضوع آپ کے لیے بالکل نیا بلکہ غیر معروف تھا مگر آپ نے وہ مقدمہ اپنے انداز میں ثقافت اسلامی کے محقق کی حیثیت میں انگریزی میں لکھا۔ میرا خیال ہے کہ فنونِ لطیفہ کی تاریخ میں آج تک کسی نے اس طرح کا نہ کوئی تعارف نامہ لکھا ہے اور نہ اسلامی مصوری کی کسی نے اس طرح تعبیر کی ہے۔

کچھ مدت کے بعد ایک روز پھر ہم سب مل کر علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو مصور مرقع چغتائی پر گفتگو ہوئی۔ چند اشعار زیر بحث تھے جس پر تصاویر بھی موافقت کرتی تھیں۔ مگر علامہ نے ان اشعار پر کچھ مزید دلچسپی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ غالب کے ان اُردو اشعار کی بجائے غالب کے فارسی اشعار یا فارسی کلام کو مصور کرنا چاہیے جو معانی کو زیادہ واضح کرتے ہیں۔ اس موقع پر مجھے یاد آتا ہے غالب کے اپنے اشعار کو بطور تائید پیش کیا گیا تھا۔

فارسی بین تا بہ بینی نقشہائی رنگ رنگ

بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگ من است[4]

لیکن مرحوم تاثیر نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ یہاں اب ماحول کا تقاضا یہ ہے کہ اُردو کلام غالب کو ہی پیش کیا جائے جس پر علامہ مرحوم نے بھی اطمینان کا اظہار کیا اور ویسے تمام انتظامات بھی اسی نظریے سے کیے گئے تھے۔ مگر معانی اور مطالب کے اعتبار سے علامہ نے یہ بھی کہا کہ فارسی اشعار کو بھی دوش بدوش آنا چاہیے۔

اس بحث نے ایک اور صورت اس نہج پر اختیار کی کہ غالب کے بعض اُردو اشعار واقعی بہت ہی بلند پایہ ہیں اس لیے اس کے اُردو کلام کا ایک انتخاب بھی ہونا چاہیے جس پر پھر ہم سب نے تاثیر کی ہمنوائی کرتے ہوئے عرض کیا کہ آپ نے خود بھی تو غالب کی شان میں اپنے ابتدائی سالوں میں اس کے اُردو کلام سے ہی متاثر ہو کر ایک اعلیٰ نظم بعنوان 'مرزا غالب' لکھی تھی۔[5]

اس روز علامہ کے ہاں یہ طے ہو گیا تھا کہ غالب کے اُردو کلام کا ایک اعلیٰ انتخاب ہونا چاہیے جو علامہ کی پسند کے مطابق ہو۔ اول تاثیر صاحب خود تیار کریں گے اور علامہ کی پسند کے مطابق نشان کر دیں گے اور جو

---

[4] ترجمہ:

فارسی پڑھ کہ رنگ رنگ کے نقش نظر آئیں
میرے اردو مجموعے کو چھوڑ کہ یہ تو بے رنگ ہے

مترجم: محمد سہیل عمر

[5] محمد اقبال، [کلیات اقبال (اردو)، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، 2007ء، ص 55] بانگ درا، ص ۹، ۱۰۔ یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ تاثیر مرحوم نے علامہ کے ہاں اس روز اس بحث سے متاثر ہو کر غالب کے تمام اردو دیوان کا ایک انتخاب کر ڈالا تھا جس کا قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ میرے نزدیک تاثیر کلام غالب کا حافظ تھا۔

چغتائی کے مصور نسخے کا ضمیمہ ہوں گے۔

ہم اس مجلس سے تمام اُمور پر طویل گفتگو کرنے کے بعد اُٹھ کر جانے ہی والے تھے کہ اتنے میں پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم بھی علامہ کے ہاں تشریف لے آئے، جن کو غالب کے مصور اُردو دیوان کی تیاری کا بھی علم تھا۔اور پھر علامہ نے آپ کو موضوع گفتگو سے آگاہ کر دیا۔ بہرحال ہم چلے آئے۔ ہماری غیر حاضری میں پروفیسر شیرانی اور علامہ کے درمیان اسی موضوع پر دیر تک علمی گفتگو رہی جس کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ شیرانی صاحب اس سے اگلے روز ایک مضمون غالب کے فارسی اور اُردو ہم معنی اشعار پر لکھنے کی طرف متوجہ نظر آئے اور وہ اسلامیہ کالج کے اسٹاف روم میں اس موضوع پر علامہ کے حوالے سے بعض اساتذہ سے گفتگو کر رہے تھے۔ چنانچہ شیرانی صاحب نے چند دنوں میں ہی ایک مستند محققانہ مضمون اس نہج پر لکھا جو اسلامیہ کالج کے میگزین کریسینٹ میں یا امرتسر کے ماہوار رسالہ غالب میں طبع ہو گیا تھا۔ اس مضمون کا دُور دُور تک تذکرہ بھی علمی احباب میں ہوا تھا۔

غالب کے ضمن میں یہ بیان کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب یورپ کی پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء) کے دوران سیاسی طور پر ضرورت محسوس کرتے ہوئے پنجاب یونیورسٹی میں ایم۔اے فارسی کا امتحان رائج کیا گیا تو علامہ اقبال کے مشورے سے ہی اس کا نصاب مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے پرچۂ نظم میں خصوصیت سے غالب کے فارسی کلام کے بعض حصوں کو شامل کیا گیا تھا۔ ۱۹۲۱ء کے بعد شیرانی صاحب لاہور آ چکے تھے اور ان کو سر عبدالقادر اور مولوی محمد شفیع کی تحریک سے اسلامیہ کالج میں استاد مقرر کر دیا گیا تھا۔ وہ یہ پرچہ خصوصیت سے پڑھاتے تھے۔ اور اس پرچہ کے ممتحن

بھی قواعد جامعہ پنجاب کے مطابق علامہ اقبال اور شیرانی صاحب ہی تھے۔ عام طور پر یہ ضرورت محسوس کی جاتی تھی کہ غالب کے فارسی کلام مشمولہ نصاب ایم۔اے کی کم سے کم طلباء کی افادیت کے لیے شرح ہو جائے مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔

حسن اتفاق سے انہی ایام میں، میں اور شیرانی صاحب ایک روز گھومتے ہوئے شیخ مبارک علی کی دوکان، اندرون لوہاری دروازہ پہنچ گئے۔ وہ ان دنوں اپنی موجودہ دوکان کے متصل ہی ایک چھوٹی سی کرایہ کی دوکان میں کاروبار کرتے تھے۔ ان سے برسبیل تذکرہ فارسی دیوان غالب کا ذکر ہوا۔ چونکہ شیرانی صاحب اسے پڑھاتے تھے اس لیے شیخ مبارک علی نے فوراً ان سے غالب کے فارسی دیوان کی شرح کے لیے درخواست کی۔ ادھر شیرانی صاحب بھی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے مان گئے۔ شیخ مبارک علی نے فوراً اپنی جیب سے سو سو کے دو نوٹ بطور پیشگی ان کی نذر کیے۔ شیرانی صاحب نے ان سے فرہنگ انند راج طلب کی۔ شیخ صاحب نے اس کی تینوں جلدیں پیش کر دیں جس کو میں نے بغل میں دبایا اور گھر واپس آ گئے۔ مگر شیرانی صاحب عدیم الفرصتی کے باعث یہ کام سر انجام نہ دے سکے اور انھوں نے کچھ عرصے بعد شیخ مبارک علی کی خدمت میں دو سو روپے مع قیمت کتاب فرہنگ انند راج واپس کر دیے۔

تاثیر صاحب کا تیار کردہ انتخابِ کلامِ غالب تیار ہو چکا تھا۔ چنانچہ میں وہ لے کر اقبال کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ آپ کا عموماً یہ قاعدہ تھا کہ ہر علمی کام کو فوراً اولین فرصت میں ہی انجام دینے پر تیار ہو جاتے تھے۔ چنانچہ آپ نے فوراً مجھ سے پنسل لے کر ان تمام اشعار کو دیکھنا شروع کر دیا اور ان پر اپنی پسند کے مطابق نشان کرتے گئے اور نشان لگا کر اس کاپی

کو میرے حوالے کر دیا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ میرے نزدیک قابل انتخاب یہ چند اشعار ہیں۔ میں آپ سے اجازت لے کر وہ کاپی لے کر گھر واپس آ گیا۔ تاثیر صاحب وہاں موجود تھے۔ وہ حیران رہ گئے کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ علامہ شاید زیادہ وقت لیں گے۔ تاثیر کے مشورے سے فوراً مرقع چغتائی کے ضمیمہ کے طور پر اس انتخاب کو الگ اس عنوان سے کاتب منشی اسد اللہ[6] نے لکھا جنھوں نے مرقع چغتائی کا تمام متن لکھا تھا۔ اس عنوان انتخاب کے نیچے ''از شاعر مشرق علامہ اقبال'' بغیر علامہ کو اطلاع دیے چھاپ دیا گیا۔ چھپنے کے بعد خیال ہوا کہ ہمیں اس سے پیشتر علامہ سے مشورہ کر لینا چاہیے تھے۔ چنانچہ میں وہ مطبوعہ ورق انتخاب اسی طرح لے کر علامہ کے ہاں گیا۔ یہ قریب دس اور گیارہ بجے کے درمیان کا وقت تھا۔ آپ کھانا تناول فرما رہے تھے اور ان کے پاس کالج کے ایک پروفیسر بھی موجود تھے۔ میں نے وہ مطبوعہ ورق ان کے سامنے رکھ دیا۔ علامہ نے دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں کہا کہ میں نے کب کہا تھا کہ اس طرح میرا نام بھی چھاپ دیا جائے۔ اس وقت اس پروفیسر نے بھی ہمارے اس عمل کے خلاف خاصہ مہمیز کا کام کیا۔ مگر میں فوراً وہ ورق اپنے ہاتھ میں لے کر گھر واپس آ گیا۔ میں نے آ کر یہ تمام حقیقت عبدالرحمٰن چغتائی کی خدمت میں بیان کر

[6] منشی محمد اسد اللہ سے میں اکتوبر ۱۹۵۰ء میں ملا تھا۔ اس وقت آپ کی عمر ۸۲ سال تھی۔ آپ کی پیدائش ۱۸۷۰ء میں اوناؤ اودھ میں ہوئی تھی۔ آپ ۱۸۹۰ء سے لاہور میں کتابت کے سلسلے میں مقیم تھے اور ہزارہا کتابیں، رسائل اور تحریریں آپ کی مرہونِ منت ہیں۔ آپ کا بڑا لڑکا مولوی سمیع بھی آپ کی روش پر اعلیٰ کاتب تھا۔ یہ خاندان لاہور میں بازار سریاں والا طویلہ شاہ نواز کے قریب مقیم رہا۔ سمیع اللہ نے سالنامہ کاروان اور روئیداد ادارہ معارف اسلامیہ کی کتابت خاص طور پر کی تھی۔ غرض کہ متن غالب یعنی مرقع چغتائی کی کتابت تمام تر آپ نے ہی کی تھی۔ نہایت مخلص اور شریف انسان تھے۔ تھوڑا عرصہ ہوا قریب ایک سو سال عمر گزارنے کے بعد آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

دی۔اس نے فوراً ایک اور منقش ڈیزائن اس متنازعہ عبارت پر شام سے پیشتر چھاپ دیا جس سے وہ متذکرہ بالا عبارت محو ہو گئی۔شام کو اسی روز میں وہ مطبوعہ ورق لے کر علامہ کے ہاں ان کی تسلی کے لیے لے گیا اور نہایت معذرت کے ساتھ پیش کیا جس پر آپ مطمئن ہو گئے۔

مرقع چغتائی کے پہلے ایڈیشن میں جس کی قیمت ایک سو دس روپے رکھی گئی تھی یہ ڈیزائن انتخاب کے تحت تو ضرور ہے مگر مرقع چغتائی کے ارزاں اور نقش چغتائی وغیرہ میں ضمیمہ انتخاب میں یہ ڈیزائن نہیں ہے۔ویسے یہ انتخاب علامہ اقبال کا متذکرہ بالا بیان کے مطابق کیا ہوا ہے۔

جب مرقع چغتائی اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ دوبارہ شائع ہو گیا تو مصور چغتائی نے نہایت احتراماً اس کا وہ نسخہ آپ کی خدمت اقدس میں پیش کیا جس کی مثل محض ایک درجن نسخے خاص طور پر بڑے سائز اور مخملی چمڑے کی جلد سے تیار کیے گئے تھے۔[7] آپ نے اپنی عادت کے مطابق اسے قبول تو کر لیا مگر اس وقت کہہ دیا تھا کہ مجھے کوئی معمولی سا سستا ایڈیشن اس کی بجائے دے دیں۔چنانچہ وہ مجھے اپنے ایک خط[8] میں بھی لکھتے ہیں:

---

[7] یہاں یہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مصور چغتائی کا تعارف سر اکبر حیدری فنانس ممبر حیدر آباد دکن سے علامہ اقبال کی معرفت لاہور میں ہو چکا تھا، جب وہ اس سے پیشتر یہاں تشریف لائے تھے۔مصور نے آپ سے علامہ اقبال کے حوالے سے ہی حضور نظام حیدر آباد دکن سے مرقع چغتائی کے معنون کرنے کی درخواست کی تھی جس کی پذیرائی ہو گئی تھی۔چنانچہ مرقع چغتائی کے قریب پچاس نسخے نظام گورنمنٹ نے اپنے سر رشتہ تعلیم کی معرفت حاصل کیے تھے اور اس کے علاوہ وہ تمام اصل تصاویر بھی جو مرقع چغتائی میں شامل تھیں، ان کو الگ ایک گراں قدر رقم سے دہلی محل کے لیے حاصل کر لیا تھا اور ایک نسخہ خاص جو حضور نظام کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا، اس طرح کے قریب ایک درجن نسخے خاص طور پر تیار کیے گئے تھے جن میں سے ایک نسخہ وہ تھا، جو علامہ اقبال کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔

[8] شیخ عطا اللہ، کتاب مذکور، جلد دوم، ص ۳۲۷۔

۲۳ اکتوبر ۱۹۲۹ء

ڈیئر ماسٹر عبداللہ!

مرقع چغتائی کی ایک کاپی جو عبدالرحمان صاحب نے بھیجی ہے، مجھے مل گئی ہے۔ مگر یہ کتاب بیش قیمت ہے۔اس واسطے میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کی جگہ دوسری ایڈیشن کی کاپی ہدیۃً مجھے دے دیں اور اس کو اپنے مصرف میں لائیں۔۔

محمد اقبال

ایک دن بنگلور سے ایک خاتون اقبال النساء حسن علامہ سے ملنے تشریف لائیں۔ اس سے پہلے بنگلور میں بھی تعارف ہو چکا تھا۔ وہ بنگلور میں کسی زنانہ کالج میں معلّمہ تھیں۔ چند علمی امور پر گفتگو ہوئی۔ غالب کے ذکر پر علامہ نے اپنا وہ متذکرہ بالا نسخہ مرقع چغتائی آپ کی نذر کر دیا۔ جب خاتون نے اس پر آپ سے ہدیہ لکھنے کی درخواست کی تو علامہ نے مجھے کہا کہ تم چند الفاظ لکھ دو جو میں نے 'بخدمت اقبال النساء حسن' کے عنوان سے لکھ دیے تھے۔

۱۵

حیات اقبال کا ایک گوشہ پنہاں*

حضرت خواجہ احمد الدین اور علامہ اقبال رحمہما اللہ

عرشی امرتسری[1]

مولانا مرحوم کے انتقال کی خبر میں نے اخبارات میں دیکھی۔ خدا تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔

اس زمانے میں ان کا دم غنیمت تھا، ایسے عالم باعمل روز روز نہیں پیدا ہوتے۔

(حضرت خواجہ [احمد الدین] کی وفات پر علامہ [اقبال] کا مکتوب بنام عرشی[2])

مئی ۱۹۷۳ء کا آخری اتوار صبح سے شام تک سمن آباد (لاہور) میں گزرا۔ ناشتے سے قبل ہی صوفی تبسم صاحب کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے درمیان میں پرانے وقتوں کی صحبتوں کا ذکر آ گیا۔ میں اسی مقصد کے لئے حاضر ہوا تھا۔ میرے ایک سوال کے جواب میں صوفی صاحب نے انکشاف کیا کہ علامہ اقبال ماہنامہ بلاغ (امرتسر) کے باقاعدہ مطالعہ کی وجہ سے حضرت خواجہ احمد الدین کے غیر معمولی قرآنی مطالعہ و تدبر و تعمق سے خوب واقف

---

* سہ ماہی، اقبالیات اردو، جلد ۱۵، شمار ۲، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، جولائی ۱۹۷۴ء۔

[1] عرشی امرتسری کی علامہ اقبال کے بارے میں تصنیف کے لیے دیکھیے:
عرشی امرتسری، اقبال۔ پیامبر امید، مرتبہ، تصدق حسین راجا، لاہور، فیروز سنز پبلشرز، ۱۹۹۰ء۔

[2] خط ۱۴، مشمولہ، شیخ عطاء اللہ، اقبال نامہ، حصہ اول، لاہور، شیخ محمد اشرف، 1944، ص ۳۰۔

تھے۔علامہ اپنے ایک مکتوب (بنام صوفی تبسم) میں تحریر فرماتے ہیں:

...مجھ کو ان کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی تھی، کیا اچھا ہو کہ وہ شریعت محمدیہ[ﷺ] پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں جس میں 'عبادات' و 'معاملات' کے متعلق[3] صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو۔ 'معاملات' کے متعلق خاص طور پر اس قسم کی کتاب کی آج کل شدید ضرورت ہے۔ ہندوستان میں تو شائد اس کے مقبول ہونے کے لیے مدت درکار ہے۔ ہاں دوسرے اسلامی ممالک میں اس کی ضرورت کا احساس ہر روز بڑھ رہا ہے... غرض کہ مولوی صاحب موصوف یا اُن کے رُفقاء کو جو کلام الٰہی اور مسلمانوں کے دیگر مذہبی لٹریچر پر عبور رکھتے ہیں اس طرف توجہ کرنی چاہیے۔

میں اور مجھ ایسے اور لوگ صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں۔ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ رسالہ[4] بلاغ، امرتسر کے ہر نمبر میں اور مولوی حشمت علی کے رسالہ[5] اشاعة القرآن کے ہر نمبر میں اسی پر بحث ہوتی ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سعادت انسانی کے لیے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔

نیز جو قواعد (عبادات یا معاملات، بالخصوص موخر الذکر) کے متعلق دیگر اقوام میں اس وقت مروج ہیں، اُن کا قرآنی نقطۂ نگاہ سے استقصا کیا جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور اُن پر عمل کرنے سے نوع انسانی کبھی سعادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص

---

3 'صرف قرآن' کی شرط قابل توجہ و مزید تحقیق ہے۔

4 خواجہ صاحب اور ان کے رُفقاء اس علمی و دینی پرچہ کو نکالا کرتے تھے اور حضرت علامہ اس کا باقاعدہ مطالعہ کرتے تھے۔

5 یہ پرچہ مولوی حشمت علی صاحب کے شاگرد رشید مولانا عبداللہ چکڑالوی نکالا کرتے تھے۔یہ پرچہ جماعت 'اھل قرآن' کا نقیب تھا۔

اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے جورس پروڈنس (Jurisprudence) (قانونی تعزیرات) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا مجدد اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم ہوگا۔افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانے کے مزاج سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکام قرآنی کا ہی منکر ہے۔عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں، میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابو حنیفہ کا نظیر ناممکن ہے۔

غرض کہ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری رائے ناقص میں مذہبِ اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر پرکھا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

مخلص

محمد اقبال[6]

علامہ کے اس خط سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ نہ صرف راجہ

---

[6] [شیخ عطاء اللہ]، اقبال نامہ: جلد اول، خط ۴۸-۱۹۔اس مکتوب کے متعلق ایک لطیفہ ہے کہ جب یہ مکتوب پہلی مرتبہ شائع ہوا تو چوں کہ اس کی تمہید میں علامہ نے خواجہ کے مقابلہ میں اپنی مذہبی واقفیت کے نہایت محدود ہونے کا اعتراف کیا تھا اس لیے علامہ کے دوست میاں محمد حسین مرحوم نے اس کو جعلی قرار دیا، ان کے خیال میں ایسا اعتراف علامہ کی عظمت کے منافی تھا۔پھر جب صوفی صاحب نے اصل خط کا فوٹو چھپوا دیا تو محمد حسین کے لیے مفر نہ رہا۔اس کے بعد جب صوفی صاحب کی ان سے بالمشافہ ملاقات ہوئی تو صوفی صاحب نے ان سے کہا: اگر بلا تحقیق جعلی نہ کہتے تو آپ کو یہ شرمندگی نہ اٹھانی پڑتی۔(اب اس خط کی اصل نیز علامہ کے مزید کئی خطوط کی اصلیں جو صوفی صاحب کے نام تھیں، اقبال اکیڈمی کراچی[اب اقبال اکادمی پاکستان، لاہور: مرتب] کے پاس محفوظ ہیں۔ان کی فوٹو کاپی صوفی صاحب کے پاس بھی ہے)۔
ایسا ہی ڈاکٹر شاہ علی نے کراچی ریڈیو رات ۹½ بجے کی بزم طلبہ کی نشریات میں کہا کہ علامہ اقبال کے خطوط بنام علامہ سید سلیمان ندوی کی اشاعت کو رکوانے کی بہت کوشش کی گئی...ایسے لوگ علامہ کے ذوق علم اور جذبۂ استفادہ کو ان کی عظمت کے منافی اور کسر شان سمجھتے ہیں۔حقیقت کو چھپانا نہ ممدوح کی خدمت ہے اور نہ علم تاریخ سے انصاف۔

صاحب اور ان کے رفقاء کے خیالات سے واقف تھے بلکہ اس دور کی سب سے بڑی اسلامی خدمت یعنی 'تشکیل جدید فقہ اسلامی' کے لیے ان کے نزدیک حضرت خواجہ اور ان کے رفقاء سب سے زیادہ موزوں تھے۔

اسی سلسلے میں حضرت علامہ، خواجہ صاحب سے ملاقات کے متمنی تھے۔ ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ان دنوں خطبات مدراس (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ) کی تیاری میں مصروف تھے اور قرآن مجید سے جس قسم کی محققانہ اور حکیمانہ رہنمائی چاہتے تھے اس میں مدد کرنے والا ملک بھر میں ان کو خواجہ صاحب کے سوا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔

صوفی صاحب نے بتایا کہ ملاقات کی تحریک علامہ کی طرف سے ہوئی مگر وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے امرتسر نہیں جا سکتے تھے اس لیے خواہش تھی کہ اگر کوئی صورت ہو سکے تو خواجہ صاحب لاہور تشریف لے آئیں۔ میں (صوفی تبسم) جب امرتسر گیا تو خواجہ صاحب سے اس کا تذکرہ کیا۔ خواجہ صاحب نے فرمایا: بہت بہتر میں تو خود ان سے مستفید ہونا چاہتا ہوں۔ میں نے یہ صورتِ حال علامہ کو لکھ دی۔

اس کے جواب میں علامہ نے لکھا:

(۴ ستمبر ۱۹۲۵ء)

...مجھے یقین ہے کہ مولوی[7] صاحب موصوف کو میرے ساتھ تبادلۂ خیالات کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ ہاں مجھ کو ان سے فائدہ پہنچنا یقینی ہے۔ اس واسطے وہ اگر مجھ کو مستفیض کرنے کے ارادے سے امرتسر سے لاہور آنے

[7] یہاں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ ان دنوں خواجہ صاحب کو عام طور پر مولوی صاحب کہا جاتا تھا۔ بعد میں ان کی 'خوجہ برادری' کی ایک کانفرنس نے اپنا قومی لقب 'خوجہ' کے بجائے 'خواجہ' قرار دیا تو راقم (عرشی) نے جو ان دنوں بلاغ کی ادارت کے فرائض انجام دیتا تھا لفظ 'مولوی' پر اس کو ترجیح دی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ یہ لفظ اپنی معنویت کھو چکا تھا۔

کی زحمت گوارا فرمائیں تو ان کی بہت مہربانی ہے۔ جس کے لیے میں ان کا
نہایت شکر گزار ہوں گا۔[8]

علامہ کے مندرجہ بالا جواب آنے کے بعد ہمیں لاہور پہنچنے میں کچھ تاخیر ہو گئی تو چار دن بعد پھر ایک خط آیا:

(۶ ستمبر ۲۵ء)

جناب من! السلام علیکم

میں کل شام مولوی صاحب کا منتظر رہا۔ لیکن چوں کہ وہ تشریف نہ لائے اس واسطے مجھے اندیشہ ہے کہ میرے خط سے کوئی غلط فہمی نہ ہوئی ہو۔ میں نے آپ کے ارشاد کی تعمیل میں وقت کی تعیین اس واسطے نہ کی تھی کہ اس بارے میں مولوی صاحب موصوف کی آسائش کو مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ ان کی یہ عنایت کم نہیں کہ وہ محض میرے فائدے کے لئے لاہور تشریف لانے کی زحمت گوارا فرماتے ہیں۔ یہ بات قرین انصاف نہیں کہ ان حالات میں میں اپنی سہولت اور اوقات ملحوظ رکھوں، مجھ کو یہ بات اس خط میں واضح کر دینی چاہیے تھی کہ وہ جب چاہیں تشریف لائیں۔ مجھ کو صرف ایک روز پہلے مطلع کریں تاکہ میں ان کی تشریف آوری کے وقت مکان پر ہی رہوں، کہیں اِدھر اُدھر نہ چلا جاؤں۔

آپ کو گزشتہ خط لکھنے کے بعد میں نے چند باتیں نوٹ بھی کر رکھی تھیں جن پر میں مولوی صاحب کے خیالات سے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا آرزومند ہوں۔

مخلص۔ محمد اقبال

مولوی صاحب کی خدمت میں میری طرف سے سلام عرض کر دیجئے گا[9]

علامہ کے اس خط کے بعد میں (صوفی تبسم) خواجہ صاحب کو لاہور لے آیا اور گڑھی شاہو میں ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ پی ایچ ڈی (امرتسری) کی قیام

---

[8] خط ۱۹-۸-۲۸، مشمولہ، [شیخ عطاء اللہ] اقبال نامہ، حصہ اول۔

[9] اس خط کی اصل بھی اقبال اکیڈی کراچی میں موجود ہے۔[اب اقبال اکادمی لاہور منتقل ہو چکی ہے، مرتب]

گاہ پر انھیں ٹھہرا کر علامہ کو اطلاع دینے کے لیے گیا کہ خواجہ صاحب آ گئے ہیں۔اجازت ہو تو انھیں آپ کے ہاں لایا جائے۔

علامہ نے فرمایا: ''وہ تو میرے مہمان ہیں، انھیں دوسری جگہ کیوں اُتارا گیا؟ سیدھا یہاں لانا چاہیے تھا'' بہرحال صوفی صاحب اور خواجہ صاحب تانگے پر حضرت علامہ کی کوٹھی پہنچے اور ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ (خواجہ صاحب کی خواہش تخلیہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے الگ) ان کے پیچھے پیچھے سائیکل پر آ گئے اور اس طرح اوٹ میں بیٹھ گئے کہ خواجہ صاحب کو دکھائی نہ دیں۔رات کا وقت تھا اور خواجہ صاحب کی نظر مزمن مرض رمد چشم [نظر (ککروں) کی پرانی بیماری] کی وجہ سے رات کو بخوبی کام نہیں دیتی تھی۔

علامہ نے قبل ملاقات تبسم صاحب سے یہ دریافت کیا تھا کہ جدید فلسفیانہ اصطلاحات کا استعمال اس گفتگو میں ناگزیر ہوگا۔کیا مولوی صاحب کو اس میں مشکل تو پیش نہیں آئے گی؟ صوفی صاحب نے اس کے متعلق ان کو مطمئن کر دیا تھا۔

صوفی صاحب کہتے ہیں:

قرآن حکیم کے مختلف مقامات کے متعلق یہ گفتگو مسلسل چار گھنٹے تک جاری رہی۔مابعد الطبیعیات اور الٰہیات کا شاید ہی کوئی اہم پہلو ہو، جو زیرِ بحث نہ آیا ہو۔علامہ نے ابتدا میں کہا کہ ''مجھے خطبات مدراس کی تیاری میں بعض حقائق قرآنی کے سمجھنے کی ضرورت ہے۔کئی مقامات پر میں غور کر چکا ہوں، بعض مقامات ابھی غور طلب ہیں، اس میں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ چنانچہ علامہ سوال کرتے اور خواجہ جواب دیتے جاتے تھے۔نہایت بلند و عمیق حقائق سامنے آ رہے تھے۔میں (صوفی) اپنے آپ کو خود فراموشی اور جہاں فراموشی کے عالم میں بالکل ہی کسی دوسری نادیدہ دنیا میں محسوس کر رہا تھا۔کاش میں ان دنوں ان مکالمات کو قلم بند کر لیتا، جو اس طویل مدت کے گزر جانے کے بعد ذہن میں محفوظ نہ رہ سکے'' (مجھ (عرشی) کو یاد

پڑتا ہے صوفی صاحب نے انہی دنوں مجھے بتایا تھا کہ آیہ "یَاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَجِیۡبُوۡا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاکُمۡ لِمَا یُحۡیِیۡکُمۡ وَاعۡلَمُوۡا اَنَّ اللّٰہَ یَحُوۡلُ بَیۡنَ الۡمَرۡءِ وَقَلۡبِہٖ وَاَنَّہٗۤ اِلَیۡہِ تُحۡشَرُوۡنَ" [اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بلانے پر حاضر ہو جب رسول ﷺ تمہیں اس چیز کے لیے بلائیں جو تمہیں زندگی بخشے گی اور جان لو کہ اللہ کا حکم آدمی اور اس کے دلی ارادوں میں حائل ہو جاتا ہے اور یہ کہ تمہیں اس کی طرف اٹھنا ہے۔ القرآن، الانفال: آیت ۲۴] پر بہت غامض اور قدرے طویل گفتگو ہوئی تھی)۔ صوفی صاحب نے یہ بھی کہا کہ دوران کلام میں کسی مقام پر بھی خواجہ صاحب کو علامہ کا نقطۂ نگاہ سمجھنے میں رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ جدید فلسفہ کی ہر اصطلاح کو بے تکلف سمجھتے اور اس پر اظہار خیال کرتے تھے حالانکہ بعض مقامات پر مجھ (صوفی) کو فہم معانی میں مشکل پیش آتی تھی۔ گفتگو کے اخیر میں صرف ایک مسئلہ پر خواجہ صاحب نے اپنی ناواقفیت کا اعتراف کیا۔ وہ حسب ذیل ہے:

علامہ نے تجدد امثال کے متعلق قرآنی روشنی چاہی۔ خواجہ صاحب نے کہا کہ "میں نے اس نقطۂ نگاہ سے قرآن میں غور نہیں کیا

صوفی صاحب نے یاد دلایا کہ وہ (صوفی) اس ملاقات کے متعلق مختصر طور پر راوی (گورنمنٹ کالج لاہور میگزین) میں لکھ چکے ہیں۔ راوی کا وہ پرچہ تو نہیں ملا لیکن ماہ اگست ۱۹۳۸ء کے بلاغ (امرتسر) نے یہی تحریر بشکریہ راوی درج کی ہے، اسی کی نقل پیش خدمت ہے:

> ذیل کا خط[10] علامہ مرحوم نے ۱۹۲۵ء میں میرے نام لکھا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قبلہ محمود شیرانی مدظلہ العالی کی وساطت سے پہلے پہل مجھے ڈاکٹر صاحب سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ اگرچہ میں فارغ التحصیل ہو کر لاہور سے اپنے وطن چلا گیا تھا تاہم ان سے ملاقات کا اشتیاق ہمیشہ دامن گیر رہتا اور میں گاہے گاہے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان کی عالمانہ گفتگو سے

[10] یعنی مکتوب اقبال بنام صوفی تبسم، [شیخ عطاء اللہ]، اقبال نامہ، حصہ اول، ص ۴۶-۴۹۔

استفادہ کرتا رہتا۔

اسی زمانہ میں امرتسر سے رسالہ بلاغ شائع ہوا۔ اس رسالہ میں خواجہ احمد الدین مرحوم کے مضامین اور قرآن حکیم کی تفسیر انہی کے قلم سے شائع ہوتی تھی۔ یہ رسالہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں باقاعدہ پہنچتا تھا اور بالاستیعات اس کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اس خط میں جن مولانا کا ذکر آیا ہے، وہ یہی خواجہ احمد الدین مرحوم ہیں۔ میری دلی خواہش تھی کہ ڈاکٹر صاحب اور خواجہ صاحب کی ملاقات ہو اور دونوں بزرگوں نے خود بھی بارہا اس کے لئے انتہائی اشتیاق کا اظہار فرمایا لیکن یہ چیز ہمیشہ معرض التوا میں پڑی رہی، آخر کار ایک موقع نکل آیا۔

اس ضمن میں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ ملاقات سے پہلے دونوں بزرگوں نے زبانی اور تحریری طور پر نہایت عجز اور انکسار سے کام لیا جیسا کہ اس خط کے اندازِ بیان سے ظاہر ہے۔ ہر ایک اپنی بات پر زور دیتا تھا کہ ملاقات کا مقصد محض دوسرے سے استفادہ کرنا ہے اور بس۔ میں عجیب الجھن میں تھا اور مجھے اس بارے میں کچھ عرض کرنے کی جرأت نہ تھی اس لیے کہ اظہارِ انکسار میں کسی نمائش یا تصنع کا شائبہ تک نہ تھا، مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ اس بات کا احساس ہوا کہ علم کی غایت اور انتہا عجز و انکسار کے سوا کچھ نہیں اور دنیا کی ممتاز ترین ہستیوں کا یہ ارشاد کہ "معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد" [پس ہمیں پتہ چل گیا کہ کچھ معلوم نہ ہوا] حقیقت پر مبنی ہے، اس لیے کہ ہر صاحب بصیرت کائنات کی گہرائیوں میں کھو جانے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے۔

مولانا احمد الدین لاہور تشریف لائے اور میں ان کی معیت میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دونوں بزرگوں میں مسلسل چار گھنٹے تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ مابعد الطبیعیات اور الٰہیات کا شاید ہی کوئی اہم پہلو ایسا ہو، جو زیرِ بحث نہ آیا ہو۔

یہ بابرکت صحبت رات کے ایک بجے ختم ہوئی۔ اس صحبت میں شریک ہونے والے میرے محترم دوست ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ پی۔ایچ۔ڈی بھی تھے۔

یہ واقعہ آج سے تقریباً تیرہ[11] برس پہلے کا ہے۔ لیکن میرے تاثرات ابھی تک تازہ ہیں۔ آج بھی جب کبھی اس ملاقات کا خیال آتا ہے تو دل پر ایک خاص محویت طاری ہو جاتی ہے۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ جب ہم اس رات ڈاکٹر صاحب سے رخصت ہو کر چلے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہم عالم بالا کی سیر کر رہے ہیں۔

(تبسم[12])

صوفی صاحب نے اپنی اس تحریر میں یہ فرمایا ہے کہ "وہ (علامہ) بالاستیعاب اس (ماہنامہ بلاغ) کا مطالعہ کیا کرتے تھے"۔ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا جو رسالہ بلاغ کے مالک و مدیر اول حکیم شہاب الدین (امرتسری) کی زبان سے راقم نے سنا تھا جس سے علامہ کی اس رسالہ سے دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ حکیم صاحب لاہور آتے تو علامہ سے بھی ملاقات کرتے اور بلاغ کا سالانہ چندہ دستی وصول کرتے تھے۔ ایک دفعہ علامہ نے ان سے کہا "میرے پاس سب رسائل و اخبارات بے قیمت پہنچ جاتے ہیں صرف آپ ایسے ہیں کہ مجھ سے بلاغ کی قیمت وصول کرتے ہیں۔"

یہ تھی خواجہ و علامہ کی ملاقات کی سرگزشت۔ راقم کو یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ علامہ کو خواجہ صاحب سے مکرر ملاقات کا شوق رہا۔ ان کے ذہن میں بعض اہم قرآنی سوالات پیدا ہوتے رہتے تھے جن کے متعلق وہ خواجہ صاحب سے تبادلۂ خیال کرنا چاہتے تھے۔ چناں چہ ایک مرتبہ سورۂ نساء کی آیت ۱۵۹ "وَإِن مِّنْ أَهْلِ الْكِتَٰبِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِۦ قَبْلَ مَوْتِهِۦ ۖ وَيَوْمَ الْقِيَٰمَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا" [کوئی کتابی ایسا نہیں جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ

---

[11] یاد رہے کہ یہ تحریر ۱۹۳۸ء کی ہے۔
[12] ماہنامہ البلاغ اگست ۱۹۳۸ء بحوالہ راوی لاہور۔

لائے اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوگا] (القرآن، النساء: آیت ۱۵۹) کا ذکر آیا تو اس کی ضمیروں کی تعیین کے متعلق راقم علامہ کے استفسار کا جواب نہ دے سکا اور خواجہ صاحب کی طرف رجوع چاہا۔ علامہ کو جب ان کی تحقیق معلوم ہوئی تو اس سے دلچسپی کا اظہار فرمایا۔

ایک اور صحبت میں توریت کے مسئلہ 'عول' [ورثا کے حصص اکائی ورثہ سے زائد ہو جانے کی صورت میں بمطابقِ تناسب ہر ایک کے حصے میں کمی ہو جاتی ہے] کے متعلق راقم سے حضرت خواجہ کی تحقیق دریافت فرمائی، میں نے لاعلمی ظاہر کی اور امرتسر پہنچ کر خواجہ صاحب کو آمادہ کیا کہ وہ علامہ کے رو در رو اس اہم مسئلہ پر روشنی ڈالیں (خواجہ صاحب 'عول' کے قائل ہی نہ تھے۔ وہ اسے قرآنی تصریحات کے عدم فہم کا نتیجہ قرار دیتے تھے)۔ ان کی منظوری سے علامہ کو مطلع کیا تو آپ نے یہ مکتوب سپرد قلم فرمایا:

لاہور ۱۷؍ اکتوبر ۱۹۳۵ء

جناب عرشی صاحب! السلام علیکم!

آپ کا والا نامہ آج صبح مجھے مل گیا۔[13] مولوی صاحب قبلہ کی خدمت میں میری طرف سے سلام عرض کر کے بہت بہت شکریہ ادا کیجئے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، میں گزشتہ ۱۸ ماہ سے ہائی کورٹ کا کام نہیں کرتا، اس واسطے مولوی صاحب سے گفتگو کرنے کے لیے مجھے کچھ پہلے کتابوں کا مطالعہ کرنا ہوگا جس کے لیے اس وقت میری طبیعت حاضر نہیں، اور نہ اس قدر محنت برداشت ہو سکتی ہے۔ ان شاء اللہ کچھ مدت بعد ایسا کر سکوں گا۔

فی الحال میرے خیال میں چاہیے کہ ایسی مثالیں لی جائیں جن میں فقہا کے نزدیک 'عول' کی ضرورت پڑتی ہے اور تقسیم سے ثابت کیا جائے کہ

---

13 حضرت خواجہ احمد الدین مرحوم۔

'عول' کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسی مثالیں انگریزی کتاب میں موجود ہیں۔ مولوی سراج الدین پال آپ کو بتا سکیں گے۔ یہ مسئلہ نہایت ضروری ہے، میں خود بھی 'عول' کی تردید میں بہت دلچسپی رکھتا ہوں۔

امید کہ مولوی صاحب کا مزاج بخیر ہوگا۔ اگر 'عول' پر ایک علیحدہ رسالہ لکھا جائے تو نہایت مناسب ہوگا۔ جو کچھ مولوی[14] صاحب نے بیان القرآن[15] میں لکھا ہے اس کو مزید تشریح و توضیح کے ساتھ علیحدہ چھاپ دیا[16] جائے تاکہ اس مسئلہ کی طرف علماء کی خاص توجہ ہو جائے اور وکیل و بیرسٹر

---

[14] تفسیر بیان الناس۔

[15] مروجہ قانون وراثت کی فاش اغلاط گزشتہ صدیوں میں کسی کی نظر میں نہیں آئی تھیں۔ فقہا نے سراجی کو پاک از خطا صحیفہ [غلطی سے پاک کتاب] سمجھ کر رائج کر رکھا تھا۔ خواجہ صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس پر گرفت کی اور ملک بھر کے فقہاء و علماء کو اس طرف متوجہ کیا۔ جمود پسند علماء کی طرف سے اس پر بہت لے دے کی گئی، مگر بعض حضرات پر اس رسالہ کے دلائل قاطعہ کا اتنا اثر ہوا کہ باوجود اختلاف عقائد کے انھیں اس رسالہ کی اہمیت کا اعتراف کرنا پڑا۔ چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

معجزۂ قرآنی در بیان میراث مسلمانان: احمد الدین صاحب مدرس مدرسۃ المسلمین امرتسر نے مسائل میراث اسلامی پر ایک ناقدانہ رسالہ لکھا ہے۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ علماء میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو مسائل فقیہہ میں بلا خوف لومۃ لائم [بغیر کسی ملامت کے خوف کے] فقہائے متقدمین شکر اللہ مساعیہم [گزرے ہوئے فقہا، اللہ ان کی کاوشوں کی جزا دے] کے اجتہادات پر قلم اٹھاتے ہیں" (پھر یہ لکھنے کے بعد کہ ہمیں تو الحدیث علماء سے علمی کاموں کی توقع تھی مگر انھیں تو مجادلہ [بحث و مباحثہ]، مقاتلہ [خوں ریزی] اور مقادمہ (باہم مقدمہ بازی) سے ہی فرصت نہیں ملتی، تحریر کرتے ہیں) "اس بنا پر ہم نے مولوی صاحب کے رسالہ میراث کو پوری توجہ اور غور کے ساتھ پڑھا اور پھر اس یقین کے ساتھ ختم کیا کہ اس میں بہت کی باتیں لائق توجہ ہیں اور درحقیقت ان مسائل میں ہمارے فقہاء کتاب و سنت سے کسی قدر دور جا پڑے ہیں، لیکن تعین کے ساتھ ان مسائل پر اظہار خیال کے لیے فرصت درکار ہے۔ واللہ تعالیٰ مسئول ان یوفق لھا" [اللہ سے دُعا ہے کہ اس کی توفیق دے]۔ (ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۱۷ء، ص ۵٦)

مولانا مفتی حافظ محمد اسلم جیراج پوری نے خواجہ صاحب کے اس رسالہ کا عربی میں الوراثۃ فی الاسلام کے نام سے ترجمہ کر دیا ہے۔ لیکن کسی مصلحت ذاتی کے سبب یہ نہیں بتایا کہ یہ ان کی اپنی تصنیف نہیں، بلکہ ترجمہ ہے۔

[16] عبدالملک بن ماجشون (عرشی)۔

صاحبان بھی اس میں خاص دلچسپی لے سکیں۔

مخلص

محمد اقبال[17]

افسوس ہے کہ دونوں بزرگوں کی پیری و علالت کی وجہ سے یہ ملاقات وقوع پذیر نہ ہو سکی اور ۲ جون ۱۹۳۶ء میں خواجہ صاحب انتقال فرما گئے۔

خواجہ صاحب کی تحریروں کے مطالعے اور ان سے ملاقات کا علامہ اقبال پر کیا اثر ہوا؟ اس کے لیے اقبال نامہ اور خطبات مدراس کے مندرجہ ذیل اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں علامہ لکھتے ہیں:

> دوسرا امر جو اس کے متعلق دریافت طلب ہے یہ ہے کہ جو جواب وحی کی بنا پر دیا گیا وہ تمام امت پر حجت ہے (اور وہ وحی بھی قرآن شریف میں داخل ہو گئی) لیکن جو جواب محض استدلال کی بنا پر دیا گیا جس میں وحی کو دخل نہیں، کیا وہ بھی تمام امت پر حجت ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ حضور[ﷺ] کے تمام استدلالات بھی وحی میں داخل ہیں یا بالفاظ دیگر یہ کہ قرآن و حدیث میں کوئی فرق نہیں؟[18]

ایک اور خط میں سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

> اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجماع نے کوئی حکم نص قرآنی کے خلاف نافذ کیا تو علامہ آمدی کے خیال کے مطابق ایسا کسی ناسخ حکم کی بنا پر ہوا ہے۔ وہ ناسخ حکم سوائے حدیث نبوی[ﷺ] کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث ناسخ قرآن ہو سکتی ہے جس سے کم از کم مجھے تو انکار ہے اور غالباً آپ کو بھی ہوگا۔

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے چھٹے خطبہ اجتہاد میں ایک امریکی مصنف پر تنقید

---

17 [شیخ عطاء اللہ]، اقبال نامہ حصہ اول، ص ۱۳، ۲۸۔

18 ایضاً، ص ۶۹، ۱۴۱

کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "پیغمبر ﷺ کی کسی حدیث میں بھی یہ شان نہیں کہ وہ قرآن کی تنسیخ کر سکے۔"[19]

اسی خطبہ میں حضرت عمرؓ کا نقطۂ نظر بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی قانون میں کیا فی الواقع مزید نشوونما اور ارتقا کی گنجائش ہے؟ لیکن اس سوال کے جواب میں ہمیں بڑی زبردست کاوش اور محنت سے کام لینا پڑے گا۔ گو ذاتی طور پر مجھے یقین ہے کہ اس کا جواب اثبات ہی میں دیا جا سکتا ہے بشرطے کہ ہم اس مسئلہ میں وہی روح برقرار رکھیں جس کا اظہار کبھی حضرت عمر کی ذات میں ہوا تھا، اور امت کے اولین دل و دماغ میں جو ہر معاملہ میں آزادیٔ رائے اور تنقید سے کام لیتے تھے اور جن کی اخلاقی جرأت کا یہ عالم تھا کہ حضور رسالت مآب ﷺ کی حالت نزع میں یہاں تک کہہ دیا کہ "حسبنا کتاب اللہ"۔ ہمارے لیے اللہ کی کتاب ہی کافی ہے۔[20]

اسی خطبہ میں حدیث کے ضمن میں یہ بتاتے ہوئے کہ ان کا بڑا حصہ اپنے مخصوص حالات کے لیے تھا، لکھتے ہیں:

پھر چوں کہ احکام مقصود بالذات نہیں اس لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو آئندہ نسلوں کے لئے بھی واجب ٹھہرایا جائے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ امام ابو حنیفہ نے جو اسلام کی عالمگیر نوعیت کو خوب سمجھ گئے تھے، احادیث سے اعتناء نہیں کیا۔ انھوں نے اصول استحسان یعنی قلبی ترجیح، کا اصول قائم کیا جس کا تقاضا یہ ہے کہ قانونی غور و فکر میں ہم ان احوال و ظروف کا بھی جو واقعتاً موجود ہیں بااحتیاط مطالعہ کریں۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ فقہ اسلامی کے ماخذ کے بارے میں ان کا رویہ کیا تھا۔ رہا یہ کہنا کہ امام موصوف نے احادیث سے اس لیے اعتنا نہیں کیا کہ ان کے زمانہ میں کوئی مجموعہ

---

[19] [مجلہ] چراغ راہ، جلد دوم، اسلامی قانون نمبر، ص ۸۳۔

[20] محمد اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، مترجم، سید نذیر نیازی، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۵۸ء، ص ۵۔

احادیث موجود نہیں تھا، تو اس سلسلہ میں اول تو یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اس زمانہ میں تدوین نہیں ہوئی تھی، کیوں کہ عبدالملک[21] اور زہری کے مجموعے امام صاحب کی وفات سے کم از کم تیس(۳۰) برس پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ ثانیاً اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ امام موصوف ان مجموعوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکے، یا یہ کہ ان میں فقہی احادیث موجود نہیں تھیں، جب بھی وہ ضروری سمجھتے تو امام مالک اور امام احمد بن حنبل کی طرح خود اپنا مجموعہ احادیث تیار کر سکتے تھے۔

لہٰذا بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو میری رائے میں امام موصوف نے فقہی احادیث کے بارے جو روش اختیار کی سر تا سر جائز اور درست تھی۔ اندریں صورت اگر آزادیٔ اجتہاد کی وہ تحریک جو اس وقت دنیائے اسلام میں پھیل رہی ہے احادیث کو بلا جرح و تنقید قانون کا ماخذ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تو اس سے اہلسنت والجماعت کے ایک امام الائمہ [اماموں کے امام] ہی کی پیروی مقصود ہے۔[22]

اقبال کامل[23] میں مولانا عبدالسلام ندوی سینئر [بزرگ] رفیق دارالمصنّفین

---

[21] زیر نظر ایڈیشن ۱۹۴۸ء کا ہے۔ اس کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ''اس کتاب کا نام اقبال کامل، سید سلیمان ندوی نے رکھا ہے'' نیز ''اس کتاب کا پورا مسودہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی نظر سے بھی گذر چکا ہے جو فلسفی ہونے کے ساتھ صوفی اور سخن فہم بھی ہیں اور اب جب کہ اس کتاب کا مسودہ پریس میں جا رہا ہے مزید اطمینان کے لیے اس کو ہمارے عزیز دوست اور دارالمصنفین کے پرانے رفیق مولوی شاہ معین الدین صاحب ندوی نے بھی بنظر غائر دیکھ لیا ہے اور ان کے مشورے سے اس کتاب کی بہت سے خامیاں دور ہو گئی ہیں۔'' گویا یہ کتاب دارالمصنفین کے چار اہل علم کی مصدقہ ہے اور علامہ کی کوئی سوانح عمری غالباً اتنی مستند نہیں (دیباچہ صفحہ ۵)۔

[22] تشکیل جدید، ص ۲۶۶، ۲۶۷۔

[23] یہی نقطۂ نظر حضرت خواجہ احمد الدین کا تھا اور وہ اس کی بنیاد قرآن کریم کی اس آیت پر رکھتے تھے کہ [وَجَٰهِدُواْ فِى ٱللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِۦ هُوَ ٱجْتَبَىٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى ٱلدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَٰهِيمَ ۚ هُوَ سَمَّىٰكُمُ ٱلْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِى هَٰذَا لِيَكُونَ ٱلرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُواْ شُهَدَآءَ عَلَى ٱلنَّاسِ ۚ فَأَقِيمُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتُواْ ٱلزَّكَوٰةَ وَٱعْتَصِمُواْ بِٱللَّهِ هُوَ مَوْلَىٰكُمْ ۖ فَنِعْمَ ٱلْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ ٱلنَّصِيرُ] (القرآن، الحج: آیت ۷۸) [اور اللہ کی راہ میں کوشش کرو جیسا

اعظم گڑھ، علامہ اقبال کے مسلک کے متعلق تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> وہ اہل قرآن تھے لیکن اپنے آپ کو اہل قرآن کہنا بھی ایک قسم کی فرقہ پسندی تھی۔اس لیے انھوں نے کبھی اپنے آپ کو اہل قرآن کی طرف منسوب نہیں کیا[24] تاہم ان کے اشارات بلکہ تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہب کے متعلق ان کا عروۃ الوثقٰی [مضبوط اور صدا بہار درخت] صرف قرآن تھا۔مثنوی رموزِ بیخودی میں فرماتے ہیں:

گر تو میخواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن
صوفی پشمینہ پوش حال مست
از شراب نغمہ ی قوال مست
آتش از شعر عراقی در دلش
در نمی سازد بقرآن محفلش
واعظ دستان زن افسانہ بند
معنی او پست و حرف او بلند
از خطیب و دیلمی گفتار او
با ضعیف و شاذ و مرسل کار او
از تلاوت بر تو حق دارد کتاب
تو ازو کامی کہ میخواہی بیاب[25]

کوشش کرنے کا حق ہے اس نے تمہیں پسند کیا ہے اور دین میں تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کی تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے اسی نے تمہارا نام پہلے سے مسلمان رکھا تھا اور اس قرآن میں بھی تاکہ رسول تم پر گواہ بنے اور تم لوگوں پر گواہ بنو پس نماز قائم کرو اور زکوۃ دو اور اللہ کو مضبوط ہو کر پکڑو وہی تمہارا مولیٰ ہے پھر کیا ہی اچھا مولیٰ اور کیا ہی اچھا مددگار ہے] کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہمارا نام 'مسلم' رکھا ہے تو اس سے روگردانی حکم قرآنی کی مخالفت ہے۔

[24] البیان، امرتسر، دسمبر ۱۹۳۹ء، ص ۲۴۔

[25] ترجمہ:

[کلیات فارسی، ص ۱۳۳]

اس باب میں ان کی گفتگوئیں اور زیادہ واضح ہیں۔ عرشی صاحب البیان دسمبر ۱۹۳۹ء صفحہ ۱۹ میں لکھتے ہیں کہ ''ایک بار ان سے میں نے پوچھا: اسلام بتمامہ قرآن میں محصور ہے یا نہیں؟ فرمایا ''مفصل کہو'' میں نے کہا: خارج از قرآن ذخیرۂ احادیث و روایات اور کتب فقہ وغیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے؟ انھوں نے فرمایا ''یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں، ان کی بھی ضرورت ہے اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ کن ضروریات کے ماتحت وضع کی گئیں، لیکن نفس اسلام قرآن مجید میں بتمام و کمال آ چکا ہے، خداوند تعالیٰ کا منشا دریافت کرنے کے لئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔''

ایک اور گفتگو میں جو انھوں نے ایک غالی اہلحدیث سے کی فرمایا ''میں

گر مسلماں کی طرح جینے کا ہے ارماں تجھے
کوئی ہادی مل نہیں سکتا بجز قرآں تجھے
صوفی پشمینہ پوش اس دور میں ہے حال مست
اس کو رکھتی ہے شراب نغمۂ قوال مست
دل پہ کچھ ایسا چڑھا شعر عراقی کا بخار
اس کی محفل کو نہیں آتا ہے قرآں ساز گار
وہ کلاہ و بوریا کو جانتا ہے تخت و تاج
فقر اس کا خانقاہوں سے لیا کرتا ہے باج
وہ ہمارا واعظ دستاں زن افسانہ بند
اس کے معنی پست ہیں الفاظ ہیں اس کے بلند
وہ ضعیف و شاذ و مرسل سے سدا رکھتا ہے کام
اور خطیب و دیلمی ہے سے سجاتا ہے کلام
تجھ پہ رکھتی ہے تلاوت کا جق حق ام الکتاب
کر ادا اور زندگی کو بنا لے کامیاب

[صدیقی، ص ۴۲۸]

اعتقادی اُمور میں صرف قرآن پر انحصار رکھتا ہوں اور حدیث کے متعلق مجھے اور آپ سب کو معلوم ہے کہ کن ذریعوں سے ہم تک پہنچی ہے اس پر ایک صاحب ذرا گرم ہو کر کہنے لگے ''اگر اس طرح حدیث سے بے پروائی کی جائے گی تو مسلمانی ختم ہو جائے گی، ہمارا کوئی عمل و عبادت حدیث کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ قرآن تو نماز ایسی روزمرہ کی چیز کے لئے بھی ہمیں کوئی تفصیل نہیں بتاتا، یہی وجہ ہے کہ فرقہ اہل قرآن نے اپنے لیے عجیب قسم کی نمازیں تراش لی ہیں جس کا جمہور اہل اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کی نمازوں کے اوقات، اذکار اور رکعات وغیرہ سب عالم اسلامی سے مختلف ہیں۔ کیا ایسی حالت میں آپ ان کو کافر نہ کہیں گے؟'' ڈاکٹر صاحب نے اس تیز کلامی کے جواب میں نہایت نرمی سے فرمایا: ''کافر نہ کہو کوئی اور نام رکھ لو، یہ شدت ہے، تم لوگ نمازوں کی رکعات اور اذکار پر لڑتے ہو، مجھے تو سرے سے نمازوں کا وجود ہی کہیں نظر نہیں آتا''[26] یعنی مسلمان نماز ہی نہیں پڑھتے۔

لیکن بایں ہمہ وہ حدیثوں کے سرے سے منکر نہ تھے بلکہ بہت سی حدیثوں پر شدت سے اعتقاد رکھتے تھے۔ ان کو جو کچھ شک و شبہ تھا وہ احادیث کی شریعت[27] کے متعلق تھا۔ چنانچہ ایک خط میں مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

> شریعت احادیث کے متعلق جو کھٹک میرے دل میں ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ احادیث سرے سے بیکار ہیں۔ ان میں ایسے بیش بہا اصول ہیں کہ سوسائٹی [معاشرہ] باوجود اپنی ترقی و تعالی کے اب تک ان کی بلندیوں تک نہیں

[26] یعنی حدیث کی حجیت پر۔

[27] یعنی ''چراگاہ اللہ اور اس کے رسول [ﷺ] کی ہیں'' یعنی تمام اُمت میں مشترکہ ہیں۔

پہنچی مثلاً ملکیت شاملات دیہہ کے متعلق المرعی[28] للہ و رسولہ (بخاری[29])

---

[28] [عبدالسلام ندوی]، اقبال کامل: [علامہ اقبال کی مفصل سوانح حیات کے ساتھ ان کی تصانیف اور ان کے فلسفہ و شاعری پر تنقید و تبصرہ، اعظم گڑھ، دارالمصنفین، 1948.] ص ۵۵ تا ۵۷۔

[29] [شیخ عطاء اللہ]، اقبال نامہ، حصہ اول، خط ۷۲، ص ۱۵۲۔

۱۶

اسد ملتانی کے روزنامچے کے چند اوراق*

اختر راہی

محمد اسد خاں اسد ملتانی ۱۳؍ دسمبر ۱۹۰۲ء کو ملتان شہر میں پیدا ہوئے اور نومبر ۱۹۵۹ء کو راولپنڈی میں فوت ہوئے۔ ان کے والد غلام قادر خاں، شیرانی افغان تھے۔ اسد نے مشن ہائی سکول ملتان سے ثانوی تعلیم مکمل کی اور ۱۹۲۱ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ ۱۹۲۴ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا اور دو سال بعد ۱۹۲۶ء میں گورنمنٹ آف انڈیا [حکومتِ ہند] کے سیکرٹریٹ [دفاترِ سرکار] میں سنیئر کلرک [منشی کلاں] کے طور پر ملازمت اختیار کی۔ ملازمت کے سلسلے میں زندگی کا زیادہ حصہ دہلی اور شملہ میں بسر کیا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان کی سول سروس [خدمتِ سرکار] میں شامل رہے اور اپنی صلاحیتوں سے آخر دم تک قوم و ملک کی خدمت انجام دیتے رہے۔

علامہ اقبال سے محمد اسد خاں اسد کا رشتۂ عقیدت ۱۹۲۱ء میں قائم ہوا اور زندگی جوں جوں گزرتی گئی، اس رشتے میں استحکام پیدا ہوتا گیا۔ گورنمنٹ کالج میں کافی عرصے سے ایک روایت چلی آتی تھی کہ سالانہ جلسۂ تقسیمِ انعامات میں ایک انعام کالج کے بہترین شاعر کو بھی دیا جاتا تھا۔ اسد صاحب، جو دس سال کی عمر سے مشقِ سخن کرتے آرہے تھے، اُنھوں نے سالِ اوّل کے طالب

---

* سہ ماہی اقبال، جلد ۲۳ شمارہ ۴، لاہور، بزمِ اقبال، اپریل ۱۹۷۶ء

علم ہونے کے باوجود کالج کے دوسرے سینئر [بڑے] طلبہ کے مقابلے میں ایک نظم لکھی اور یہ نظم اوّل قرار دی گئی۔ معلوم ہوا کہ نظموں کے انعامی مقابلے کا فیصلہ علامہ اقبال نے کیا تھا۔ انعام حاصل کرنے والے طالب علم کو اپنی نظم سالانہ جلسے میں سنانی ہوتی تھی، بقول اسد مرحوم:

> جس روز جلسہ ہوا، میری نظم میرے حوالے کر دی گئی۔ یہ دیکھ کر میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ نظم پر جا بجا اصلاح بھی موجود تھی۔ اس وقت تو میں اس اصلاح کو نہ پوری طرح پڑھ اور نہ اچھی طرح سمجھ سکا، اور جہاں تک مجھے یاد ہے اس جلسے میں مَیں نے کہیں اصل اور کہیں کہیں اصلاح کے مطابق نظم پڑھ دی تھی، لیکن بعد میں جب غور سے دیکھا تو اصلاح کی اہمیت محسوس ہوئی۔

اسد صاحب کی نظم کا عنوان تھا "شبنم کا قطرہ"۔ اس نظم کے آغاز میں چھ اشعار کا درجِ ذیل تمہیدی بند تھا:

شاہدِ لالہ کا اک زینت فزا زیور ہوں میں
نازنینِ گل کے نازک کان کا گوہر ہوں میں
دیدۂ نرگس میں مَیں اک اشکِ فرحت فال ہوں
روئے زیبائے سمن پر جانشینِ خال ہوں
بوند ہوں آبِ عنب کی مَیں بجامِ موتیا
لب پہ خضرِ سبزہ کے ہوں قطرۂ آبِ بقا
برگِ گلبن کی صدف میں گوہرِ نایاب ہوں
جھومتی ڈالی پہ مثلِ قطرۂ سیماب ہوں
اس طرح جلوہ نما ہوتا ہوں نوکِ خار پر
جیسے آویزاں سرِ منصور ہووے دار پر
دیکھنے کو اک ذرا سا قطرۂ بے رنگ ہوں

مختلف رنگوں میں لیکن قلزمِ نیرنگ ہوں

ان اشعار میں بے جان فن کاری اور مصنوعی شاعری کی گئی تھی۔ علامہ نے اس بند کو قلم زد کر دیا۔ آخری شعر کے دونوں مصرعوں کا مفہوم ایک مصرع میں سمو دیا اور دوسرا مصرع خود لگا کر تمہیدیوں مکمل کر دی:

قطرۂ بے رنگ ہوں یا قلزمِ نیرنگ ہوں!
سننے والے سن کہ میں بھی اک خموش آہنگ ہوں

بعض مقامات پر ڈاکٹر صاحب نے ایک دو لفظ بدل کر بندش درست کر دی لیکن چند مقامات پر اصلاح میں نوکِ قلم کی اُستادانہ جنبش نے شعر کو بہت بلند کر دیا۔ مثلاً اسد مرحوم کا شعر تھا:

اس طرح پھرتا پھراتا میں تلاشِ یار میں
سروِ دل ہو کر گرا آخر یہاں گلزار میں

ڈاکٹر صاحب نے یوں اصلاح کر دی:

اس طرح پھرتا پھراتا جستجوئے یار میں
تھک کے آخر گر پڑا ہوں گوشۂ گلزار میں

اسد صاحب نظم کی تصحیح کا شکریہ ادا کرنے کی غرض سے علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ علامہ اُن دنوں انار کلی والے مکان میں رہتے تھے۔ جب اسد صاحب حاضر ہوئے تو علامہ کے پاس سیالکوٹ کے ایک بزرگ بھی تشریف فرما تھے۔ اُن سے گفتگو کرتے ہوئے علامہ ابتدائی زمانۂ تعلیم میں فارسی پڑھنے کی یادیں تازہ کر رہے تھے۔ فارسی زبان و ادب کے سلسلے میں مولانا گرامی کا ذکر آیا تو علامہ نے اُن کے غیر معمولی حافظے کی تعریف کی اور کہا کہ کسی کو اشعار، غزلیں یا نظمیں یاد ہوں گی مگر مولانا گرامی کو مثنویاں یاد ہیں۔

علامہ کے حضور اسد مرحوم کی یہ پہلی حاضری تھی۔ بعد ازاں علامہ کی مجلس میں اکثر جاتے رہتے تھے۔ علامہ کے کلام پر اُن کی گہری نظر تھی اور ان کی فکر کو عام کرنے میں اسد صاحب بھی اپنی صلاحیت و قابلیت کے مطابق حصہ لے رہے تھے۔ اسد صاحب دبستانِ سخن میں ''اقبالی'' ہیں اور اُن کے کلام میں علامہ کے افکار کا واضح پرتو محسوس ہوتا ہے۔ اسد صاحب نے اگرچہ غزلیں بھی لکھیں اور جو شاعر غزل کا ایسا مطلع کہہ سکتا ہے:

رہیں نہ رند، یہ زاہد کے بس کی بات نہیں
تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں

اس کے کمالِ غزل گوئی سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے، مگر اُنھوں نے اس طرز کی غزلیں کہنا ترک کر دیا تھا۔ اُن کی شاعری دینِ اخلاق کی ترجمان اور اسلام کے مقدس پیغام کی حامل بن گئی۔ اُنھوں نے غزل کی بجائے نظم کو طبع آزمائی کے لیے چن لیا۔ اُن کی نظموں میں اکبر کا طنز، حالی کی نصیحت آموزی، اقبال کا تفکر اور حب الوطنی کا نہایت عمدہ امتزاج ہے۔ وہ دورِجدید کے اُن شعرا میں ہیں جنھوں نے اقبال اور حالی کی روشِ شاعری کو آگے بڑھایا۔ اُن کے کلام میں ہر دو پیشروؤں کی طرح اسلام اور مسلمانوں کی بہبود کے مضامین، مذہبی و سیاسی مسائل کا بیان، قومی و ملی عظمت کے ترانے، حسنِ عمل کی تلقین اور اخلاقی اقدار کا پرچار ہے۔ بعض اوقات اُن کی شاعری کا مقصود ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقبال کے ''نورِبصیرت'' اور ''سوزِ عشق'' کو عام کرنا چاہتے ہیں اور اُن کی کامیاب ترین نظمیں فیضانِ اقبال کا نتیجہ ہیں۔ چند اشعار سے ان کا اقبالی رنگ واضح ہو جائے گا:

ابھی تک کافری سے عقل، ایماں تک نہیں پہنچی
کہیں دیر و حرم کے درمیاں معلوم ہوتی ہے

زاہد شعورِ حسن سے بیگانہ ہی رہا
حسنِ نظر نہیں ہے تو حسنِ عمل کہاں

کی مسلماں نے ترقی جو فرنگی بن کر
وہ فرنگی کی ترقی ہے، مسلماں کی نہیں

ہر شخص بنا لیتا ہے اخلاق کا معیار
خود اپنے لیے اَور، زمانے کے لیے اَور

اسد صاحب کی نظم "خطیب سے خطاب" اقبال کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ایک شعر ہے:

ہمت ہے تو پیدا کر فردوسِ حیات اپنا
بخشی ہوئی جنت سے دوزخ کا عذاب اچھا

اسی طرح:

ذوق ایثار و عمل کا نہ تجھے ہے نہ مجھے
زیست اس طرح کی زیبا نہ تجھے ہے نہ مجھے

علامہ اقبال کی اس نظم کی صدائے بازگشت ہے:

ہوسِ منزلِ لیلیٰ نہ تو داری و نہ من[1]

[کلیات فارسی، ص ۳۰۸]

اسد صاحب دہلی میں مقیم تھے کہ مارچ ۱۹۳۳ء میں علامہ اقبال غازی رؤف پاشا کی تقریر کے موقع پر جلسے کی صدارت کے لیے جامعہ ملیہ دہلی تشریف لے گئے۔ ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی "دارالسلام" میں قیام تھا۔ اسد صاحب اپنے دو دوستوں امداد حسین اخگر مراد آبادی اور مولوی محمد احمد خاں ندوی مرحوم (م۱۹۳۶) کی معیت میں علامہ سے ملنے اُن کی قیام گاہ پر حاضر ہوئے۔ یہ محفل تین گھنٹے تک جاری رہی۔ اسد صاحب نے اپنی ڈائری میں علامہ کے فرمودات محفوظ کر لیے تھے (ڈائری کا یہی حصہ پیش کیا جا رہا ہے)۔

۱۴مارچ ۱۹۳۳ء

آج ۹ بجے صبح جناب اخگر مرا د آبادی، مولانا محمد احمد ندوی[2] اور مَیں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی دارالسلام واقع دریا گنج میں ڈاکٹر سر اقبال سے ملنے گئے۔ اخگر صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی شان میں ایک انگریزی نظم لکھی تھی جو ایک روز پہلے مولانا شفیع داؤدی کے حوالے کر دی گئی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ کل شام آپ کی نظم مولانا شفیع داؤدی نے مجھے دی۔ ابھی تک میری جیب میں ہے۔ دیکھ نہیں سکا۔ اخگر صاحب نے کہا کہ آپ جانتے ہیں، انگریزی ہماری زبان نہیں ___ ممکن ہے اس میں غلطیاں ہوں مگر اصل مقصد ان جذبات کا اظہار ہے جو آپ کی نسبت میرے دل میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب بولے کہ مولانا! زبان کی کچھ پروا نہیں، زبان تو اہلِ فکر خود پیدا کرتے ہیں۔ اہلِ زبان کے متعلق تو اتنا سمجھتا ہوں کہ اُنھیں چکی چولھے کے الفاظ کافی تعداد میں معلوم ہوتے ہیں ورنہ علمی خیالات کے اظہار کے لیے

ہوسِ منزلِ لیلیٰ نہ تو رکھتا ہے نہ میں

[صدیقی، ص ۷۰۰]

2۔ ۱۹۳۶ء میں عین جوانی میں فوت ہو گئے۔

اہلِ زبان اور غیر اہلِ زبان دونوں برابر ہیں۔ دونوں کو خیالات کے مطابق الفاظ تراشنے پڑتے ہیں۔ مرزا بیدل[3] کی فارسی کو اہلِ زبان نے کبھی تسلیم نہیں کیا کیونکہ وہ محاورات تک نئے پیدا کر لیتے ہیں۔ مثلاً اُن کا مصرع ہے:

ابر ہر قدمے خرام می کاشت[4]

"خرام کاشتن" [چلنے کی فصل اگانا] فارسی میں کوئی محاورہ نہیں مگر جو خیال بیدل کے ذہن میں تھا، اُس کو ادا کرنے کے لیے لازمی تھا کہ یہی الفاظ استعمال کیے جاتے، کیونکہ ان کے علاوہ اور کوئی الفاظ فارسی زبان میں اس مفہوم کو ادا نہیں کر سکتے۔ افسوس تو یہ ہے کہ جس طرح مذہب میں تقلید کی جاتی ہے۔ مانا کہ محاورے میں کسی حد تک اہلِ زبان کی پیروی مناسب ہے مگر لطف تو یہ ہے کہ ترکیب اور استعارے میں بھی اساتذہ کی سند طلب کی جاتی ہے۔ اگر یہ خیال رکھا جائے تو جدت و اختراع کا دروازہ بالکل بند ہو جاتا ہے۔

وضعِ الفاظ

میں نے کہا کہ بالعموم جدتِ ترکیب واستعارہ پر اعتراض نہیں ہوتا بلکہ اس امر پر کہ ایک غیر اہلِ زبان اظہار خیال کے لیے کوئی نیا لفظ یا محاورہ پیدا کرتا ہے، حالانکہ اصل زبان میں اس کے لیے پہلے بھی لفظ یا محاورہ موجود ہوتا ہے۔ کہنے لگے ہاں، جب زبان میں اچھا لفظ اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے موجود ہو تو نیا لفظ تراشنا غیر ضروری ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسا کر بھی دے اور لفظ صوتی لحاظ سے غیر موزوں بھی نہ ہو تو میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ البتہ یہ شرط ہے کہ وہ نیا لفظ کسی ہم جنس زبان کا ہو۔ جیسے اُردو میں عربی، فارسی، پنجابی وغیرہ کا لفظ کھپ سکتا ہے مگر لاطینی وغیرہ کا نہیں۔

اقبال کی فارسی:

---

[3] برصغیر کے بلند پایہ فارسی شاعر (۱۰۵۴ھ-۱۱۳۳ھ)

[4] ابر ہر قدم پر چلنے (خرام ناز) کی روایت کو بڑھا رہا ہے۔ [مترجم: محمد سہیل عمر]

میں نے کہا "آپ نے فرمایا ہے کہ لفظ صوتی لحاظ سے غیر موزوں نہ ہو۔ کیا سماعت کی اس تربیت کے لیے زبان کے بکثرت مطالعے کی ضرورت نہیں ہوتی؟" فرمایا "میں اس صفت کو ایک عطیۂ قدرت سمجھتا ہوں۔ فارسی میں میری رسمی تعلیم صرف میٹرک تک ہے یا اس سے پہلے کچھ مکتبوں میں پڑھی تھی۔ مگر اب جو میں فارسی میں لکھتا ہوں اور کسی محاورے کے متعلق شک گزرتا ہے اور اس وقت کوئی لغت یا کتاب پاس نہیں ہوتی تو اپنے کانوں پر بھروسہ کرتا ہوں۔ جو الفاظ کانوں کو بھلے معلوم ہوں وہی رکھ دیتا ہوں۔ اور ہمیشہ دیکھا ہے کہ بعد میں وہی محاورات درست ثابت ہوئے ہیں۔"

اس موقع پر اخگر صاحب نے دریافت کیا کہ ڈاکٹر صاحب! آپ کے فارسی کلام پر بھی کبھی اہلِ زبان نے کچھ رائے ظاہر کی ہے؟ بولے کہ اعتراض کرتے ہوں گے لیکن مجھ تک کبھی نہیں پہنچے۔ البتہ بعض اہلِ زبان سے تعریف سننے میں آئی ہے۔

میں نے کہا کہ امیر خسرو پر [5] بھی اہلِ فارس نے یہی اعتراض کیا ہے کہ وہ فارسی میں ہندی الفاظ بے تکلف استعمال کر جاتے ہیں مثلاً:

عالم بہ منت یک طرف، آں شوخ تنہا یک طرف[6]

میں "منت" کا لفظ ان معنوں میں نہیں جن میں یہ فارسی زبان میں مستعمل ہے۔ بولے "ہاں! مگر یہ بات بھی ہے کہ بعض اوقات ایک ہی لفظ ہندوستان اور ایران میں مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے لفظ "نخواہ" سے ہم کیا مراد لیتے ہیں اور وہ کیا۔"

اُردو میں پنجابی

اسی سلسلے میں فرمایا "میرا ہمیشہ ایسا خیال رہا ہے کہ پنجاب میں طلبہ کے لیے جو اُردو کورس [نصاب] ہوں، اُن میں حسبِ ضرورت پنجابی کے الفاظ

---

[5] مشہور مؤرخ و شاعر (۵۰۶ھ۔ ذی قعدہ ۷۲۵ھ۔)

[6] ساری دنیا منت ساجت میں لگی ہے اور وہ شوخ مان کے نہیں دیتا۔ [مترجم: محمد سہیل عمر]

استعمال ہونے چاہئیں۔ مثلاً مولانا آزاد[7] نے اپنے قاعدے میں ایک جگہ لکھ دیا ہے کہ "لیزم ہلاؤ"[8]۔ دہلی میں تو یہ لفظ بچے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں مگر پنجاب میں بچے تو کیا سمجھیں گے، اُستاد بھی اس کے معنی دریافت کرتے رہتے ہیں۔ اگر اس کے بجائے کوئی ایسانام استعمال ہوتا جو اُردو کا نہ سہی لیکن پنجاب میں عام ہوتا تو یقیناًزیادہ مفید رہتا۔ اسی امر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم نے پنجاب میں یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ زراعت کی کتابوں میں بالخصوص پنجابی کے الفاظ بے تکلف استعمال کیے جائیں۔"

مغرب کی تقلید

میں نے سوال کیا کہ پرسوں آپ نے فرمایا کہ ہمیں مغربی تہذیب کی نقل نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ اس سے اس کی فضیلت کا عملی اقرار ہوتا ہے، جس کے ہم اصولاًخلاف ہیں۔ ادھر ہم کہتے ہیں کہ مغربی علوم و فنون، تہذیب و تمدن کی بنیاد ہم نے رکھی۔ گویا ہم تمدن و ترقی کو ایک خاص مقام پر پہنچا کر ٹھہر گئے۔ اہلِ مغرب نے وہیں سے لے کر اُسے آگے ترقی دی۔ اب چند صدیوں کے بعد ہم جو جاگے تو اہلِ مغرب کو کہیں سے کہیں پہنچاہوا پایا۔ کیا اس وقت ہمیں اپنی قوتِ تخلیق سے کام لے کر اس مقام سے اپنی ترقی کی منزل شروع کرنی چاہیے جہاں ہم نے اُسے چھوڑا تھا یا وہاں سے جہاں اُسے اہلِ مغرب نے اس وقت پہنچا رکھا ہے؟ کیا مناسب نہ ہوگا کہ پہلے وہ سب کچھ حاصل کر لیں جو اہلِ مغرب معلوم کر چکے ہیں اور پھراپنی قوتِ تخلیق کو بروئے کار لا کر آگے ترقی کریں؟ میرا خیال ہے کہ ترک اس وقت اسی چیز پر عمل کر رہے ہیں۔

ترکوں کا رویہ

فرمایا کہ نقل اور اخذ میں بڑا فرق ہے۔ ترک نقل کررہے ہیں،نہ کہ اخذ۔

---

[7] مولانا محمد حسین آزاد(م ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء،۹محرم الحرام ۱۳۲۸ھ)
[8] مکدر ہلاؤ۔

نقل سے قوتِ تخلیق کمزور ہو جاتی ہے مگر اخذ ترقی کے لیے لازمی ہے۔ مغرب نے جو نئی تخلیقات اور ایجادات کی ہیں، ہمارے لیے ضروری ہے کہ اُن کو فوراً اخذ کرکے اپنی مزید ترقی کی بنیاد رکھیں۔ایک یہ امر بھی مدِ نظر رہے کہ تقلید اور نقالی علوم اور سائنس میں مذموم نہیں بلکہ ضروری ہے لیکن مذہب ، اخلاق اور تمدن میں یہ زہر کا حکم رکھتی ہے۔ مثلاً تُرکوں کو دیکھیے، انھوں نے ہیٹ [انگریزی ٹوپی] کو علامتِ ترقی سمجھ لیا ہے، حالانکہ اصل چیز جو لازمۂ ترقی ہے وہ ہیٹ کے نیچے ہے۔

میں نے غازی رؤف بے[9] اور ترکوں کے متعلق دریافت کیا تو بولے کہ غازی رؤف بے، مصطفیٰ کمال سے اختلاف کے باعث مدت سے فرانس میں رہتے ہیں۔ مصطفیٰ کمال اُن کو بارہا ترکی آنے کی دعوت دے چکے ہیں مگر یہ نہیں جاتے۔ایک تو اُنھیں اعتماد نہیں۔دوسرے اپنا وہاں جانا بے سود سمجھتے

---

[9] ۱۸۷۱ھ میں بمقام استنبول پیدا ہوئے۔اُن کے والد محمد مظفر پاشا، عثمانی بحریہ کے رکن تھے۔چنانچہ رؤف پاشا کو بحریات کی تعلیم دلائی گئی۔ تکمیلِ تعلیم و تربیت کے بعد جہاز "مجیدیہ" پر تعینات کیے گئے۔جب اطالیہ نے طرابلس پر حملہ کیا تو سامانِ رسد پہنچانے کے لیے کچھ عرصہ مصر میں مقیم رہے۔جنگِ طرابلس میں اطالیہ کی ناکہ بندی کے علی الرغم رؤف پاشا اپنا فریضہ انجام دیتے رہے۔

جنگ بلقان چھڑی تو جہاز "حمیدیہ" کے سپہ سالار تھے۔رؤف پاشا نے ایک بحری جہاز کے کمانڈر ہونے کی حیثیت سے کم تر وسائل کے باوجود یونانی جاہ کن کشتیوں پر حملہ کیا اور اُنھیں درۂ دانیال سے مار بھگایا اور خود درۂ دانیال سے نکل کر پے درپے دشمنوں پر حملہ آور ہوتے رہے۔"حمیدیہ" نے دشمن پر لرزہ طاری کر دیا اور اُس کا بے پناہ نقصان کیا۔

ایک دوسرے جہاز "عثمان اوّل" کی کمان بھی اُن کے حوالے کر دی گئی تھی۔ قسطنطنیہ پر اتحادی قبضے کے بعد یہاں سے نکل کر مجلسِ ملیہ انگورہ کے قیام میں شریک ہوئے اور مجلسِ ملیہ کی وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز رہے۔جنگی خدمات، فوجی قابلیت اور بحری تجربات کی بنیاد پر ۲۵ دسمبر ۱۹۲۱ کو مجلسِ ملیہ نے اُن کو "پاشا" کا خطاب دیا تھا۔

ترکی کی قومی حکومت بننے کے بعد مصطفیٰ کمال سے ان کا اختلاف ہوااور ملک چھوڑ کر فرانس میں سکونت اختیار کرلی۔ اوائل ۱۹۳۳ میں ہندوستان تشریف لائے۔ جامعہ ملیہ دہلی میں توسیعی لیکچر دیے۔سیاحتِ ہند سے واپس گئے تو مصطفیٰ کمال نے جملہ جلا وطن ترک راہنماؤں کو واپس آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ غازی رؤف پاشا بھی وطن گئے اور وزارتِ بحریہ کے نگران مقرر ہوئے۔ بعد ازاں خرابیٔ صحت کی بنا پر اس منصب سے علیحدگی اختیار کرلی اور مجلسِ ملیہ کے رکن منتخب ہوئے (ملخص از عبدالمجید عتیقی۔ترکانِ احرار۔)

ہیں۔ کیونکہ ترکی کی مجلسِ قومی میں حکومت کی مخالفت کا کوئی وجود نہیں اور کوئی شخص مصطفیٰ کمال کے خیالات کے برخلاف آواز نہیں اُٹھا سکتا۔

ترکی کی موجودہ حالت کے متعلق فرمایا کہ میں فوزی پاشا اور منیر بے ایسے بڑے بڑے آدمیوں سے ملا اور ذاتی معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ترک مصطفیٰ کمال کی بدعات سے خوش نہیں ہیں۔ بلا مبالغہ تقریباً ۹۶ فی صد لوگ مصطفیٰ کمال کے مخالف ہیں۔ ایک آدھ دفعہ اس پر قاتلانہ حملے بھی ہو چکے ہیں اور کچھ زیادہ بعید نہیں کہ اُسے قتل کر دیا جائے۔ اگر ایسا نہ بھی ہوا تو ترک زیادہ سے زیادہ اُس کی زندگی تک اس کے استبداد کو ناچار گوارا کرلیں گے۔ اس سے زیادہ دیر تک ہر گز نہیں۔ ردِ عمل ابھی سے شروع ہو گیا ہے۔[10] ترک نوجوان اُسے سلطان عبدالمجید سے بھی زیادہ بُرا سمجھتے ہیں۔[11] صرف اس کی خدمات کا خیال اور خانہ جنگی کا اندیشہ ہے، جو ترکوں کو کسی جارحانہ اقدام سے باز رکھتا ہے۔ ورنہ ترک ویسے ہی پکے مسلمان ہیں جیسے اُن کے آباؤاجداد تھے اور وہ تفریح (مغربیت) کو اچھا نہیں سمجھتے۔ مختصر یہ کہ ترکی کا مستقبل کسی صورت میں بھی مایوس کن نہیں ہے۔

اسلام کا مستقبل

یہاں سے سلسلۂ کلام مغربیت اور اسلام کے تصادم کی طرف چل پڑا۔ فرمانے لگے کہ یورپ کے سفر[12] کے دوران میں مَیں نے دیکھا کہ یورپ میں خواص کے علاوہ اب عوام میں بھی اسلام کے متعلق دلچسپی اور تجسس روز

---

[10] ترکوں کے جدید ذہنی رجحانات کے لیے ملاحظہ ہو خلیل حامدی، ترکی قدیم وجدید (روداد سفر)۔

[11] سلطان عبدالمجید (م ۲۵ جون ۱۸۶۱ء) کو اصلاحات سے بہت دلچسپی تھی اور اُنھوں نے بہت سے یورپین [یورپی] طور طریقے رواج دیے تھے۔ سلطان عبدالمجید کے آخری دورِ حکومت میں مختلف جنگوں خصوصاً جنگِ کریمیا کی وجہ سے سلطنت کی مالی حالت ابتر ہو چکی تھی، خزانہ خالی تھا اور اقتصادی بدحالی اور مشکلات کی وجہ سے عوام میں بے چینی پھیل گئی تھی۔

[12] علامہ دوسری گول میز کانفرنس (منعقدہ ۱۷ ستمبر ۱۹۳۱ء تا یکم دسمبر ۱۹۳۱ء) میں شرکت کے لیے انگلستان گئے تھے۔ اس سفر کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو محمد حمزہ فاروقی، سفرنامہ اقبال۔

بروز بڑھ رہا ہے۔ اُدھر مشرق میں مغربی تہذیب کا اثر ترقی پر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سامی تہذیبوں میں صلیبی جنگوں نے جو تفریق ڈال دی تھی وہ اب دور ہونے والی ہے اور مشرق و مغرب پھر بغل گیر ہوں گے۔ میں نے کہا "اغلب ہے کہ ایسا ہو جائے مگر کیا معلوم اسلام مغربی تہذیب کو اپنا لے یا مغربی تہذیب اسلام کو جذب کر لے؟"۔

بولے "ہاں عقلی طور پر تو دونوں صورتیں ممکن ہیں، مگر ہمارے عقیدے اور اسلام کی گذشتہ تاریخ کی رُو سے پہلی صورت ہی کی تائید ہوتی ہے۔ عقیدۃً تو [إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ [بیشک ہم نے اتارا ہے یہ قرآن اور بیشک ہم خود اس کے نگہبان ہیں] (القرآن، الحجر: آیت ۹) کا وعدہ اس امر کی کافی دلیل ہے کہ اسلام ہی غالب آئے گا۔ ساتھ ہی اسلام کی تاریخ صاف صاف بتاتی ہے کہ اسلام کے مقابلے میں مختلف تہذیبیں آئیں مگر اسلام نے مقابلہ کیے بغیر اُن کو اپنا کر اُن پر ایسی مہر ثبت کی کہ وہ خود اسلامی تہذیب کا جزو بن گئیں۔ یونان اور ایران کی تہذیبیں دونوں اسلام میں جذب ہو کر گویا "مسلمان" ہو گئیں۔ اسی طرح اغلب یہی ہے کہ مغربی تہذیب بھی اسلام میں جذب ہو کر اسلامی ہو جائے گی۔ قیاس یہی کہتا ہے، آگے خدا کو معلوم کیا ہوگا۔ کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔"

فلسفہ اور مذہب

یہاں پہنچ کر میں نے اپنی نظم "سوال بہ اقبال"[13] یاد دلائی اور اور کہا کہ میں نے آپ کے ارشاد کے مطابق آپ کے انگریزی خطبات[14] کا مطالعہ کیا ہے۔ بعض نکات کچھ صاف ہو گئے مگر کچھ ابھی باقی ہیں۔ اس پر فرمایا کہ نہیں۔ جو آپ کہتے ہیں کہ صاف ہو گئے ہیں وہ بھی صاف نہیں ہوں گے۔

---

[13] اسد ملتانی مرحوم نے فلسفۂ خودی کے بعض پہلوؤں پر علامہؒ سے سوالات کیے تھے۔ یہ اشعار ماہنامہ معارف اعظم گڑھ بابت ماہ فروری ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئے تھے۔

[14] Muhammad Iqbal, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, [London, Oxford University Press, 1934.]

حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ انسان کو کبھی مطمئن نہیں کر سکتا۔ فلسفے کا کام تو یہ ہے کہ آج چند مشاہدات پر بنیاد رکھ کر ایک کانسپٹ[خیال] قائم کیا جاتا ہے جو یقینی نہیں بلکہ صرف ممکن ہوتا ہے۔ کل ماحول مختلف ہو جاتا ہے۔ نقطۂ نظر بدل جاتا ہے تو ایک دوسرا کانسپٹ قائم کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح سلسلہ بہ سلسلہ انسان بڑھتا چلا جاتا ہے مگر کسی منزل تک نہیں پہنچتا۔ اگر فلسفہ انسان کی تسکین کر سکتا تو مذہب کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ مذہب کا وجود ہی اس کمی کو پورا کرتا ہے۔ ریلیجس ایکسپیرینس (حاسۂ مذہبی) کم از کم فرد کی تسکین ضرور کر دیتا ہے۔ ہمارے صوفیائے کرامؒ نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ یہ حاسۂ مذہبی معانقہ و توجہ سے ایک فرد سے دوسرے فرد میں منتقل کیا جائے۔ بالخصوص نقشبندیہ اور مجددیہ سلسلے کو اس میں کامیابی بھی ہوئی۔ میں نے پوچھا "آپ محض منقولات پر اعتبار کرتے ہوئے فرما رہے ہیں یا تجربۃً درست سمجھتے ہیں؟" بولے کہ ان کی صحت میں مجھے بالکل شک نہیں۔ البتہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہوتا کیونکر ہے۔ ممکن ہے کہ علم نفسیات ترقی کر کے اس راز کو سمجھنے کے قابل ہو سکے۔

میں نے سوال کیا کہ آخر اس حاسۂ مذہبی کے حصول کا طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟ بولے "آپ نے کون سا امتحان پاس کیا ہے؟" میں نے کہا "بی۔اے" کا۔ بولے کہ اس کے لیے کتنا وقت صرف کیا؟ میں نے کہا "چودہ برس" کہنے لگے "تو کم از کم کچھ سال تو اس طرف بھی لگائیے۔ یونہی کیوں کر حاصل ہو جائے گا؟" میں نے کہا "یہ تو بے شک درست ہے مگر ایسے شخص نظر نہیں آتے جو راہنمائی کر سکیں۔ آپ نے خود بھی تو صوفی کو مخاطب کر کے لکھا ہے کہ :

ہوسِ منزلِ لیلیٰ نہ تو داری و نہ من[15]

15

ہوسِ منزلِ لیلیٰ نہ تو رکھتا ہے نہ میں

[صدیقی، ص ۷۰۰]

[کلیات فارسی، ص ۳۰۸]

غیر معمولی انسان

مسکرا کر کہنے لگے کہ یہ من حیث الجماعت لکھا ہے اور واقعی اس وقت صوفیہ کا یہی حال ہے۔

لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جینیس (غیر معمولی انسان) ہر زمانے میں موجود ہوتے ہیں۔ کبھی زیادہ اور کبھی کم۔ آج کل بھی ایسے شخص ضرور ہوں گے اور ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب جماعت روبہ ترقی ہوتی ہے تو اس میں بکثرت جینیس پیدا ہوتے ہیں اور انحطاط کے زمانے میں کم۔ ترقی پذیر جماعتوں میں اگر ایک غیر معمولی انسان اٹھ جاتا ہے تو فوراً اُس کی جگہ پُر کرنے کو دوسرا پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن رُو بہ انحطاط جماعتوں میں ایک جینیس اٹھ جانے سے وہ جگہ خالی ہی رہتی ہے۔

میں نے کہا کہ جماعت کی اصلاح جینیس کی کثرت پر موقوف ہے اور بقول آپ کے جینیس بکثرت اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب جماعت رُو بہ ترقی ہو، تو یوں کہنا چاہیے کہ انسان کا اختیار کچھ نہیں۔ قدرت جب چاہتی ہے جماعت کو ترقی دے دیتی ہے اور جب چاہتی ہے گرا دیتی ہے۔ یہ تو فیٹلیزم (جبریت) ہوئی۔ بولے "اس میں کیا شک ہے۔ فیٹلیزم سے قطعاً انکار نہیں ہو سکتا۔ سائنس بھی اس کے ماننے پر مجبور ہے۔ اگرچہ وہ اس لفظ سے ڈرتی ہے اور اس کی جگہ پری ڈسٹی نیشن (مقتدر) کا لفظ استعمال کرتی ہے مگر بات ایک ہی ہے۔

جینیئس کی پیدائش کے متعلق ابھی تک انسان کچھ نہیں معلوم کر سکا۔ خبر نہیں قانونِ حیات کے اسرار کیا ہیں؟ ممکن ہے کہ آئندہ چل کر انسان کچھ زیادہ معلومات بہم پہنچا سکے۔ سر دست تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس

طرح سمندر کبھی کبھی لہروں کے ساتھ ساتھ موتی اچھال کر کنارے پر پھینک دیتا ہے اسی طرح فطرت بھی کبھی کبھی جینیئس اچھال دیتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ زندگی بھی "مقادیر برقیات" [کونٹم] کے مطابق سفر کرتی ہے۔" میں نے کہا یعنی اُچھل اُچھل کر چلتی ہے؟" فرمایا "ہاں! بالکل اسی طرح۔"

عالم اسلام

عالم اسلام کے متعلق فرمایا کہ پچھلی چند صدیوں میں اسلام کا زمانۂ انحطاط رہا، اس لیے اعلیٰ شخصیتیں بہت وقفے کے بعد پیدا ہوئیں۔ مثلاً امام غزالی[16]، مولانا روم[17] اور شاہ ولی اللہ[18] جیسی ہستیاں۔ مگر کچھ عرصے سے رنگ بدلا ہوا نظر آتا ہے اور اعلیٰ ہستیاں پے بہ پیدا ہوئی ہیں۔ مثلاً سر سید احمد خاں[19]، جمال الدین افغانی،[20] قاضی اعظم جان،[21] (روس)، مفتی محمد عبدہ،[22] سعد زاغلول پاشا[23] اور موجودہ زمانے میں امان اللہ خاں[24]، رضا شاہ،[25] مصطفیٰ کمال[26] اور ابن سعود[27] وغیرہ۔ یہ سب اس امر کی علامت ہیں

---

[16] ۴۵۰ھ/۱۰۸۵ء میں پیدا ہوئے اور ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء میں وفات پائی۔

[17] ترکی کے شہرۂ آفاق شاعر و صوفی، (۶۰۴ھ۔جمادی الثانی ۶۷۲ھ)

[18] ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۱۶۷ھ/۱۷۶۳ء میں فوت ہوئے۔

[19] بانی علی گڑھ تحریک، (۱۸۱۷/۱۲۳۲ھ تا ۱۸۹۸/۱۳۱۵ھ)۔

[20] اتحادِ عالم اسلام کے عظیم داعی (۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء۔شوال ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۷)

[21] روس کے مسلمان مصلح

[22] مفتی مصر و شاگرد سید جمال الدین افغانی (۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء۔۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء)

[23] مصر کی قوم پرور اور سرفروش پارٹی "حزب الوفد" کے بانی (م۱۹۲۷ء)

[24] سابق شاہ افغانستان (۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲ء۔۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء)

[25] بانیٔ خاندان پہلوی و والدِ محمد رضا شاہ پہلوی (۱۲۹۵ھ/۱۸۷۷ء۔۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء)۔

[26] جدید ترکی کے بانی (۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء۔۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء)

[27] بانی حکومت سعودیہ عربیہ ابن سعود عبدالعزیز عبدالرحمان (۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء۔۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء)

کہ اسلام میں دوبارہ ترقی کے آثار پیدا ہورہے ہیں اور ممکن ہے کہ بہت جلد کوئی غیر معمولی انسان انقلاب کا باعث ہو۔

مردِ منتظر

یہاں پہنچ کر میں نے سوال کیا کہ آپ کے اس خیال کے متعلق طرح طرح کے شکوک ظاہر کیے جاتے ہیں کہ آپ اعلیٰ انسان سپر مین کے منتظر ہیں، جیسا کہ آپ نے اسرار و رموز میں بھی فرمایا ہے:

اے سوارِ اشہبِ دوران بیا[28]

اس سے کیسی شخصیت مراد ہے؟ کیا آپ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی اور انسان کامل کی توقع بھی رکھتے ہیں؟ بولے "ہر گز نہیں۔ میں دوسروں، بالخصوص اہلِ شیعہ کی طرح کسی خاص انسان کے انتظار میں نہیں اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی انسان کامل کی توقع ہو سکتی ہے۔ میں نے جس کی تمنا ظاہر کی ہے وہ یہی اعلیٰ قسم کی ہستیاں ہیں جو آکر سوسائٹی کو بلند کر دیتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ایک ہی ہستی ہو بلکہ ممکن ہے کہ ایک قوم کی قوم ہو۔" میں نے کہا "آپ کے مصرعِ مذکور سے تو ایک ہی انسان کا خیال پیدا ہوتا ہے۔" بولے "نہیں، آپ ہی بتایئے کہ ایک ایسی قوم کی توقع ظاہر کرتے ہوئے میں شاعرانہ زبان میں ان الفاظ کے علاوہ اور کیا الفاظ استعمال کر سکتا تھا؟"

مکتوباتِ مجدد سرہندیؒ:

سلسلۂ گفتگو پھر تصوف کی طرف مڑا۔ فرمانے لگے کہ تصوف کا علم پرانا اور

28

اے زمانے کے مرکب پر سوار، آ جا

کسی قدر نکما ہو چکا ہے۔ ضرورت ہے کہ زمانۂ حاضر کے علم نفسیات کی روشنی میں اس کی پھر تجدید کی جائے۔ اس کام میں شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی ؒ[29] کی تحقیقات بہت امداد دے سکتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اُن کے مکتوبات و ملفوظات کا ایک منتخب ایڈیشن [مجموعہ] شائع کیا جائے۔ جو (مجموعہ) اس وقت موجود ہے اس میں بہت ہی کانٹ چھانٹ کی ضرورت ہے کیونکہ انھوں نے اپنے معتقدین کے ہر قسم کے سوالات کے جوابات دیے ہیں۔ بعض نہایت عام فقہی مسائل ہیں اور بعض نہایت اہم صوفیانہ نکات۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ صوفیانہ نکات کا انتخاب علیحدہ شائع کیا جائے اور پھر اس کی بنا پر اور موجودہ نفسیات کی روشنی میں جدید علم تصوف کی بنیاد ڈالی جائے۔

مقصدِ حیات:

اخگر صاحب نے سوال کیا کہ ڈاکٹر صاحب! انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہو نا چاہیے؟ بولے "اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ ویسے زندگی خود بخود کوئی نہ کوئی مقصد اپنے لیے متعین کرلیتی ہے اور اس کے مطابق عمل کرتی ہے۔"

فہم ِ قرآن:

مولانا محمد احمد نے پوچھا کہ قرآن کس طرح پڑھنا چاہیے؟ میں نے ندوہ کا امتحان پاس کیا ہے اور مجھ پر قرآن شریف کی تعلیم کے متعلق کچھ ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ مگر حال یہ ہے کہ مختلف بزرگ مختلف راستوں کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ مثلاً ترجمان القرآن[30] ایک نقطۂ خیال پیش کرتا ہے اور آپ کا کلام دوسرا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سی راہ اختیار کی جائے؟ یہ

---

[29] ۹۷۱ھ / ۱۵۶۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۵۴۳ھ/۱۶۲۷ء میں فوت ہوئے۔

[30] مولانا ابوالکلام آزاد کی نامکمل تفسیر قرآن۔

سن کر اخگر صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "مولانا! یہ وہی آپ کی رباعی والا مضمون ہے:

تفسیر نے قرآں کو چھپا رکھا ہے [31]

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے بہترین ذریعہ اپنا ضمیر ہے۔ اس کے متعلق مجھے اپنے والدِ مرحوم کا قول یاد ہے، بلکہ اس قول نے میری زندگی پر بہت کچھ اثر بھی ڈالا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ میں ابھی سکول میں تھا یا کالج کی پہلی جماعت میں جب ایک صبح والدِ مرحوم میرے کمرے میں آئے۔ میں حسبِ معمول قرآن شریف کی رسمی تلاوت کر رہا تھا۔ پوچھنے لگے کہ کیا پڑھ رہے ہو؟ میں حیران تھا کہ آخر اس سوال سے کیا مطلب ہے جب کہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ میں قرآن پڑھ رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ قرآن مجید پڑھ رہا ہوں۔ کہنے لگے "ہاں! مگر قرآن شریف میں کیا پڑھ رہے ہو؟ کیا سمجھتے بھی ہو یا یونہی پڑھے چلے جاتے ہو؟" میں نے کہا "تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں اور کچھ نہ کچھ مطلب بھی سمجھتا ہوں۔" بولے نہیں۔ قرآن شریف کو اُس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا جب تک یہ اُسی طرح نازل نہ ہو جیسے رسول اللہ [ﷺ] پر نازل ہوا تھا۔" میں یہ سن کر متعجب ہوا کیوں کہ اِس فقرے کا مفہوم پوری طرح نہ سمجھ سکا۔ لیکن یہ فقرہ میرے دماغ میں چکر لگاتا رہا اور ایک عرصے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ واقعی اس میں ایک بڑی رمز پنہاں ہے۔ اور اب تو میں اس کی صداقت کا پوری طرح قائل ہوں۔ یہی نقطۂ خیال میری زندگی پر بہت کچھ اثر انداز بھی ہوا ہے۔ واقعی انسان کے ضمیر کی نشوونما اس قدر ہونی چاہیے کہ قرآن شریف کی حقیقت کو اُسی طرح

---

[31] اس ملاقات سے چند روز پہلے کسی اور مجلس میں اخگر صاحب نے کچھ رباعیات سنائی تھیں جن کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا۔ ایک رباعی ڈاکٹر صاحب کو یاد رہ گئی تھی۔

سمجھے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محسوس فرماتے تھے اور ایسا معلوم ہو کہ قرآن براہِ راست نازل ہو رہا ہے۔

۱۷

اقبال کا سفر حیدر آباد ۱۹۲۹ء*

محمد ذکی الدین احمد

میری مڈل اسکول کی طالب علمی کا زمانہ تھا اقبال حیدر آباد میں کافی مشہور و مقبول تھے ان کی چھوٹی چھوٹی نظمیں اس زمانہ کی اردو درسی کتابوں میں شامل ہوتی تھیں جو اکثر لاہور ہی میں مرتب اور طبع ہوا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ زمیندار اور پیسہ اخبار میں آئے دن اقبال کا کلام شائع ہوتا رہتا تھا۔ بعض طویل نظمیں تو کتابچوں کی صورت میں شائع ہو چکی تھیں۔ اس میں غالباً مرغوب ایجنسی لاہور کے شائع کردہ 'تصویر درد'، 'شمع و شاعر' وغیرہ کے علاوہ 'شکوہ' و' جواب شکوہ' بھی تھے جو بہت مقبول ہوئے۔

دن گزرتے گئے۔ اقبال کے زیادہ حکیمانہ کلام کے مجموعے شائع ہوتے گئے۔ اور ان کی عظیم شخصیت کو سمجھنے کا موقع ملتا رہا۔ بی۔ اے کلاس میں میرا مضمون فلسفہ تھا۔ فلسفہ کے اساتذہ میں مولانا محمد عبدالباری ندوی مرحوم اور پروفیسر ولی الرحمٰن مرحوم کے علاوہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم بھی تھے۔ خلیفہ صاحب اقبال کے ہم وطن اور شیدائی تھے۔ کبھی کبھی تو وہ اپنا پورا لیکچر اقبال کے یار ومی کے کسی ایک شعر ہی پر دے دیتے۔

اس زمانے میں جامعہ عثمانیہ کے مختلف شعبے ان عمارتوں میں واقع تھے اب ان میں اسٹیٹ بنک سے لے کر باوا گلاس تک مختلف ادارے کام کرتے

---

* مجلہ اقبال، جلد ا، شمارہ ا، حیدرآباد دکن، اقبال اکیڈمی، اکتوبر ۱۹۷۷ء۔

ہیں۔ ہماری تعلیم اردو زبان میں رہی ہے جس کی وجہ سے اساتذہ کے لیکچرز زیادہ سریع الفہم اور دلچسپ معلوم ہوتے تھے اور جی میں چاہتا تھا کہ سیکھتے جائیں اور پڑھنے لکھنے میں عمر گزاریں۔ ہر ادبی اور تہذیبی محفل تک ہر شخص کی رسائی نہیں تھی۔ انفرادی حکومت کا دور دورہ تھا۔ اعلیٰ درجہ کی محفلیں امرا کے ایوانوں میں منعقد ہوا کرتی تھیں جن میں مہاراجہ کشن پرشاد کی دیوڑھی سب سے زیادہ قابل ذکر ہے۔ اقبال نے مہاراجہ کی دیوڑھی کے مشاعروں میں اپنا کلام سنایا جس کو چند خاص لوگوں نے سنا۔

۱۴جنوری ۱۹۲۹ء کی صبح تھی جب اقبال جو مدراس میں اپنے شہرہ آفاق لکچرس (اسلامی الہیات کی تشکیل جدید) ختم کر کے لوٹ رہے تھے اور جنھیں حیدر آباد میں بھی وہی لکچرز دینے کے لئے مدعو کیا گیا تھا، سرکاری مہمان کی حیثیت سے حیدر آباد پہنچنے والے تھے۔ اس وقت سر اکبر حیدری وزیر فنانس تھے۔ سر اکبر کی شخصیت نہایت متنوع اور ہمہ گیر تھی۔ اگرچہ وجاہت جسمانی میں وہ پست قامت تھے لیکن ایک بہت بڑی شخصیت کے حامل تھے۔ سیاست اور نظم و نسق سے گہری دلچسپی کے باوجود ریاست حیدرآباد اور ملک ہندوستان کی عظیم علمی شخصیتوں سے ان کے قریبی مراسم تھے اقبال سے بھی تھے۔ اقبال کی حیدر آباد میں آمد کے موقع پر ان کے استقبال کے لئے جو سرکاری کمیٹی [مجلس] تشکیل دی گئی تھی سر اکبر اس کے قائد تھے۔ مدراس سے آنے والے مسافروں کی ٹرین سکندر آباد اسٹیشن پر ٹھہرتی تھی۔ سر اکبر اور دیگر معززین نے اقبال کا استقبال سکندر آباد اسٹیشن کے پلیٹ فارم [چبوترہ] پر کیا۔ اس وقت سکندر آباد اسٹیشن باہر سے آج کی طرح خوبصورت نہیں تھا بلکہ پتھروں کی بنی ہوئی ایک بلند عمارت پر مشتمل تھا۔

ان پتھروں پر کوئی استر کاری نہیں تھی۔ اسٹیشن کے باب الداخلہ پر ایسے ہی پتھروں کا بنا ہوا ایک مختصر سا پورٹیکو [بارہ دری] تھا۔ جو اب بہت

خوبصورت بنا دیا گیا ہے۔ مجھے بہ حیثیت صحافی اقبال کو دیکھنے کی ضرورت سے زیادہ ادب کے طالب علم کی حیثیت سے اس شاعر مشرق کو دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ ابھی میں اسٹیشن کے پور ٹیکو تک ہی پہنچا تھا کہ سر اکبر اور مجلس استقبالیہ کے دوسرے اراکین اقبال کو ساتھ لئے باہر پہنچ رہے تھے۔ میں نے اقبا ل کو پہلی دفعہ سکندر آباد ریلوے اسٹیشن کے پور ٹیکوں میں دیکھا۔ اقبال کی متعدد تصویریں چھپ چکی تھیں اور ان پر کئی چیزیں پڑھنے میں آئی تھیں جن کی وجہ سے میرے ذہن میں اقبال کی شخصیت کا تصور اتنا واضح تھا کہ جب میں نے انھیں پہلی دفعہ دیکھا تو کسی نئے پن یا حیرانی کا احساس نہیں ہوا۔ وہ متوسط القامت اور وجیہہ شخصیت کے حامل تھے۔۔اور کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ اقبال جب میرے قریب سے گزرے تو میں نے السلام علیکم کہہ کر ان کا استقبال کیا اقبال سلام کا جواب دیتے ہوئے ایک لمحہ کے لئے رکے اور مجھ سے مصافحہ کیا۔ بڑی شخصیتوں کے قریب، ان کے تواضع، گرم جوشی اور مصافحے سے بہ حیثیت صحافی اور طالب علم مجھے جو مسرت حاصل ہوئی اس کا اثر اور اس کی یاد آج بھی باقی ہے۔ اسٹیشن کے پور ٹیکو میں تو شک خانے کی چند موٹریں کھڑی تھیں۔ اقبال سر اکبر اور ان کے رفقاء چند لمحوں میں ان موٹروں میں بیٹھ کر اپنی منزلوں کو روانہ ہو گئے اسی شام یا دوسرے دن کی شام سے اقبال کے خطبات کا آغاز ہوا۔ ان خطبات یا لکچرس کا انتظام ٹاؤن ہال[ایوانِ بلد] میں کیا گیا تھا جس میں آج کل لیجسلیٹیو اسمبلی[مجلس قانون ساز] واقع ہے۔ اس زمانے کے جلسوں میں میکرو فون[آلہ مکبّرِ صوت] کا انتظام نہیں ہوا کرتا تھا اس کی اتنی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ اتنے بڑے عوامی جلسے میں تقریریں ہوں جیسے آج ہوتے ہیں اس وقت شاذ ہی ہوا کرتے تھے۔ اقبال کے خطبات ظاہر ہے کہ ایک علمی مجلس ہی کی دلچسپی کے لئے تھے یہ وہ خطبات تھے جو بعد میں *Reconstruction of Religious Thought in*

ری کنسٹر کشن آف ریلیجیس تھاٹ ان اسلام] *Islam*[1] کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے یہ خطبات اعلیٰ ترین حکیمانہ مباحث پر مشتمل تھے جن کو عوام تو کجا خاص اصحاب بھی جنھیں فلسفیانہ اور کلامی مسائل سے دلچسپی نہ ہو۔ شاید ہی سمجھ سکتے ہوں کیونکہ ان کے سمجھنے کے لئے اعلیٰ ترین مذاق علمی کی ضرورت تھی یہ خطبات اقبال کی ساری فکر زندگی کا ماحصل ہیں۔ خود اقبال نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ:-

من بہ طبع عصر خود گفتم دو حرف
کردہ ام بحرین را اندر دو ظرف
حرف پیچا پیچ و حرف نیشن دار
تاکم عقل و دل مردان شکار[2]

[کلیات فارسی، ص ۲۶۹]

یہ حرف پیچا پیچ، حریف نیش دار چھ خطبات یا لیکچرز پر مشتمل تھے یہ سارے خطبات انگریزی میں تھے اور لکھے ہوئے تھے۔ ٹاؤن ہال میں لیکچرز سنانے کا اہتمام اس طرح کیا گیا تھا کہ ہال کے وسط میں مقرر کے لئے ڈائس بنایا گیا جس کے اطراف سامعین کی نشستوں کی قطاریں تھیں۔ ابتدائی

---

[1] محمد اقبال، دی ری کنسٹر کشن آف ریلوجئیس تھاٹ ان اسلام، لندن، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۳۴۔

[2] ترجمہ:

چھیڑا ہے دو حرف سے عصر رواں کے ذہن کو
ہند میں نے دو پیالوں میں کیا بحرین کو
حرف پیچا پیچ میرے حرف میرے نیش دار
تاکہ یوں عقل و دِل مرداں کو میں کر لوں شکار

[صدیقی، ص ۲۷۲]

صفیں اہم شخصیتوں کے لئے تھیں۔ڈائس کے قریب ہی صحافیوں کے لئے چند نشستیں مختص تھیں میں صحافیوں کی نشست میں تھا جہاں سے مقرر صاف طور پر دیکھائی اور واضح طور پر سنائی دیتا تھا۔

اقبال کی حیدر آباد میں آمد کی خبریں اخباروں میں چھپ چکی تھیں ان کے خطبات سے ظاہر ہے کہ عوام کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی لیکن اقبال کو دیکھنے کے لئے لوگ بڑی تعداد میں ٹاؤن ہال پہنچ چکے تھے۔ ہال کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ ٹاؤن ہال کے برآمدوں اور صحن میں بھی کافی لوگ تھے۔ ہال کے دروازوں پر تو کافی ہجوم تھا۔ میں چونکہ ہال کے اندر پریس گیلری [گوشۂ صحافیاں] میں تھا اس لئے مجھے باہر کے ہنگاموں کا ٹھیک اندازہ نہیں ہوسکا لیکن بعد میں احباب سے سنا کہ مجمع کو منتشر کرنے کے لئے پولیس کو مداخلت کرنی پڑی۔ خیر! یہ جو کچھ بھی ہوا ہو جلسے کی کارروائی کا آغاز اپنے وقت پر ہوا ڈاکٹر اقبال اور سر اکبر حیدری ڈائس پر آگئے۔سب سے پہلے سر اکبر حیدری نے اپنے مخصوص لہجہ اور فصیح انگریزی میں اقبال کا مختصر سا تعارف کروایا اس کے بعد اقبال نے اپنا خطبہ پڑھنا شروع کیا۔

خطبات کی انگریزی نہایت فلسفیانہ اور بلیغ تھی اگرچہ اقبال کا لہجہ اور انداز متاثر کن نہیں تھا لیکن خطبات کا معیار اس قدر بلند تھا کہ سوائے چند لائق اصحاب اور فلسفے کے طالب علموں کے شاید ہی کوئی اسے سمجھ رہا ہو۔ ان خطبات کے وقت بھی اقبال مکمل سوٹ میں ملبوس تھے اور ان کی ٹائی کافی نمایاں تھی ان کا چہرہ بھرا بھرا سا تھا۔ لیکن ایک آنکھ کسی قدر چھوٹی اور دبی معلوم ہوتی تھی ان کی سنجیدگی اور آنکھوں کی چمک میں ایک حکیمانہ وقار تھا۔

اقبال خطبہ پڑھتے رہے او ر دروازوں کے پاس سے لوگوں کا ہجوم چھٹنے لگا۔ ہجوم چھٹا گیا یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ہال کی پچھلی نشستیں بھی خالی ہونے لگیں۔ خطبہ ختم ہونے تک صرف ابتدائی چند نشستوں کے لوگ باقی رہ گئے۔

جو لوگ موجو د تھے اُن میں کسی نے کچھ سمجھا کسی نے کچھ نہیں سمجھا میں نے اپنی بضاعت بھر جو کچھ سمجھا تھا اس کی پریس رپورٹ [اخباری روداد] تیار کر کے ا خبار صحیفہ کے مدیر کے حوالے کر دی۔ یہ رپورٹ صحیفہ کے دوسرے دن کی اشاعت میں شائع ہوئی۔ مجھے یہ ٹھیک سے یاد نہیں ہے کہ اقبال نے حیدر آباد میں وہ تمام خطبات سنائے تھے یا نہیں جو ان کی مطبوعہ کتاب *Reconstruction of Religious Thought is Islam* میں شامل ہیں۔ تاہم جہاں تک مجھے یاد ہے ان کے خطبات کا سلسلہ کم از کم چار دن تک چلتا رہا ۔ یا ممکن ہے چھ دن بھی چلا ہو۔ ہر روز ان خطبات کی پریس رپورٹ اخبار صحیفہ کے لئے میں ہی تیار کرتا تھا۔ یہ رپورٹ ہر روز ا خبار صحیفہ میں نمایاں طور پر چھپتی رہیں۔ یہاں ایک بات کاذکر چھوٹ گیا وہ یہ کہ پہلے دن جب اقبال نے اپنا خطبہ ختم کیا تو سامعین نے خطبہ کے بعد کلام سنانے کی فرمائش کی جسے قبول کرنے سے اقبال نے انکار کر دیا۔ پھر تو یہ فرمائش ایک شدید اور مسلسل اصرار میں بدل گئی لیکن اقبال ٹس سے مس نہیں ہوئے وہ اس موقع پر اپنا کلام سنانا نھیں چاہتے تھے۔ انھوں نے نہیں سنایا۔ البتہ دوسرے دن لکچر شروع ہونے سے پہلے سر اکبر نے ایک مختصر تقریر کی جس میں غالباً ڈاکٹر اقبال کی ایما پر یہ کہا گیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب عام طور پر کسی مجلس میں یا کسی اور جگہ اپنا کلام نہیں سنایا کرتے صرف انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں سنایا کرتے ہیں اس لئے کلام سنانے کے لئے ڈاکٹر صاحب کو مجبور نہ کیا جائے۔ چنانچہ اس کی تصدیق ۱۹۳۱ء میں جب میں مدراس میں زیر ٹریننگ [زیرِ تربیت] تھا وہاں کی انجمن اسلام (غالباً یہی نام تھا) کے کارکنوں سے بھی ہوئی۔

پہلے خطبہ کے بعد ہر خطبہ میں سامعین کی تعداد کم سے کم تر ہوتی

گئی۔ یہ خطبات بہت مشکل تھے عوام میں ان خطبات کا چرچا نہیں ہوا ہاں یہ بہت لوگوں کو معلوم تھا کہ بیرسٹر اقبال حیدر آباد آئے اور گئے۔

غالباً اقبال کی اسی آمد کے موقع پر حضور نظام کے تو شہ خانہ کے خیرات و خیرات استصوابی صدر اعظم سے اقبال کو ایک ہزار روپے کے چیک کا عطیہ دیا گیا جس کو انھوں نے اپنے وقار کے منافی سمجھا اور قبول کرنے سے انکار کردیا۔ یہ چیک اقبال کو سر اکبر حیدری کے ذریعہ سے پیش کیا گیا تھا۔ چیک واپس کرتے وقت اقبال نے سر اکبر کے نام ایک نظم بھی لکھ بھیجی جو ارمغان حجاز کے آخر میں شامل ہے۔ اس موقع پر یہ نظم دلچسپی کا سامان ہو سکتی ہے۔ اس کے اشعار یہ ہیں۔

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہِ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے، اور شہنشاہی کر
حُسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
مَیں تو اس بارِ امانت کو اُٹھاتا سر دوش
کامِ درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات
غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اُس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات!

[کلیات اردو، ص ۷۵۳]

خیر! یہ نظم اب تو صرف ادبی دلچسپی کا سامان ہے لیکن دلچسپ بات تو یہ ہے کہ یہ نظم اس زمانے کے حیدر آباد کے اخباروں میں چھپی جسے لوگوں نے ذوق و شوق سے پڑھا اور اس سے عوام کی نظروں میں اقبال کا مقام اور

اونچا ہوا۔ حیدر آباد میں اقبال کی غالباً یہ آخری آمد تھی۔ اس واقعہ پر تقریباً ۴۴سال کا عرصہ بیت گیا۔ ماضی کے اس دھندلکے میں جو نقوش دکھائی دیئے وہ امتثال امر [حکم کی بجاآوری] کے طور پر پیش کروائے گئے اس پورے واقعہ سے اقبال کی جو تصویر بنتی ہے وہ اس کے ایک شعر سے واضح ہے۔

مثلِ خورشیدِ سَحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزادہ، معانی میں دقیق
اُس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جُدا
اُس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

[کلیات اردو، ص ۶۴۱]

۱۸

کچھ یادیں*

سلطان مقصود

کبھی کبھار جب ذہن زیادہ زنگ آلود ہو جاتا ہے تو اسے صیقل کرانے کے لیے حضورِ مرزا منور میں چلا جاتا ہوں۔ وہاں غالب، بیدل - علامہ کے علاوہ ہندو ازم [ہندومت] - پاکستان اور اسلام پر سیر حاصل گفتگو ہو جاتی ہے یا بقول مرزا صاحب پینتالیس منٹ کا پیریڈ ہو جاتا ہے۔

دقت یہ ہے کہ موصوف آج کل دو کشتیوں کے کھیون ہار ہیں 'غرقاب محبت کا اللہ نگہبان ہو'۔ انھیں ملنا ہو تو اتنے بجے سے اتنے بجے تک یہاں ہوتے ہیں اور پھر اتنے بجے سے اتنے بجے تک وہاں ہوتے ہیں اور اکثر ہوتے کہیں بھی نہیں۔ آپ محنت کر کے یہاں، وہاں تک چلے جائیں تو پتہ چلتا ہے کہ ابھی ابھی ریڈیو یا ٹیلی ویژن والے انھیں اغوا بالجبر یا بالرضا کر کے لے گئے ہیں۔

ایک دن ایک عزیز کی ضد پر بالآخر انھیں وہاں یعنی اقبال اکادمی میں ڈھونڈ ہی لیا۔ اکادمی کا دفتر اس گھر میں ہے جہاں کبھی علامہ سے مجھے شرف ملاقات ہوا تھا۔ ذکر کیا تو مرزا منور صاحب نے چند کتابیں عنایت کیں اور حکم دیا کہ اس ملاقات کی روئیداد لکھو۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جستہ جستہ جو یادیں بھی ماضی کے دھندلکے سے اُبھرتی ہیں وہ لکھ دوں۔ تو سنیئے:

---

* سہ ماہی، اقبالیات اردو، جلد ۲۴، شمار ۴، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، جنوری ۱۹۸۴ء۔

پہلی یاد

اس صدی کے تیسرے دھے [دہائی] کی بات ہے کہ مرحوم تاثیر نے ایک فرشی مشاعرے کے لیے علامہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایرانی قالین مانگنے کے لیے مجھے اور مرحوم محمود نظامی کو بھیجا۔ اہل زبان کی تقلید میں ایسے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ قالین بچھ جاتے تھے۔ گاؤ تکیے لگ جاتے تھے۔ طشتری میں گلوریاں شعرائے کرام کو پیش ہوتی تھیں۔ کلام شمع کی روشنی میں پڑھا جاتا تھا۔ ایسے مشاعرے اکثر طرحی ہوتے تھے۔ تاثیر مرحوم قلم برداشتہ غزلیں لکھ کر تین چار بناوٹی شعراء کے حوالے کر دیتے تھے جو عرض کیا ہے سے مقطع تک لپک لپک کر سنایا کرتے تھے اور بڑی بہادری سے جھک جھک کر اور کورنش بجا لا کر داد وصول کرتے تھے۔ میں بھی ان 'دلاور دُرزوں' میں سے ایک تھا اور مزید ستم یہ تھا کہ میں ہی ترنم سے مشاعرے کا اختتام کرتا تھا۔ ہمارے ایک مرحوم دوست بلا کے سینہ زور تھے۔ ایک ایسی ہی غزل میں شعر تھا:

تجھے وہم ہوا ہے مجھے کیوں اٹھا رہا ہے
میری جائے سجدہ ہے یہ تیرا نقش پالین ہے

اس شعر پر بہت داد ملی۔ بعد میں ستم بالائے ستم یوں ہوتا کہ وہ اکثر ہم سے بھی اس شعر پر اپنا حق سمجھ کر داد وصول کرتے رہے۔

یادوں کی بھول بھلیاں میں بات ذرا بڑھ گئی ہے۔ ذکر قالین مانگنے کا تھا۔ ان دنوں اس گھر کے آگے کشادہ دالان تھا۔ سڑک سے گھر واضح نظر آتا تھا۔ اب تو دور ایک کونے میں سہا ہوا اور دبکا ہو ہے۔ ہمیں فوراً شرف باریابی حاصل ہو گیا۔ اس درسگاہ میں کسی 'حاجب و دربان' کی ضرورت نہ تھی۔ طلباء کے لیے رسائی بہت چھیلی تھی۔ مرحوم لنگی اور بنیان پہنے حقہ پی رہے تھے۔ قالین لپٹے ہوئے دیواروں کے ساتھ پڑے ہوئے تھے۔ ہم نے

للچائی ہوئی نظروں سے انھیں دیکھا اور دل ہی دل میں خوش ہوئے کہ چلو قالین بغیر کسی اکھاڑ پچھاڑ کے مل جائیں گے۔ کافی دیر تک تو ہم اس 'دبدبۂ قلندری' سے مبہوت رہے۔ زبانیں گنگ تھیں حرف مدعا کیسے کہتے۔ علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دو دفعہ حقے کی گڑ گڑ کے ساتھ لانبی ہوں کی اور ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ مرحوم طلباء سے بے انتہا شفقت اور مروت سے پیش آتے تھے۔ غالباً اسی بنا پر تاثیر صاحب نے حالانکہ وہ خود 'بے باک زبان و بیان' کے مالک تھے، ہمیں قالین مانگنے کے لیے بھیجا تھا۔ اب پتہ چلتا ہے کہ جو لوگ ان کی عظمت کے جلال و جمال سے آگاہ تھے ان کی محفل میں کیوں 'نفس گم کردہ' ہو کر رہ جاتے تھے۔ ہماری محبت اور عقیدت اس وقت تک ان کی لازوال اور بے کراں عظمت کو محیط نہ تھی، اس لیے ہم ایک گونہ گستاخی کے مرتکب ہو سکتے تھے۔ میں تو دیوار کی تصویر بنا بیٹھا رہا۔ نظامی مرحوم نے رُک رُک کر عرض مدعا کر ہی دی اور استدعا کو موثر بنانے کے لیے یہ اضافہ بھی کر دیا کہ شیخ عبدالقادر مرحوم میر مشاعرہ ہوں گے۔ ایک طویل 'ہوں' کے ساتھ ہماری سفارت کی ناکامی کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ ہم دونوں کو اس انکار سے ایک انجانی سی تسکین ہوئی۔ کیا یہ خنک بختی کم تھی کہ یوں شرف ملاقات تو نصیب ہوا۔ دامن جھاڑ کے خوش و خرم واپس آ گئے۔ تاثیر صاحب کو اس انکار پر نہ کوئی اچھنبا ہوا اور نہ دُکھ۔

شیخ عبدالقادر مرحوم ادبی اور ثقافتی محفلوں کی صدارت بڑی خندہ پیشانی سے قبول کر لیا کرتے تھے۔ نظامی مرحوم تھوڑے سے شرارتی بھی تھے۔ جب صدارت زیر غور آئی تو شک گزرا کہ شیخ صاحب مصروفیت کی وجہ سے کہیں انکار نہ کر دیں۔ نظامی نے کہا یہ ناممکن ہے۔ وہ تو ہاروں کی توقع میں دعوت پر ہی گردن آگے کر دیتے ہیں۔

مشاعرہ ہوا۔ صدر اور شعرائے کرام قالینوں پر تکیوں کے سہارے

براجمان تھے۔ طارق مرحوم شمع بردار تھے۔ گلوریاں پیش ہوئیں۔ شعراء نے شمع کی مدہم روشنی میں۔ پیک دانوں کو اکثر استعمال کرنے کے بعد مطلع سے مقطع تھا۔ 'سبحان اللہ!' 'مکرر ارشاد' پر بار بار داد وصول کی۔ نمایاں داد شیخ صاحب مرحوم کی تھی جو اظہار تحسین کے لیے ہاتھ بھی بلند کرتے تھے اور شعر دہراتے تھے۔ ابتدا میں نے ترنم سے اسی مستعار غزل سے کی اور خوب داد وصول کی۔ یہ تھی اس دور کے لاہور کی ایک جھلک جو اب 'زندہ باد' اور 'مردہ باد' کے نعروں میں کھو گیا ہے۔

دوسری یاد

ایس۔پی۔ایس کے ہال جس کی موجودہ حالت پر کسی ادارے کا بے رحمی میں چالان ہونا چاہیے، گاہے بگاہے مشاعروں اور جلسوں کے لیے چنا جاتا تھا۔ علامہ رحمۃ اللہ علیہ ایک مشاعرے کے صدر تھے۔ ڈھیلی ڈھالی سفید پگڑی کھلے گلے کا لالیا کوٹ سفید شلوار اور سیاہ گرگابی لباس میں شامل تھے۔ غالباً ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۳ء کا درمیانی دور تھا۔ دھندلی سی یاد باقی ہے۔ فرمایا میری صحت اجازت نہیں دیتی کہ شاموں کو باہر آؤں لیکن منتظمین کے اصرار پر آنا پڑا۔ مشاعرہ لاہور کے روایتی ہنگامہ پرور اسلوب کے برعکس وہ نہایت مہذبانہ طور پر ختم ہوا۔ اصرار ہوا کہ علامہ بھی کچھ عطا فرمائیں۔ ارشاد ہوا:

به آدمی نرسیدی ، خدا چه میجوئی
ز خود گریخته ئی آشنا چه می جوئی
دو قطره خون دلست آنچه مشک مینامند

تو ای غزال حرم در ختا چہ میجوئی[1]

[کلیات فارسی، ص ۶۵۷]

اب جب بھی اس خستہ و ریختہ عمارت کے قریب سے گزرتا ہوں تو یہ یاد لپک کر ذہن اور روح کو سیراب و سرشار کر دیتی ہے۔

تیسری یاد

اکبری دروازہ کے باہر ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۳ء کے درمیانی دور میں مسلم لیگ کا جلسہ تھا۔ علامہ رحمۃ اللہ علیہ صدر تھے۔ ڈھیلی ڈھالی سفید پگڑی، سفید ہی شلوار اور قمیض، کھلے گلے کا لالیا کوٹ اور کالی گرگابی۔ ڈائس پر مجھے واضح طور پر سید امجد علی اپنی طرہ دار پگڑی اور خوبصورت جوانی کی وجہ سے یاد ہیں۔ غالباً راجہ غضنفر علی مرحوم بھی طویل رنگ دار طرے اور اونچے کلاہ سے مزین موجود تھے۔ میں پنڈال میں دوستوں کے ہمراہ موجود تھا۔ تاثیر صاحب نے ڈھونڈ لیا اور اشارے سے بلایا۔ بدمزہ ہو گیا کہ شاید کوئی ایسا کام سپرد نہ کر دیں کہ باہر جانا پڑے۔ بات کچھ اور تھی۔ شومئ قسمت باز ہے۔ نصیب علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے پانچ چھ شعر گا کر جلسے کا اختتام کرنے کو کہا۔ پہلا شعر تھا:

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری

ترجمہ:

تو انسان تک نہیں پہنچا خدا کو ڈھونڈتا کیا ہے
گریزاں خود سے رہ کر آشنا کو ڈھونڈتا کیا ہے
نمو آب اپنی شاخ گل ہی میں ڈھونڈا اے پریدہ رنگ
صبا سے اپنے دل کے مدعا کو ڈھونڈتا کیا ہے

[صدیقی، ص ۱۳۵۲]

خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری

[کلیات اردو، ص 98]

گھبرا گیا۔ علامہ رحمۃ اللہ علیہ کا کلام۔ وہ خود ہی صدر جلسہ اور اجتماع اتنا برگزیدہ۔ کیا کرتا۔ سب نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ انکار کی جرأت نہ ہوئی۔ روسٹرم [منبر] کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ کہنیاں اس پر جما لیں۔ ٹانگوں کو روسٹرم کے پائیوں نے سنبھالا دیا۔ ادھ کھلی آنکھیں اشعار پر رکھیں۔ علامہ رحمۃ اللہ علیہ قریب ہی دائیں طرف کرسی پر تشریف فرما تھے۔ اشعار ترنم سے پڑھے۔ علامہ رحمۃ اللہ علیہ کی لانبی 'ہوں' ایک دو دفعہ سنائی دی۔ پڑھ کر لڑکھڑاتا ہوا دوستوں کے پاس پہنچا۔ دھڑام سے کرسی پر گر گیا۔ پوچھا کہ کیسے رہا۔ پتہ چلا کہ بہت اچھا رہا یقین نہیں آتا تھا۔ شاید گھبراہٹ میں گلے میں غیر معمولی گھیرنا آ گئی ہو گی۔ اب وہ تجربہ میری زندگی کا حسین اور معزز ترین کارنامہ ہے۔

چوتھی یاد

میں اور رشید طارق مرحوم جاوید منزل گئے۔ علامہ رحمۃ اللہ علیہ آرام کرسی پر لُنگی اور بنیان پہنے حقہ پی رہے تھے۔ ہم قالین پر بیٹھ گئے۔ کسی صاحب سے فرما رہے تھے کہ انفرادی ایغو [خودی] جب اپنی صلاحیتوں اور ممکنات کو مکمل طور پر اُجاگر کر لیتا ہے تو لافانی ہو جاتا ہے۔ وہ سپر ایغو [اعلیٰ خودی] میں جذب نہیں ہوتا بلکہ ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور وہ اپنی تقدیر کا معمار خود بن جاتا ہے۔ بات پیچیدہ تھی۔ کچھ پلے پڑی مگر زیادہ تر اوپر سے گزر گئی۔ اکادمی کے موجودہ ناظم سے جو علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے شیدائی تھے، اس کے مضمرات پر ایک لیکچر سن لیں گے۔

پانچویں یاد

علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کی خبر سن کر جاوید منزل پہنچا۔ 'مومن کے لبوں پر تبسم دیکھا' فقیر کے 'روزگار' کے 'سر آمد' ہونے اور دوسرے 'دانائے راز' کے آنے یا نہ آنے کی الجھن لیے لاکھوں سوگواروں میں شامل ہو گیا۔ اس یاد میں ایک اور واقعہ محفوظ ہے۔ رشید طارق کے بڑے بھائی جو پریس برانچ میں ملازم تھے فرطِ غم سے نڈھال ہو کر پورچ [ڈیوڑھی] میں بے سدھ ہو کر گر پڑے، انھیں پانی پلایا، سنبھالا دیا تو اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب علامہ رحمۃ اللہ علیہ کو آخری آرامگاہ کی طرف لے جا رہے تھے تو میرے بزرگ راجہ حسن اختر مرحوم نے مجھے کہا ''مقصود کیا تمھیں اس سانحے کی المناکی کا صحیح ادراک ہے؟ تمھیں کچھ پتہ بھی ہے کیا ہو گیا ہے''۔ کچھ یوں چاہتے تھے کہ زمین و آسمان شق ہو جائیں اور فطرت بھی اس مہیب واقعے پر نوحہ کناں نظر آئے۔ حکیم احمد شجاع جو اپنی منفرد ذات میں ایک ادارہ بلکہ تحریک تھے، بڑے ڈرامائی انداز میں ہزاروں سال کے بعد پیدا ہونے والے دیدہ ور کے وصال پر فصیح و بلیغ اردو میں یہ بتا رہے تھے کہ ''متاع عقل و دانش آج اللہ والوں کی لٹ گئی ہے''۔

یوں ہم نے حکیم الامت کو سطوت مغلیہ کے جلال و جمال کی مظہر اور 'خدنگ آخریں' اورنگ زیب عالمگیر کی تعمیر کے دامن میں امت مسلمہ کے دوسرے 'ہست قرآن در زبان پہلوی' کے 'نے نواز' کو نئے سفر پر روانہ کیا۔ اور یہ سوچتے ہوئے لوٹے کہ:

عمر ہا بر خویش می پیچد وجود

تا یکی بیتاب جان آید فرود[2]

[کلیات فارسی، ص ۴۸۲]

---

2 ترجمہ:

مدتوں ہر آن پیچ و تاب کھاتا ہے وجود
تب جہاں میں ہوتی ہے اک جان مضطر کی نمود

[صدیقی، ص ۱۷۲]

۱۹

دارالاقبال بھوپال میں اقبالؒ کا ورود مسعود*

ممنون حسن خان[1]

---

* سہ ماہی، اقبالیات اردو، جلد ۲۸، شمار ۲، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، جولائی ۱۹۸۷ - یہ مضمون ۲۱ر اپریل ۱۹۸۶ء کو حیدر آباد میں منعقدہ 'عالمی اقبال سیمینار [مذاکرہ]' میں پڑھا گیا۔

۱ ممنون حسن خان کی اقبالیات پر دیگر تخلیقات کے لئے دیکھئے:
ممنون حسن خان، ''اقبال اور شیش محل''، مشمولہ، اخلاق اثر، مرتبہ، اقبال اور شیش محل، بھوپال، اقبال لائبریری، ۱۹۷۷ء؛ ______ ،''دارالاقبال بھوپال میں اقبال کا ورودِ مسعود''، مشمولہ، کریم رضا، مرتبہ، مقالاتِ عالمی اقبال سیمی نار، حیدر آباد، اقبال اکیڈیمی، ۱۹۸۶ء؛ ______، (مرتبہ)، بیابہ مجلس اقبال [حصہ اول]، بھوپال، کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز ، ۱۹۹۰ء؛ ______، ہمارا اقبال، بھوپال، علامہ اقبال کل ہند ادبی مرکز، ۱۹۹۱ء؛ ______، '' گزارشِ احوال واقعی''، مشمولہ، آفاق احمد، بیابہ مجلس اقبال. حصہ سوم، بھوپال، کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز، ۱۹۹۳ء؛ ______، (مرتبہ)، بیابہ مجلس اقبال [حصہ دوم]، بھوپال، کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز مدھیا پردیش، ۱۹۹۳ء ؛ ______، ''کلامِ اقبال کے محاسن''، مشمولہ، آفاق احمد، بیابہ مجلس اقبال. حصہ پنجم، بھوپال، کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز، ۱۹۹۵ء؛ محمد اشرف، مرتبہ، دی ڈیولز کانفرنس، ممنون حسن خاں، مترجم، گجرات، اُردو ہاؤس، ۱۹۵۱ء؛۔

اقبال اور ممنون حسن خان کے بارے میں مزید جاننے کے لیے دیکھئے:
اخلاق اثر، اقبال اور ممنون، بھوپال، طارق پبلی کیشنز، ۱۹۸۳ء۔

اقبال اور بھوپال کے بارے میں مزید جاننے کے لیے دیکھئے:
عبدالقوی دسنوی، علامہ اقبال-بھوپال میں، بھوپال، سیفیہ کالج، ۱۹۶۷ء؛ ______، اقبال اور دارالاقبال بھوپال، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۸۳ء؛ ''بھوپال کانفرنس اور اس کے فیصلے۔ مسلمانوں کے لیے صحیح راہِ عمل''، محمد رفیق افضل، (مرتبہ) گفتار اقبال، لاہور، ادارۂ تحقیقاتِ پاکستان، ۱۹۶۹ء؛ صہبا لکھنوی، اقبال اور بھوپال، کراچی، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۳ء؛''اقبال کی ان نظموں کا متن جو شیش محل اور ریاض منزل، بھوپال میں قیام کے دوران میں لکھی گئیں''، مشمولہ، اخلاق اثر، (مرتبہ) اقبال اور شیش محل، بھوپال، اقبال لائبریری، ۱۹۷۷ء؛''بھوپال سے تحریر کردہ اور بھوپال سے متعلق مکتوب الیہم کو تحریر کردہ اقبال کے ۱۷ خطوط''،

تا یکی بیتاب جان آید فرود[2]

[کلیات فارسی، ص ۴۸۲]

---

2 ترجمہ:

مدتوں ہر آن پیچ و تاب کھاتا ہے وجود
تب جہاں میں ہوتی ہے اک جان مضطر کی نمود

[صدیقی، ص ۹۷۲]

۱۹

دارالاقبال بھوپال میں اقبالؒ کا ورود مسعود*

ممنون حسن خان[1]

---

* سہ ماہی، اقبالیات اردو، جلد ۲۸، شمار ۲، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، جولائی ۱۹۸۷ - یہ مضمون ۲۱ اپریل ۱۹۸۶ء کو حیدر آباد میں منعقدہ 'عالمی اقبال سیمینار [مذاکرہ]' میں پڑھا گیا۔

[1] ممنون حسن خان کی اقبالیات پر دیگر تخلیقات کے لئے دیکھئے:
ممنون حسن خان، ''اقبال اور شیش محل''، مشمولہ، اخلاق اثر، مرتبہ، اقبال اور شیش محل، بھوپال، اقبال لائبریری، ۱۹۷۷ء؛ ____ ،''دارالاقبال بھوپال میں اقبال کا ورودِ مسعود''، مشمولہ، کریم رضا، مرتبہ، مقالاتِ عالمی اقبال سیمی نار، حیدر آباد، اقبال اکیڈیمی، ۱۹۸۶ء؛ ____ ، (مرتبہ)، بیاہہ مجلس اقبال [حصہ اوّل]، بھوپال، کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز ، ۱۹۹۰ء؛ ____ ، ہمارا اقبال، بھوپال، علامہ اقبال کل ہند ادبی مرکز، ۱۹۹۱ء؛ ____ ، '' گزارشِ احوال واقعی''، مشمولہ، آفاق احمد، بیاہہ مجلسِ اقبال، حصہ سوم، بھوپال، کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز، ۱۹۹۳ء؛ ____ ، (مرتبہ)، بیاہہ مجلس اقبال [حصہ دوم]، بھوپال، کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز مدھیا پردیش، ۱۹۹۳ء ؛ ____ ، ''کلامِ اقبال کے محاسن''، مشمولہ، آفاق احمد، بیاہہ مجلسِ اقبال، حصہ پنجم، بھوپال، کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز، ۱۹۹۵ء؛ محمد اشرف، مرتبہ، دی ڈیولز کانفرنس، ممنون حسن خاں، مترجم، گجرات، اُردو ہاؤس، 1951ء؛۔

اقبال اور ممنون حسن خان کے بارے میں مزید جاننے کے لیے دیکھئے:
اخلاق اثر، اقبال اور ممنون، بھوپال، طارق پبلی کیشنز، ۱۹۸۳ء۔

اقبال اور بھوپال کے بارے میں مزید جاننے کے لیے دیکھئے:
عبدالقوی دسنوی، علامہ اقبال-بھوپال میں، بھوپال، سیفیہ کالج، ۱۹۶۷ء؛ ____ ، اقبال اور دارالاقبال بھوپال، لکھنوٴ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۸۳ء؛ ''بھوپال کانفرنس اور اس کے فیصلے۔ مسلمانوں کے لیے صحیح راہِ عمل''، محمد رفیق افضل، (مرتبہ) گفتار اقبال، لاہور، ادارۂ تحقیقاتِ پاکستان، ۱۹۶۹ء؛ صہبا لکھنوی، اقبال اور بھوپال، کراچی، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۳ء؛ ''اقبال کی ان نظموں کا متن جو شیش محل اور ریاض منزل، بھوپال میں قیام کے دوران میں لکھی گئیں''، مشمولہ، اخلاق اثر، (مرتبہ) اقبال اور شیش محل، بھوپال، اقبال لائبریری، ۱۹۷۷ء؛ ''بھوپال سے تحریر کردہ اور بھوپال سے متعلق مکتوب الیہم کو تحریر کردہ اقبال کے ۱۷ خطوط''،

'شیش محل' میں صرف مقتدر و معزز شخصیتیں ہی قیام کرتی تھیں، ورنہ عموماً یہ محل مقفل رہتا تھا۔ محل کی تاریخ میں اب پہلی بار اُسے حکیم الامت اور مفکّرِ مشرق ایسی باعظمت شخصیت کے مکین ہونے کا شرف ہی حاصل نہیں ہوا بلکہ اس کی شان و عظمت بھی دوچند ہوئی، اور اُن شاہکار تخلیقات سے جو اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے 'شیش محل' کے قیام کے دوران کہیں، اُسے تاریخی حیثیت بھی حاصل ہو گئی۔ یہی وہ 'شیش محل' ہے جس کے قیام کے دوران اقبال رحمۃ اللہ علیہ اپنے عزیز ترین دوست راس مسعود کی ہمہ وقت رفاقت اور نواب صاحب کی خصوصی توجہات سے فیضیاب ہوئے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں انھوں نے فرصت و آسودگی کے بہترین لمحات بسر کیے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں انھوں نے قرآنِ مجید کے حواشی لکھنے کے لیے باقاعدہ کام کا آغاز کیا۔ ریاست بھوپال کا یہ فخر بے جا نہیں کہ اُس نے اقبال رحمۃ اللہ علیہ ایسے آفاقی شاعر کو جسم و جاں کی راحتوں کا سامان ہی مہیا نہیں کیا، فکر و تحقیق کے نئے گوشے اُجاگر کرنے کے مواقع بھی بہم پہنچائے۔[2]

اقبال نے بھوپال کو 'دارالاقبال بھوپال' کہا ہے۔ بھوپال کو یہ سعادت حضرت علامہ کے ایام بھوپال کے تعلق کی وجہ سے ہی نصیب ہوئی۔ اس

، مرتبہ، اقبال نامے، بھوپال، طارق پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء؛ ______، مرتبہ، اقبال: بھوپال میں، بھوپال، اقبال اکادیمی، ۲۰۰۴ء؛ ''اقبال صدی سیمی نار، بھوپال، ۱۹۷۸ء کے مضامین و تقاریر''، آفاق احمد، مرتبہ، اقبال: آئینہ خانے میں، بھوپال، مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی، ۱۹۷۹ء؛ صائمہ رفعت، ''اقبال شناسی میں بھوپال کا حصہ''، مشمولہ، ______، بیاضِ مجلسِ اقبال، حصہ نہم، بھوپال، علامہ اقبال ادبی مرکز، ۲۰۰۲ء؛ ______، ''بھوپال میں اقبالیات''، مشمولہ، احمد نحوی، اقبالیات: گزشتہ دس سال، سری نگر، اقبال انسٹی ٹیوٹ، ۲۰۰۴ء؛ ''اقبال کی مالی امداد کے لیے نواب بھوپال کی تحریک ''، سید شکیل احمد، اقبال: نئی تحقیق، حیدرآباد دکن، اقبال اکیڈمی، ۱۹۸۵ء ؛ ماسٹر اختر، ریاست بھوپال اور اقبال، بھوپال، نیا کتاب گھر ، ۱۹۸۷ء؛ ______، ''ریاست بھوپال اور اقبال''، مشمولہ، اکبر رحمانی، آموز گارِ اقبال، جلگاؤں، ایجوکیشنل اکادمی، ۱۹۹۵ء؛ ''اقبال اور بھوپال''، افتخار احمد صدیقی، مرتبہ، فروغِ اقبال، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء ؛۔

2 صہبا لکھنوی، اقبال رحمۃ اللہ علیہ اور بھوپال. کراچی، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۳ء۔

تعلق کی بنا پر اور اُن لافانی عظیم نظموں کی بدولت جو حضرت علامہ نے بھوپال میں تخلیق کی تھیں، بھوپال کا نام عالمی ادب کی تاریخ میں سنہرے الفاظ میں لکھا جائے گا۔

یوں تو بھوپال مدت دراز سے علم و ادب کا گہوارہ رہا اور بھوپال کے نامور عالموں، ادیبوں اور شاعروں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے لیکن جب حضرت علامہ کے مبارک قدم بھوپال کی مردم خیز زمین پر پڑے تو ان کی برکت سے اس کا اقبال پوری طرح چمکا اور اس اقبال مندی کی بدولت سر زمین بھوپال ایک نہایت روشن ستارے کی طرح ہندوستان کے اُفق پر جگمگانے لگی۔ فیض کے الفاظ میں:

سنسان راہیں تعلق سے آباد ہو گئیں
ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا

'اللہ کی دین ہے جسے دے' میری خوش نصیبی ملاحظہ فرمایئے کہ جب بھی حضرت علامہ نے بغرض علاج بھوپال میں قیام فرمایا مجھے ان کی خدمت گرامی میں بطور ایک سفتہ گوش [فرمان بردار] حاضر رہنے کا شرف حاصل رہا اور میں نے ان کی قلندرانہ ادائیں اور سکندرانہ جلال ، اُن کا سوز اور ان کی حقیقت بیں نگاہ اور ان کی شعری کاوش کی[کو] اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ عزت مجھے میرے محسن سید والا گہر سر سید ثانی ڈاکٹر راس مسعود کی بدولت حاصل ہوتی تھی جن کا میں بھوپال میں معتمد خاص تھا اور جن کی ہدایت کے مطابق میں اُن باتوں کو لکھ لیا کرتا تھا جو اقبال کی مجلسوں میں ہوتی تھیں۔ یہاں یہ بات میں بالکل صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ حضرت علامہ اقبال سے میرا وہی کفش برداری[خدمت] کا رشتہ تھا جو ان کے خاص ملازم علی بخش صاحب کا تھا۔اس سے زیادہ کسی طرح بھی میرا درجہ ان کے مقابلہ میں نہیں

تھا۔ اس میں کسی کو بھی کوئی غلط فہمی نہ ہونا چاہیے۔

اپنی 'مہتاب سے تابندہ تر' زندگی کے آخری ایام میں جب اقبال ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان تین بار بھوپال بغرض علاج تشریف لائے اور ریاض منزل اور شیش محل میں قیام فرمایا، اُن ہی کے اپنے الفاظ میں وہ آلام اور مصائب میں گرفتار تھے۔ ایک طرف خطرناک علالت اور دوسری طرف ہر طرح کے تفکرات، راس مسعود کو ان باتوں کا شدید احساس تھا۔ راس مسعود ہی ایک ایسے واحد شخص تھے جو اقبال سے کھل کر بات کر سکتے تھے۔ اقبال کی خطرناک بیماری اور اُن آلام اور مصائب کے پیش نظر اہم سوال یہ تھا کہ اگر حضرت علامہ کو اقتصادی تفکرات سے جلد از جلد کسی حد تک نجات نہ دلائی گئی تو وہ اس عظیم الشان کام کو قدرے سکون قلب کے ساتھ کس طرح انجام دے سکیں گے جو اُن کے ذہن میں تھا یعنی قرآنِ حکیم کے متعلق وہ کتاب جس کو وہ عالم انسانیت کی خدمت میں بطور اپنے آخری تحفے کے پیش کرنا چاہتے تھے۔ نواب حمید اللہ خان اور سید راس مسعود اچھی طرح جانتے تھے کہ اس وقت سارے عالم اسلام میں اقبال ہی وہ دانائے راز تھے جو کتاب زندہ کی حقیقت لایزال کو فلسفۂ جدید کی روشنی میں دنیا کے سامنے پیش کر سکتے تھے۔ اقبال اس کتاب کو لکھنے کے لیے بہت بے چین تھے۔ آخرکار حضرت علامہ نے نواب حمید اللہ کی پیشکش منظور فرمائی۔

• پانچ سو روپیہ ماہوار کا یہ علمی وظیفہ یکم جون ۱۹۳۵ء سے جاری ہوا تھا اور ۲۰ر اپریل ۱۹۳۸ء کو ختم ہو گیا۔ اس قلیل رقم کے علاوہ حضرت علامہ نے اور کوئی مالی مدد کسی سے بھی لینا منظور نہیں فرمایا تھا۔ اقبال نے اس دوران باوجود اپنی علالت کے کتاب مذکور کا کچھ خاکہ تیار کر لیا تھا۔ اس سلسلہ کے دو ایک نوٹس انھوں نے مجھے شیش محل میں لکھوائے بھی تھے۔ کچھ مخطوطات کو دیکھنے کے لئے وہ مشرقِ وسطیٰ اور کیمبرج بھی جانا چاہتے تھے لیکن بیگم

اقبال کی وفات اور اپنی مسلسل علالت کی وجہ سے وہ ہندوستان سے باہر تشریف نہ لے جا سکے اور آخرکار ۲۱ ؍اپریل ۱۹۳۸ء کو انتقال فرما گئے۔

اقبال بغرضِ علاج تین بار بھوپال تشریف لائے۔ پہلی بار انھوں نے ریاض منزل میں سیّد راس مسعود کے ساتھ قیام فرمایا تھا اور دوسری اور تیسری بار ان کا قیام شیش محل میں رہا تھا۔ اپنی علالت اور اپنی علمی اور شعری کاوشوں کے باوجود جس میں وہ علاج کے اوقات کو چھوڑ کر مشغول رہتے تھے، حضرت علامہ بھوپال میں ہر اس شخص سے ملتے تھے جو ان کی خدمت میں حاضری دیتا تھا۔ بھوپال میں میرے ساتھ وہ کئی بزرگوں اور عالموں کے مزارات پر فاتحہ خوانی کے لیے تشریف لے گئے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد وہ دیر تک خاموش کھڑے رہے۔ مجھ سے فرمایا: ''اگر بجنوری کو اللہ عمر دراز عطا کرتا تو وہ اپنی خداداد قابلیت سے دنیائے علم و ادب میں انقلاب پیدا کر دیتا''۔

بھوپال میں چونکہ میں بطور ان کے کفش بردار کے اقبال کی خدمت اقدس میں حاضر رہتا تھا، میں ان کی الہامی صحبتوں میں بھی برابر موجود رہتا تھا۔ میں نے ان کی زبان مبارک سے تقریباً ان تمام نظموں کو سنا جو انھوں نے بھوپال میں اپنے قیام کے دوران تخلیق فرمائی تھیں۔ سید راس مسعود ہی ایسے واحد شخص تھے جو ان سے ان نظموں کو سنانے کی فرمائش کر سکتے تھے۔ وہ ان کو اقبال کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اس سے زیادہ میری خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی تھی کہ چند اشعار حضرت علامہ نے مجھے بھی لکھوائے تھے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر سید راس مسعود نے اقبال سے کہا تھا: ''اقبال! یہ لڑکا تو تمہارا ایکرمان بنتا جا رہا ہے''۔

حضرت علامہ کی فیضانی صحبتوں میں وہ سب نامی گرامی حضرات شامل

ہوتے تھے جو ان کی مزاج پرسی کے لیے باہر سے بھوپال آتے تھے مثلاً ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر غلام سیدین صاحب، ڈاکٹر ہادی حسن، ڈاکٹر ظفر الحسن، بابائے اُردو مولوی عبدالحق ، سر تیج بہادر سپرو، محترمہ سروجنی نائیڈو، مسٹر غلام محمد، علامہ سیّد سلیمان ندوی، مولانا شوکت علی وغیرہ۔

اب دو تین فیضانی صحبتوں کا حال سنیے۔ ریاض منزل میں اقبال نے ایک محفل میں اپنی وہ نظم سنائی جس کا عنوان ہے ''سلطانی'' اس نظم کا ایک شعر ہے:

خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سُلطانی

[کلیات اردو، ص 544]

راس مسعود اس شعر کو بار بار پڑھنے لگے اور فلسفۂ خودی پر گفتگو شروع ہو گئی، جس میں عابد حسین اور سیدین نے نمایاں حصہ لیا۔ آخر میں اقبال نے اپنا ایک شعر پڑھا:

دلبری بی قاہری جادوگری است
دلبری با قاہری پیغمبری است[3]

[کلیات فارسی، ص ۴۷۲]

---

[3] ترجمہ:

دلبری بے قاہر کیا ہے؟ فقط جادوگری
دلبری با قاہری لاریب ہے پیغمبری

[صدیقی، ص ۹۵۱]

ریاض منزل شہر سے ذرا باہر نہایت پرفضا مقام پہ واقع ہے۔ اس کوٹھی کے بالکل سامنے بھوپال کا بڑا تالاب ہے۔ ایک رات اقبال ریاض منزل میں رونق افروز تھے۔ سر راس مسعود، میں اور علی بخش ان کی خدمت میں حاضر تھے۔ علامہ اس رات بہت شگفتہ موڈ میں تھے فرمایا: ''بھوپال بہت خوبصورت شہر ہے۔ حسن سے لطف اندوز ہونے کے لیے حقیقت بیں نظر کی ضرورت ہے''۔

پھر کافی دیر خاموش رہنے کے بعد دو شعر مجھے لکھوائے اور پھر سید راس مسعود کو وہ پوری نظم سنائی جس کا عنوان ہے ''نگاہ'' اور جس کا آخری شعر ہے:

نِگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں
کہ بِکتی نہیں فطرت جمال و زیبائی

[کلیات اردو، ص 616]

بھوپال سے متعلق اقبال کی اس نظم نے تاریخ ادب میں بھوپال کو اسی طرح امر بنا دیا جس طرح گوئٹے نے ویمر کو بنایا ہے۔

سید راس مسعود نے بھوپال میں کالی داس کے ڈراموں کو اُردو میں ترجمہ کرانے کا کام شروع کرایا تھا۔ ایک طرح کی سنسکرت اکادمی بنائی گئی تھی۔ سب سے پہلے میگھ دوت کا ترجمہ کیا جا رہا تھا۔ ایک دن ریاض منزل میں بڑے بڑے پنڈت اور شاستری جمع تھے۔ حضرت علامہ بھی تشریف فرما تھے۔ سنسکرت سے اُردو میں ترجمے کی مشکلات کا ذکر چھڑ گیا۔ سر راس مسعود کی فرمائش پر میں نے حاضرین جلسہ کو علامہ کی وہ نظم سنائی جس کا عنوان ہے ''آفتاب''۔ علامہ نے فرمایا: ''شاستری جی تو یہی کہیں گے کہ یہ گائتری منتر نہیں

ہے کیونکہ گاتیرمی کے سنسکرت الفاظ کا اُردو میں ترجمہ کرنا تقریباً ناممکن ہے''۔پھر فرمایا:''اس نظم کے بعض الفاظ پر تو میرے لیے کفر کا فتویٰ صادر کر دیا گیا''۔

راس مسعود نے قہقہہ لگایا اور علامہ کا یہ مصرع پڑھا:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا

[باقیات، ص 106]

ایک دن صبح کے وقت اقبال شیش محل کے سامنے والے میدان میں ٹہل رہے تھے۔اس تاریخی میدان کے چاروں طرف مساجد ہیں۔میں علامہ کے ساتھ تھا۔یکایک علامہ بہت بے چین نظر آئے۔فرمایا!اندر چلو۔شیش محل پہنچ کر وہ اپنے پلنگ پر بیٹھ گئے اور کافی دیر تک بالکل خاموش رہنے کے بعد یہ دو شعر لکھوائے:

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

[کلیات اردو، ص 526]

جب راس مسعود تشریف لائے تو میں نے علامہ کی موجودگی میں اُن کو یہ اشعار سنائے۔راس مسعود نے کہا:''یہ حقیقت ہے لیکن افسوس اب تو اذاں کی صرف رسم باقی رہ گئی ہے''۔اور پھر اقبال کا یہ شعر پڑھا:

تری نماز میں باقی جلال ہے، نہ جمال

تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

[کلیات اردو، ص 536]

۴؍ اپریل ۱۹۳۶ء کو جب اقبال شیش محل میں مقیم تھے میں صبح کے وقت حسب معمول اُن کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا، فرمایا:

تم اچھے آگئے مجھے تمہارا انتظار تھا۔ رات میں نے مسعود کے دادا سید احمد خان کو خواب میں دیکھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا: میں حضور رسالت مآب ﷺ کی خدمت اقدس میں اپنی صحت کے لیے عرضداشت پیش کر دوں۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میری زبان پر یہ شعر تھا:

با پرستاران شب دارم ستیز
باز روغن در چراغ من بریز[4]

[کلیات فارسی، ص ۷۲۲]

میں نے اُسی وقت حضور رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں بطور نذرانۂ عقیدت اشعار لکھنا شروع کر دیے۔

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ میں نے اُن کو اتنا بے چین کبھی نہیں دیکھا تھا۔ عجب کیفیت طاری تھی ان کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں تھیں۔ کافی دیر تک بالکل خاموش رہنے کے بعد انھوں نے مجھ سے فرمایا: ''میرے پاس بیٹھ جاؤ اور جو میں بولتا جاؤں لکھتے جاؤ''۔

---

[4] ترجمہ:

جنگ ہے میری پرستاران شب سے برملا
تیز کر دے اور روغن ڈال کر میرا دیا

[صدیقی، ص ۱۳۹۰]

ہے کیونکہ گاتیرمی کے سنسکرت الفاظ کا اُردو میں ترجمہ کرنا تقریباً ناممکن ہے''۔ پھر فرمایا: ''اس نظم کے بعض الفاظ پر تو میرے لیے کفر کا فتویٰ صادر کر دیا گیا''۔

راس مسعود نے قہقہہ لگایا اور علامہ کا یہ مصرع پڑھا:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا

[باقیات، ص 106]

ایک دن صبح کے وقت اقبال شیش محل کے سامنے والے میدان میں ٹہل رہے تھے۔ اس تاریخی میدان کے چاروں طرف مساجد ہیں۔ میں علامہ کے ساتھ تھا۔ یکایک علامہ بہت بے چین نظر آئے۔ فرمایا! اندر چلو۔ شیش محل پہنچ کر وہ اپنے پلنگ پر بیٹھ گئے اور کافی دیر تک بالکل خاموش رہنے کے بعد یہ دو شعر لکھوائے:

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

[کلیات اردو، ص 526]

جب راس مسعود تشریف لائے تو میں نے علامہ کی موجودگی میں اُن کو یہ اشعار سنائے۔ راس مسعود نے کہا: ''یہ حقیقت ہے لیکن افسوس اب تو اذاں کی صرف رسم باقی رہ گئی ہے''۔ اور پھر اقبال کا یہ شعر پڑھا:

تری نماز میں باقی جلال ہے، نہ جمال

تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

[کلیات اردو، ص 536]

۴؍ اپریل ۱۹۳۶ء کو جب اقبال شیش محل میں مقیم تھے میں صبح کے وقت حسب معمول اُن کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا، فرمایا:

تم اچھے آگئے مجھے تمہارا انتظار تھا۔ رات میں نے مسعود کے دادا سید احمد خان کو خواب میں دیکھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا: میں حضور رسالت مآب ﷺ کی خدمت اقدس میں اپنی صحت کے لیے عرضداشت پیش کر وں۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میری زبان پر یہ شعر تھا:

با پرستاران شب دارم ستیز
باز روغن در چراغ من بریز[4]

[کلیات فارسی، ص ۷۲۲]

میں نے اُسی وقت حضور رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں بطور نذرانۂ عقیدت اشعار لکھنا شروع کر دیے۔

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ میں نے اُن کو اتنا بے چین کبھی نہیں دیکھا تھا۔ عجب کیفیت طاری تھی ان کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں تھیں۔ کافی دیر تک بالکل خاموش رہنے کے بعد انھوں نے مجھ سے فرمایا: ''میرے پاس بیٹھ جاؤ اور جو میں بولتا جاؤں لکھتے جاؤ''۔

---

[4] ترجمہ:

جنگ ہے میری پرستاران شب سے برملا
تیز کر دے اور روغن ڈال کر میرا دیا

[صدیقی، ص ۱۳۹۰]

انھوں نے مجھ سے کئی شعر لکھوائے۔ وہ بہت آہستہ آہستہ نہایت کمزور آواز میں اشعار بول رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نور کی بارش ہو رہی ہے۔ اشعار خود بخود نازل ہو رہے تھے۔ پھر ان کی آواز تقریباً بند ہو گئی اور وہ اس قدر روئے کہ رخسار آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ کافی دیر کے بعد فرمایا: ''اب اس وقت تم جاؤ اور جو کچھ تم نے لکھا ہے اس کو میرے سرہانے رکھ دو''۔

ایک دن شیش محل میں سیّد راس مسعود، عابد حسین، [غلام] سیدین، شعیب قریشی اور یہ خاکسار علامہ کی خدمت میں حاضر تھے، عظمت آدم کا ذکر چھڑ گیا۔ علامہ نے آنکھیں نیم وا کرتے ہوئے کہا: ''انسان کی منزل تو منزلِ کبریا ہے''۔

اس پر راس مسعود نے اقبال کا یہ شعر پڑھا:

شعلہ در گیر زد بر خس و خاشاک من
مرشد رومی کہ گفت ''منزل ما کبریاست''[5]

[کلیات فارسی، ص ۳۰۹]

عابد حسین نے کہا فاؤسٹ نے بھی ابلیس سے یہ پیمان کیا تھا کہ اگر میں کسی لمحے کو مخاطب کر کے کہوں کہ ٹھہر جا تو کتنا حسین ہے، تو تجھے اختیار ہے کہ مجھے طوق و سلاسل میں جکڑ کر قصرِ مذلت میں دھکیل دے۔

---

[5] ترجمہ:

شعلہ جگایا مرے مرے پیکر خاشاک میں
رومی نے کہہ کر کہ ہے ''منزل ما کبریا''

[صدیقی، ص ۷۰۲]

راس مسعود نے پھر علامہ کا مصرع پڑھا:

سر منزلی ندارم کہ بمیرم از قراری[6]

[کلیات فارسی، ص279]

اقبال نے کہا: ''مسعود تم کو تو میرے بہت سے فارسی اشعار یاد ہیں''۔

غرض کس کس بات کا ذکر کروں یہ داستان تو بہت طویل ہے۔ یہ تو میرے عشق کا قصہ ہے جو ایک دفتر میں بھی نہیں سما سکتا۔

اقبال کے دورانِ قیام بھوپال ان کی فیضانی مجلسوں میں بڑی عالمانہ باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ خودی اور بے خودی، عشق اور عقل، تصورِ زمان و مکاں، حیات اور مرگ، جبر اور اختیار، حکومت اور ریاست، بندہ اور خدا غرض اس طرح کے عظیم مسائل زیر بحث آتے تھے۔ علامہ زیادہ تر تو خاموش رہتے لیکن اپنی ناسازیٔ طبع کے باوجود وہ جب ان مسائل کے بعض اہم نکات آہستہ آہستہ بہت دھیمی آواز میں بیان کرتے تو ان کے علم کا اندازہ لگانا کم از کم میرے لیے ناممکن تھا۔ راس مسعود ان کی باتوں کو سن کر اقبال ہی کا یہ شعر ان کو سنایا کرتے تھے۔

خرد افزود مرا درس حکیمان فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظران[7]

---

[6] ترجمہ:

نہیں ہے کوئی منزل ایسے دل فگار کے لیے

[صدیقی، ص657]

[7] ترجمہ:

میری عقل افرنگ کے دانشوروں نے کی فزوں
سینے کو کرتی ہے روشن صحبت اہل نظر

[کلیات فارسی، ص 294]

۳۱ر جولائی ۱۹۳۷ء کو بھوپال میں سید والا گہر سر سید ثانی سر راس مسعود کا انتقال ہو گیا۔ ان کے جسد خاکی کو حسن محمد حیات صاحب اور میں نے علی گڑھ لے جا کر یونیورسٹی مسجد میں سر سید اور سید محمود کی قبروں کے درمیان دفن کیا۔ راس مسعود کی رحلت کا اقبال کو ناقابل بیان رنج ہوا۔ اقبال نے ۷ر اگست ۱۹۳۷ء کو مجھے حسب ذیل خط لکھا:

ڈیئر ممنون صاحب
مسعود مرحوم کے کتبۂ مزار کے لیے میں نے حسب ذیل رباعی انتخاب کی ہے:

نہ پیوستم درین بستان سرا دل
ز بند این و آن آزادہ رفتم
چو باد صبح گردیدم دمی چند
گلان را آب و رنگی دادہ رفتم [8]

[کلیات فارسی، ص ۲۱۵]

یہ رُباعی میں نے اپنے کتبۂ مزار کے لیے لکھی تھی۔ لیکن تقدیر الٰہی یہ تھی کہ مسعود مرحوم مجھ سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو جائے حالانکہ عمر کے

[صدیقی، ص 678]

[8] ترجمہ:

میں نے اس بستاں سرا میں دل لگایا ہی نہیں
تھا کمند ایں و آں سے دور صد فرسنگ میں
آ گیا دم بھر کو باد صبح کی صورت یہاں
ہو گیا رخصت گلوں کو دے کے آب و رنگ میں

[صدیقی، ص ۵۵۲]

اعتبار سے مجھ کو ان سے پہلے جانا چاہیے تھا۔اس کے علاوہ رُباعی کا مضمون مجھ سے زیادہ اُن کی زندگی اور موت پر صادق آتا ہے۔
لیکن اگر ایک ہی مطلع اُن کے سنگِ مزار پر لکھنا ہو تو مندرجہ ذیل شعر میرے خیال میں بہتر ہوگا:

ای برادر من تُرا از زندگی دادم نشان
خواب را مرگ سبک دان مرگ را خواب گران[9]

[کلیاتِ فارسی، ص ۳۴۲]

باقی خیریت ہے مسعود کا غم باقی رہے گا جب تک میں باقی ہوں۔میرے پہلے خط کا مفصل جواب دیجیے۔

محمد اقبال

اقبال نے سنگِ مزار کے سلسلہ میں سیدین کو بھی لکھا۔ طے یہ کیا گیا کہ رُباعی سنگِ مزار پر کندہ کرائی جائے۔
۲۳ر اگست ۱۹۳۷ء کو اقبال نے مجھ کو پھر ایک مکتوب ارسال فرمایا جس کا اقتباس حسبِ ذیل ہے:

مسعود مرحوم کی وفات پر جو اشعار میں نے لکھے تھے وہ آج میں نے رسالہ اُردو میں چھپنے کے لیے حیدرآباد دکن بھیج دیے ہیں۔ مدیر رسالہ مولوی عبدالحق، مسعود نمبر نکالنے والے ہیں۔آپ کو یہ رسالہ بھوپال میں مل جائے گا۔خود بھی پڑھیے اور لیڈی مسعود کو بھی سنایئے۔

اس تاریخی نوحہ کا صرف ایک شعر پیش ہے:

---

[9] ترجمہ:

اے برادر، میں تجھے دوں زندگانی کا نشاں
خواب ہے مرگ سبک اور مرگ ہے خواب گراں

[صدیقی، ص ۷۵۰]

زوالِ علم و ہُنر مرگِ ناگہاں اُس کی
وہ کارواں کا متاعِ گراں بہا مسعود!

[کلیات اردو، ص 723]

میری خوش بختی اور اُن کی خادم نوازی ملاحظہ فرمایئے کہ شاعر مشرق دانائے راز حضرت اقبال مجھ پر بے حد شفقت فرماتے تھے۔ ان کو میرے مستقبل کی بہت فکر تھی۔ ۱۹ر اپریل ۱۹۳۸ء کو یعنی اپنے انتقال سے دو روز قبل تک حضرت علامہ نے مجھ کو یاد رکھا۔ شاید میرے نام ان کا یہ خط اُن کا آخری خط تھا۔ اس کے بعد انھوں نے کسی کو کوئی خط نہیں لکھا۔

تقریباً ۲۵ سال سے میں اس کوشش میں تھا کہ بھوپال میں اقبال کی یادگار قائم کرائی جائے۔ آخرکار رب العزّت کی بارگاہ سے یہ دعا قبول ہوئی۔ بھوپال میں اقبال کے شایانِ شان یادگاریں قائم کی گئی ہیں۔ اس کام میں بھوپال کے ایک لائق فرزند جناب عزیز قریشی ایم۔ پی [ممبر پارلیمنٹ: رکن مجلس شوریٰ] نے نمایاں حصہ لیا۔ حکومت مدھیہ پردیش کی اس ادب نواز سیکولر [لادینی] پالیسی کی جس قدر تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ اس سیکولر حکومت کے سابق وزیر اعلیٰ جناب ارجن سنگھ نے یہ احکام جاری کیے تھے کہ شیش محل کے سامنے والے میدان کا نام اقبال میدان رکھا جائے۔ بھوپال ڈویلپمنٹ اتھارٹی [مقتدرۂ ترقیِ بھوپال] کے ذریعہ اس میدان میں ایک نہایت حسین کلچرل پارک [ثقافتی سیرگاہ] تعمیر کرا کے وہاں ایک شاندار اقبال میموریل [یادگار] تعمیر کرایا جائے۔ اقبال ادبی مرکز قائم کیا جائے اور اس مرکز کو شیش محل کے وہ کمرے دیے جائیں جن میں اقبال نے قیام فرمایا تھا۔ مدھیہ پردیش کے موجودہ ادب نواز وزیر اعلیٰ شری موتی لال دورا نے اقبال کی یادگاروں کی ان اسکیموں کو اپنے سیکولر ادب نواز ذہنیت کا بہترین مظاہرہ کر

کے نہایت عمدگی کے ساتھ مکمل کرایا ہے۔اقبال میدان اور اس کا میموریل، ہندوستان میں اقبال کی نہایت شاندار یادگار ہے اور ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے لوگ بھوپال آ کر اس کی زیارت کر رہے ہیں اور اس قومی یک جہتی کے سنگم کی تعریف کر رہے ہیں۔

مدھیہ پردیش کے موجودہ ادب نواز وزیر اعلیٰ شری موتی لال دورا نے میری درخواست پر ایک آل انڈیا اقبال ایوارڈ [کل ہند اقبال انعام] بھی منظور فرمایا ہے جو پچاس ہزار روپے سالانہ کا ہے۔ان کی قومی یک جہتی کی کوششوں کا یہ ایک اور شاندار ثبوت ہے۔

ہماری مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے سیکولر کردار کا یہ جیتا جاگتا مظاہرہ تاریخ ادب میں سنہرے الفاظ میں لکھا جائے گا۔

حضرت علامہ اقبال کا ادنیٰ کفش بردار
ممنون حسن خان
صدر آل انڈیا علامہ اقبال ادبی مرکز، بھوپال
و صدر نشین بھوپال ڈیولپمنٹ اتھارٹی

ضمیمہ

ممنون حسن کا خط جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کے نام

Phones: 74567, 76006
Humayun Manzil
Oppt: Fire Station

19 Sultania Rd;
BHOPAL (462001).

INDIA.

۲۹ جولائی ۱۹۸۶ء

عزیز القدر عزت مآب عالی مرتبت میاں جاوید سلمہ سلام مسنون، بہت بہت دعائیں۔

مدت دراز سے خیریت نہیں معلوم ہوئی۔ فکر ہے۔ ذرا دو چار منٹ کا وقت نکال کر اپنی اور جملہ متعلقین کی خیریت سے آگاہی بخشی جائے۔ ممنونِ کرم تو ہمیشہ سے ہوں ہی اور زیادہ ممنون ہوں گا۔ خدا کرے آپ سب ہر طرح سے بخیریت اور خوش و خرم ہوں۔

اس عریضہ کے ساتھ آپ کی خدمت میں اپنی اس تقریر کی ایک نقل ارسال کر رہا ہوں جو میں نے عالمی اقبال سیمینار حیدر آباد (دکن) میں دی تھی۔ شاید آپ کو پسند آئے۔ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں اور کوئی حرج یا دشواری نہ ہو تو اس تقریر کو آپ پاکستان کے کسی اچھے رسالے میں شائع کرا دیں۔ ویسے یہ اس قابل تو نہیں ہے کہ اس کی اشاعت کی جائے لیکن چونکہ حضرت علامہ کی چند فیضانی صحبتوں کا اس میں ذکر ہے اس لیے شاید پاکستان میں یہ پسند کی جائے۔ غالباً نقوش میں آپ کی مدد سے یہ تقریر چھپ سکتی ہے۔ اگر ذرا بھی دقت ہو تو شائع کرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

آپ اپنی مصروفیت کی وجہ سے گزشتہ اپریل ۸۶ء میں تو ادبی سیمینار میں ہمارے پاس بھوپال میں تشریف نہ لا سکے جس کا مجھے اور بھوپال میں تمام علم دوست حضرات کو بہت افسوس ہے۔ حیدرآباد والے بھی بہت افسوس کرتے تھے کہ وہاں عالمی سیمینار میں آپ شرکت نہ کر سکے۔ اب آپ سے میری دست بستہ گزارش ہے کہ آپ بھوپال نومبر ۸۶ء میں ضرور تشریف لائیں۔ اقبال ادبی مرکز یہاں ۸، ۹ اور ۱۰ نومبر کو ایک بڑا سیمینار منعقد کرا رہا ہے۔ مظفر حسین برنی صاحب اور دیگر ماہرین اقبالیات اس سیمینار میں شرکت کریں گے۔ میں آپ کو بہت پہلے اس کی اطلاع دے رہا ہوں۔ کسی نہ کسی طرح میری خاطر آپ کو یہاں اس ادبی جلسہ میں تشریف لانے کی تکلیف اٹھانا ہی پڑے گی۔ اگر آپ نے انکار کیا تو مجھے خود اس عالم پیری میں آپ کو یہاں لانے کے لیے لاہور آنا پڑے گا۔ بمہربانی مطلع فرمائیں کہ کیا آپ ہماری خاطر یہ تکلیف اٹھانا منظور فرماتے ہیں۔ آپ کے جواب آنے پر دعوت نامہ اور دیگر کاغذات سیمینار کے مضمون وغیرہ کے متعلق آپ کی خدمت میں باقاعدہ ارسال کروں گا۔ آپ کے پروٹوکول [تشریفات] کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔ اگر گورنمنٹ آف انڈیا [حکومتِ ہند] کی منظوری کی ضرورت ہوگی تو میں خود دہلی جا کر ضروری احکام جاری کراؤں گا۔ یہاں آپ ہماری گورنمنٹ کے مہمان ہوں گے جس طرح برنی صاحب بھی ہوں گے۔ اس ادبی تقریب میں مہاراشٹر کے گورنر جناب شنکر دیال شرما بھی شرکت کریں گے اور یو پی کے گورنر جناب عثمان عارف سے بھی درخواست کروں گا کہ وہ بھی شرکت فرمائیں۔ ہمارے مرکز کے ممبران ملک راج آنند، مالک رام، محترمہ قرۃالعین حیدر، جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر علی سردار جعفری، آل احمد سرور بھی سیمینار میں حصہ لیں گے اور مقالات پڑھیں گے۔ حکومت مدھیہ پردیش نے جو آل انڈیا ایوارڈ پچاس ہزار روپے سالانہ کا جاری کیا ہے وہ بھی کسی

ایک ماہرِ اقبالیات کو اس سیمینار میں دیا جائے گا۔ غرض کہ یہ ایک بڑا سیمینار ہوگا اور آپ کی موجودگی سے اس تقریب سعید میں چار چاند لگ جائیں گے۔ مجھے آپ سے پوری اُمید ہے کہ اس بار آپ ہم سب کو اپنی موجودگی سے ممنونِ کرم فرمائیں گے۔ آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔ یہ تو بالکل ادبی سیمینار ہے۔ خداوند کریم آپ سے ایک بار تو میری ملاقات کرا دے۔ ہم تو اب مرزا کی طرح کہتے رہتے ہیں ''عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے۔''

پاکستان کے ایک صاحب نے مجھے ایک کتاب ارسال کی ہے جس کا عنوان ہے خدو خالِ اقبال۔ اس کتاب کو محمد امین زبیری نے لکھا تھا جو مدت ہوئی مرحوم ہو گئے۔ اپنی زندگی میں تو وہ یہ 'کارِ نمایاں' نہ کر سکے لیکن ان کے صاحب زادے نے کسی صاحب کے ذریعہ اب یہ کارِ بد کرایا ہے۔

اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند[10]

کتاب کو پڑھنے سے مجھے بخار آ گیا۔ جعفر تو مر گیا لیکن اس کی روح زندہ ہے۔ افسوس کہ ملت اسلامیہ میں ایسے بد نفس اور کینہ پرور لوگ موجود ہیں۔ آپ نے شاید اس کتاب کو پڑھا ہوگا۔ اس میں ہر طرح حضرت علامہ کے بلند و بالا کردار کو مسخ کرنے کی ناکامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ابھی یہ کتاب ہندوستان میں صرف میرے پاس ہے اور انشاء اللہ میں اس کا جواب ضرور لکھوں گا اور پاکستان ہی میں شائع کراؤں گا۔ محمد امین زبیری مرحوم نے علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے کردار پر بھی کچھ اسی طرح ناکامیاب حملہ کیا تھا اور ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس کا عنوان ہے شبلی کی رنگین زندگی۔ مہربانی کر

---

[10] ترجمہ:

باپ اگر نہ کر سکا تو بیٹا تکمیل کر دے گا

مترجم: محمد سہیل عمر

کے مطلع فرمائیں کہ کیا محمد امین کی کتاب خدوخالِ اقبال آپ تک پہنچ گئی ہے یا نہیں اور پاکستان کے ادیب محمد امین صاحب مرحوم کی غلط بیانیوں کا جواب دے رہے ہیں یا نہیں۔ کتاب مذکور کی فوٹو اسٹیٹ کاپی [عکسی نقل] میں برنی کو بھی ارسال کر رہا ہوں اور وہ بھی انشاء اللہ اس بے ادبی اور غلط بیانی کا جواب شائع کریں گے۔

عزیزہ منیرہ سلمہا کی خیریت سے اطلاع دیجیے اور ان تک میری دعائیں اور پیار پہنچا دیا جائے۔ اپنی بیگم صاحبہ محترمہ اور بچوں کو، منیرہ سلمہا کے شوہر نامدار اور بچوں کو بھی میری دعائیں پہنچا دی جائیں۔ اللہ ہمیشہ آپ سب کے ساتھ رہے۔!

یہاں چند لوگ (مسلمان) میرے بھی پیچھے پڑ گئے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں نے اقبال میدان بنوا کر لاکھوں روپیہ ضائع کرا دیا اور یہ کہ حضرت علامہ سے میرا کوئی تعلق نہ تھا۔ بہرحال یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ اقبال پارک اور اقبال مرکز بنوا کر اور اقبال ایوارڈ قائم کرا کر میں نے ملّتِ اسلامیہ کی ایک ادنیٰ خدمت کی یا نہ کی، اور بھوپال کے نام کو تاریخ ادب میں زندہ جاوید کرا دیا یا نہیں۔ رہا میرے اس تعلق خاص کو جو علامہ سے علی بخش مرحوم کی طرح بطور ان کے ادنیٰ سفتہ گوش اور کفش بردار کے تھا اور اس طرح جو روحانی رشتہ اب آپ کے اور عزیزہ منیرہ سلمہا کے ساتھ میرا ہے اس کو آپ سے زیادہ کوئی دوسرا نہیں جانتا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کی تصدیق فرمائیں کہ حضرت علامہ کے ساتھ میرا تعلق خاص رہا تھا یا میں نے کسی غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس مسئلہ پر آپ ضرور روشنی ڈالیں گے جس کے لیے میں آپ کا ممنونِ کرم ہوں گا۔ والسلام

بخدمت جناب عزت مآب عالی مرتبت ڈاکٹر جاوید اقبال سلمہ'۔

حضرت علامہ اقبال کا ادنیٰ کفش بردار
(ممنون حسن خان)
ہندوستان کے سب سے بڑے اور سب سے قدیم اخبار ہندو میں اقبال میدان کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا تھا اس کی بھی ایک فوٹو کاپی ملاحظہ کے لیے ارسال کر رہا ہوں اور اقبال میدان کے افتتاح کے موقع پر جو بروشر [کتابچہ] شائع کیا گیا تھا اس کی بھی ایک کاپی ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ ہندوستان اور بیرون ہند کے بڑے بڑے فن کاروں، مجسمہ سازوں اور ادیبوں نے اقبال میموریل کی جو تعریف کی ہے ان تمام کاغذات کی بھی فوٹو کاپیاں بنوا کر انشاء اللہ خدمت والا میں ارسال کروں گا۔ پاکستان میں بھی کئی اخبارات اور رسالوں نے اقبال میدان کی تعریف میں مضامین شائع کیے ہیں جو ملاحظہ سے گزرے ہوں گے۔ اس کے باوجود چند مسلمان حضرات یہاں میرے پیچھے پڑ گئے ہیں کہ میں نے یہ کام کرا کر لاکھوں روپے ملیا میٹ کرا دیے ہیں اور حضرت علامہ سے میرا کوئی بھی تعلق نہیں تھا۔ اب آپ اس ستم ظریفی کو ملاحظہ فرمائیں اور میرے لیے دعا فرمائیں۔

ع مشکلیں امت مرحوم کی آساں کر

دے۔

[کلیات اردو، ص ۱۰۶]

میرا عریضہ کافی طویل ہو گیا ہے اور میں بدخط بھی ہوں۔ بہت بہت معافی چاہتا ہوں۔

جواب کا انتظار رہے گا۔

حضرت علامہ کا ادنیٰ سفتہ گوش

ممنون

(ممنون حسن خان عفی عنہ')

جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کا خط
ممنون حسن خان کے نام

محترمی و مکرمی جناب ممنون حسن خان صاحب

سلام مسنون!

آپ کا خط مؤرخہ ۲۹ جولائی ۱۹۸۶ء مع دیگر ملفوظات اور کاغذات موصول ہو گیا جس کے لیے میری طرف سے بہت بہت شکریہ قبول فرمایئے۔

عالمی اقبال سیمینار جو حیدرآباد (دکن) میں ۲۱ر اپریل ۱۹۸۶ء کو منعقد ہوا، میں آپ کا مقالہ میں نے غور سے پڑھا۔ مقالے میں آپ نے جس محبت اور خلوص سے حضرت علامہ کی بھوپال میں چند فیضانی صحبتوں کا ذکر کیا ہے اس سے کوئی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مقالہ پڑھتے وقت کئی مقامات ایسے آئے کہ میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا کیونکہ ایک دفعہ میں بھی حضرت علامہ کے ساتھ بھوپال گیا تھا اور شیش محل میں ان کے ساتھ ٹھہرا تھا۔ شیش محل کے سامنے میدان سے جس کو اب آپ کی کوششوں سے اقبال میدان کا نام دیا گیا، میرے بچپن کی یادیں وابستہ ہیں کیونکہ میں اسی میدان میں جناب ڈاکٹر باسط (حضرت علامہ کے معالج) کے بچوں کے ساتھ کھیلتا رہا ہوں۔ آپ نے اپنے مقالے میں اس خواب کا بھی ذکر کیا ہے جس میں حضرت علامہ نے جناب سید راس مسعود کے دادا سر سید احمد خان کو خواب میں دیکھا تھا۔ اس خواب کا ذکر حضرت علامہ نے جناب سید راس مسعود کے نام ایک خط میں بھی کر رکھا ہے۔ مثنوی پس چہ

یاد کرد اسی خواب کے نتیجے میں تحریر کی گئی۔ دراصل حضرت علامہ نے سر سیّد احمد خان سے اپنی علالت اور معذوری کی شکایت کی تھی اور انھوں نے ارشاد فرمایا تھا کہ حضور رسالت مآب ﷺ کی خدمت اقدس میں اپنی صحت یابی کے لیے عرضداشت پیش کرو۔ خواب ہی میں اشعار کا تلاطم اُمڈ آیا اور انھیں اشعار نے بعد میں مثنوی پس چہ باید کرد کی صورت اختیار کی۔ اسی طرح مقالے میں آپ نے ریاض منزل میں بعض صحبتوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے ایک آدھ میں میں موجود تھا۔ آپ کے مقالے کی حیثیت تاریخی ہے کیونکہ حضرت علامہ کو جاننے والی ہستیاں رفتہ رفتہ اُٹھتی چلی جا رہی ہیں۔ اسی سبب میں نے آپ کا یہ مقالہ پاکستان کے ایک معروف روزنامہ نوائے وقت جو لاہور، کراچی، راولپنڈی اور ملتان سے بیک وقت شائع ہوتا ہے، میں اشاعت کے لیے بھجوا دیا ہے۔ اسی طرح اقبال اکیڈیمی کے رسالہ اقبال ریویو میں بھی یہ مقالہ شائع ہوگا۔ نوائے وقت اور اقبال ریویو میں آپ کی ارسال کردہ تاریخ تعمیر یادگار اقبال بھوپال کا قطعہ، اقبال میدان کے افتتاح کے موقع پر شائع شدہ بروشر اور یادگار اقبال کے سلسلے میں مینارِ شاہین کی تصاویر مع اس انگریزی مضمون کے جو ہندوستان کے اخبار ہندو میں اس ضمن میں شائع ہوا، سب کی سب شائع کیے جائیں گے۔ اشاعت کے بعد میں انشاء اللہ ان کی نقول آپ کو ارسال کروں گا۔

افسوس ہے میں حیدرآباد دکن والے عالمی اقبال سیمینار میں شریک نہ ہو سکا۔ اب آپ فرما رہے ہیں کہ ۸، ۹ اور ۱۰ر نومبر ۱۹۸۶ء کو بھوپال میں اقبال ادبی مرکز ایک بہت بڑا سیمینار منعقد کر رہا ہے اور آپ کی خواہش ہے کہ میں اس ادبی جلسے میں شریک ہوں۔ مگر افسوس ہے کہ ان ایام میں چونکہ لاہور اور پاکستان کے دیگر شہروں میں بھی حضرت علامہ کی یاد میں تقاریب

کے انعقاد کا اہتمام کیا جاتا ہے اس بناء پر میرے لیے بھوپال آ سکنا ممکن نہیں۔علاوہ اس کے ماہ نومبر ۱۹۸۶ء میں او۔آئی۔سی کے تحت اسلامی ورثے کے تحفظ کے سلسلے میں ایک ادارے کی میٹنگ کے لیے میرا استنبول (ترکیہ) جانے کا امکان ہے۔اصل میں میری تو یہ کوشش ہے کہ ایسے ہی کسی موقعے پر اقبال اکیڈیمی پاکستان کے ذریعے آپ کو مقالہ پڑھنے کے لیے لاہور بلوایا جائے تاکہ اس طرح نہ صرف ہماری آپس میں ملاقات ہو سکے بلکہ آپ عزیزہ منیرہ، اُن کے شوہر اور بچوں سے بھی مل سکیں اور اسی طرح مزارِ اقبال پر بھی حاضری دے سکیں۔ جگن ناتھ آزاد، آل احمد سرور، مولانا صباح الدین، عبدالرحمان اور گوپی چند نارنگ اسی طرح دو تین بار لاہور آ چکے ہیں۔اب اگر آپ کی صحت اجازت دے اور آپ لاہور تک سفر کرنے کے لیے تیار ہوں تو مجھے ضرور تحریر کیجئے گا تاکہ آپ کو لاہور مدعو کیا جا سکے۔

میری نظروں سے کتاب خد و خالِ اقبال نہیں گزری۔البتہ میں نے اُس کے متعلق سن رکھا ہے۔حضرت علامہ اقبال کے کردار کو مسخ کرنے کی ایسی کوششیں ہندوستان اور پاکستان میں ہوتی رہتی ہیں لیکن اُن کا نوٹس نہیں لیا جاتا۔بہرحال اگر آپ اس پر تبصرہ تحریر کریں تو بیشک اُس کی نقل مجھے بھیج سکتے ہیں اور اگر آپ چاہیں تو اس تبصرے کو یہاں کی اخبارات اور رسائل میں شائع کرایا جا سکتا ہے۔پاکستان کے ادباء نے اس کتاب میں درج غلط بیانیوں کا جواب دینا ضروری خیال نہیں کیا۔شاید اُن کے نزدیک ایسے لٹریچر کی کوئی اہمیت نہیں۔

عزیزہ منیرہ بخیریت ہیں۔انھیں ان کے شوہر اور بچوں کو آپ کا سلام اور دعائیں پہنچا دی گئی ہیں۔وہ بھی آپ کی دعاؤں کا شکریہ ادا کرتی ہیں اور

سلام بھیجتی ہیں۔

مجھے یہ پڑھ کر سخت تعجب ہوا کہ وہاں کے بعض مسلمان آپ کے پیچھے پڑ گئے ہیں کہ آپ کا حضرت علامہ سے کوئی تعلق نہ تھا اور یہ کہ آپ نے اقبال میدان تعمیر کروا کر لاکھوں روپے ضائع کرا دیے۔ میرے لیے یہ خبر مزید کوفت کا باعث ہے کہ ایسا وقت بھی آنا تھا کہ اس ضمن میں آپ مجھ سے تصدیق کرانا چاہیں گے۔ آپ نے لکھا ہے کہ میں اس کی تصدیق کروں کہ آپ کا تعلق حضرت علامہ سے رہا تھا یا آپ نے کسی غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ اس مسئلے پر روشنی ڈالوں۔ ایک ایسی بات جو اظہر من الشمس ہو پر کیا روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ پاکستان میں تو اقبال شناس آپ کو اُن چند برگزیدہ ہستیوں میں شمار کرتے ہیں جن کی حضرت علامہ سے وابستگی تھی۔ مجھے بھی آپ بخوبی یاد ہیں کیونکہ میں بھی جب حضرت علامہ کے ساتھ بھوپال آیا تو آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ جناب سید راس مسعود کے معتمد خاص ہونے کے بسبب وہ آپ ہی کو اپنے جگری دوست کی بھوپال میں نگہداشت کے لیے وقف کر دیا کرتے تھے۔ میں نے اس کا ذکر زندہ رُود کی جلدوں میں بھی کر رکھا ہے۔ پھر آپ کے نام حضرت علامہ کے کئی خطوط اقبال نامہ کی جلدوں میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اس لیے آپ کو اس ضمن میں میری تصدیق کی ضرورت نہیں کیونکہ آپ کے حضرت علامہ سے تعلق کی تصدیق تو وہ خود آپ کے نام اپنے خطوط میں کر چکے ہیں۔

بھوپال میں اقبال میموریل کے سلسلے میں ہندوستان اور بیرون ہند کے بڑے بڑے فنکاروں، مجسمہ سازوں اور ادیبوں نے جو تبصرے یا کلمات شائع کرائے ہیں، ان تمام کاغذات کی نقلیں بھی مجھے ارسال کیجیے گا جو یہاں کی اخباروں میں شائع کرائے جا سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے بھوپال

میں بالخصوص شیش محل میں اقبال مرکز قائم کروا کر اور اس کے سامنے اقبال میدان میں مینار شاہین تعمیر کروا کر نیز پچاس ہزار روپے کی مالیت کا اقبال ایوارڈ مقرر کروا کر نہ صرف بھوپال کے نام کو تاریخِ ادب میں زندہ جاوید کر دیا یا ہندوستان میں ملّتِ اسلامیہ کی خدمت کی بلکہ پاکستان اور ہندوستان کی آپس میں محبت اور دوستی قائم و دائم رکھنے کی ایک ایسی مثال قائم کر دی ہے جس کو آنے والی نسلیں سراہتی رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس خدمت کا ضرور اجر دے گا۔ امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

والسلام

خیر اندیش

جاوید اقبال

نوٹ:

آپ کا میرے نام خط مؤرخہ ۲۹ جولائی ۱۹۸۶ء اور میرا یہ جواب بھی اقبال اکیڈمی کے رسالے اقبال ریویو میں شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالے کی ایک کاپی آپ کو ارسال کر دی جائے گی۔ انشاء اللہ۔

جاوید اقبال

۲۰

علامہ اقبال کی خدمت میں میری پہلی اور آخری حاضری*

ڈاکٹر مہر عبدالحق[1]

یہ ۱۹۳۳ء کی بات ہے۔ میں صادق ایجرٹن کالج بہاولپور میں تھرڈایئر[تیسرے سال] کا سٹوڈنٹ[طالبِ علم] تھا۔ کئی دنوں بلکہ ہفتوں سے ہوسٹل کے لڑکوں میں کالج کی ادبی محفلوں کے پروگراموں میں اور شہر کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے درمیان چکبست کا یہ شعر گرما گرم مباحثوں کا موضوع بنا ہوا تھا:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے ، انھی اجزاء کا پریشاں ہونا

اٹھارہ اُنّیس سال کی عمر میں زندگی اتنی پیاری، حسین اور دلکش دکھائی دیتی ہے کہ اس کی رعنائیوں کے خلاف کہی ہوئی کوئی بات اچھی نہیں لگتی۔ یہاں تک کہ اس کو گھن کی طرح کھا جانے والے عوارض مثلاً افلاس، بیماری، بڑھاپا، تفکّرات بلکہ موت تک کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ اس عمر کی جذباتیت کو دیوانگی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جوانی میں انسان زمانے کی نامساعدت کے ہزاروں صدمے سہہ لیتا ہے لیکن زندگی کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔

---

* سہ ماہی، اقبالیات اردو، جلد ۳۱، شمار ۲-۴، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، جولائی ۹۰,/ جنوری ۱۹۹۱ء۔

[1] ڈاکٹر مہر عبدالحق کی علامہ اقبال کے بارے میں تصنیف کے لیے دیکھیے:
مہر عبد الحق، جاوید نامہ: منظوم ترجمہ مع حواشی و توضیحات، ملتان، سرائیکی ادبی بورڈ، ۱۹۷۴ء۔

چکبست کے مذکورہ شعر میں زندگی کی توہین کا پہلو ہمارے دل و دماغ میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ بڑے بڑے دانشوروں، ادیبوں، مذہبی رہنماؤں اور نامور اساتذہ کرام کی زبانِ فصاحت نظام سے طرح طرح کی تشریحات اور توضیحات سننے میں آئیں لیکن کوئی ایک توجیہ بھی ہم چند طالب علموں کو مطمئن نہ کر سکی۔

ایک شام کو 'دارالاقامہ' کے کمرہ نمبر ایک میں محض اتفاق سے چند دوست جمع ہو گئے اور باتوں باتوں میں پھر اسی شعر کا ذکر چھڑ گیا لیکن اس مرتبہ ہماری سوچ کسی ایسی عظیم ہستی کی تلاش میں تھی جو ہمارے قلبِ مضطرب کو تسکین عطا کر سکے۔ علم و ادب اور زہد و تقویٰ کی بڑی بڑی قد آور شخصیات کے اسمائے گرامی سامنے آئے لیکن جونہی کسی نے علامہ اقبال کا نام لیا سب نے بیک آواز اس کی تائید کی کیونکہ جوانوں کو آہِ سحر سے لذّت آشنا کرنے کی تمنّا اسی مردِ خود آگاہ نے کی تھی۔ چنانچہ یہ تو طے ہو گیا کہ شعر کے مضمرات کی تفہیم کے لیے شاعرِ مشرق سے رجوع کیا جائے گا تاہم اس کی عملی صورت کیا ہوگی، آیا خط و کتابت سے کام لیا جائے گا یا کالج کی معرفت استفسارات بھیجے جائیں گے یا ہم طلبہ کا کوئی وفد لاہور جا کر ترجمانِ حقیقت کے درِ فیض پر دستک دے گا، اس پر متفق الرائے ہونے کے لیے کئی نشستیں ہوئیں۔

اس دوران بہت سے احباب ہمیں چھوڑ بھی گئے کیونکہ عام رُجحان یہ تھا کہ انفرادی طور پر والدین کو لاہور کا خرچ برداشت کرنے پر راضی کیا جائے اور گرمی کی چھٹیوں میں کسی طے شدہ تاریخ پر ہم اکٹھے آستانۂ فقر و غنا پر حاضری دیں۔

اس منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے استقامت صرف چار دوستوں کے حصے میں آئی:

۱۔ عبدالصمد: بہاولپور
۲۔ غلام مرتضٰی محمود: سرگودھا
۳۔ شیخ غلام محمد: لیّہ اور
۴۔ راقم الحروف: لیّہ

میں ان دوستوں کے نام یہاں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ آج چھپّن سال کے بعد ہماری طالب علمانہ زندگی کا یہ نادر واقعہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ میرے تینوں ساتھی جو وکالت کے پیشے سے منسلک رہے ہیں، وفات پا چکے ہیں۔ میں بھی، جو کئی سالوں سے سوچ رہا ہوں کہ یہ واقعہ بیان کروں یا نہ کروں، قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ ویسے چند سال پہلے قدرت اللہ شہاب مرحوم کی صدارت میں منعقد ہونے والے ایک ادبی اجلاس میں یہ واقعہ بیان کر چکا ہوں۔ آج اسے ضبطِ تحریر میں لا کر محفوظ کر لینے کی ضرورت یوں محسوس ہوئی ہے کہ حال ہی میں میرے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ذہین دوست کی کتاب چھپی ہے جس میں انھوں نے تاریخ کے جدلیاتی وجوب پر بڑی شدّومد سے بحث کرتے ہوئے چکبست کا یہی شعر لکھا ہے اور اس کی وہی مادی تشریح پیش کی ہے جو میں چھپّن سال پہلے مختلف ادبی حلقوں میں سن چکا تھا۔ علامہ اقبال نے جو مفاہیم ہم طلبہ کو بتائے تھے وہ اب میرے لیے قومی امانت کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ان سطور کے ذریعے میں یہ امانت قوم کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ میرے اس بیان سے اُس زمانے کے طلبہ، والدین، دوست احباب اور عام معاشرے کے باہمی روابط کے کچھ خدوخال بھی سامنے آئیں گے جن سے نئی سوچ کو شاید کوئی رہنمائی مل سکے۔

بات، میں اس زمانے کی کر رہا ہوں جب کوئی مڈل پاس کر لیتا تھا تو سینکڑوں لوگ اسے دیکھنے کے لیے اُمڈ پڑتے تھے۔ کالج کی تعلیم پر زیادہ سے زیادہ خرچ دس بارہ روپے ماہانہ ہوتا تھا اور ان دس بارہ روپوؤں کے لیے

بھی والدین کو بڑی کٹھن مشکلات میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ میری اس سرگزشت سے فکرِ اقبال کے ناقدین کے سامنے کوئی نیا نکتہ آ جائے یا اس سے اقبال کے سوانح نگاروں کو کوئی مدد مل جائے۔

لاہور میں ہم چاروں دوستوں کا کوئی واقف نہیں تھا، نہ ہی ہم میں سے کسی نے پہلے لاہور دیکھا تھا۔ ہم کالج کی معرفت بھی جانا نہیں چاہتے تھے۔ شوق یہ دامن گیر تھا کہ کسی طرح اس عظیم شخصیت سے براہِ راست اور بالمشافہ گفتگو ہو جائے اور اس دوران کوئی اور 'بزرگ' حائل نہ ہو، ورنہ گفتگو بحث کا رنگ اختیار کر لے گی اور ہم دب کر رہ جائیں گے۔

میرے باقی تینوں دوستوں نے مجھے اطلاع دی کہ انھوں نے والدین سے اجازت حاصل کر لی ہے اور خرچ کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔ میں دوستوں کے یہ خط لے کر والد محترم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پوری تفصیل کے ساتھ معروضات پیش کیں۔ اجازت کے ساتھ خرچ کے لیے بھی التماس کی۔

والد صاحب طبعًا بہت سخت تھے لیکن انھوں نے بڑے تحمل کے ساتھ میری بات سنی۔ کچھ دیر خاموش رہے پھر فرمایا:

> تمہارا منصوبہ تو اچھا ہے تاہم تم لوگ کس طرح اس منصوبے کو کامیابی تک پہنچاؤ گے، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک دو دن انتظار کرو۔ تمہارے بہنوئی چھٹی آنے والے ہیں، میں ان سے مشورہ کر کے کوئی فیصلہ کر سکوں گا۔

میرے بہنوئی، مہر نور محمد، والد محترم کے بھانجے تھے اور گریجوایٹ تھے۔ بہ فضل خدا زندہ ہیں اور بانوے ترانوے کے پیٹے میں ہیں۔ ان دنوں مظفر گڑھ میں ڈپٹی کمشنر کے مثل خواں لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے ہماری پُر زور تائید کی اور یہ کہہ کر سارا مسئلہ حل کر دیا کہ مظفر گڑھ کے نواحی گاؤں

'مونڈکا' کے رہنے والے ایک بزرگ، مولوی کریم بخش شاکر گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر ہیں، وہ ان طلبہ کے قیام و طعام کا بندوبست بھی کریں گے اور شاعرِ مشرق تک ان کی رسائی بھی کرا دیں گے۔ میں انھیں تفصیلی خط لکھ دوں گا۔

والد محترم کی تسلّی ہو گئی۔ انھوں نے بہ طیبِ خاطر متوقع اخراجات کا انتظام بھی کر دیا اور ہماری علمی جستجو پر خوش ہوئے۔ تاہم فرمایا: "ایک بار پھر وہ شعر سناؤ جو بیک وقت آسان بھی ہے اور مشکل بھی"۔ میں نے شعر پڑھا، انھوں نے کوئی تاثر ظاہر نہ کیا لیکن شعر کو یاد کر لیا۔ چھ جماعتوں تک پڑھے ہوئے تھے۔ بہت زیرک، معاملہ فہم، سنجیدہ مزاج، سادہ طبیعت کے صاف باطن بزرگ تھے۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ کس حد تک اقبال کے کلام و پیام سے متاثر تھے تاہم اتنا جانتا ہوں کہ میری والدہ محترمہ جنھیں والد محترم نے پرائمری تک گھر ہی میں خود تعلیم دی تھی، مجھے اوائل طفلی میں اقبال کی نظم "پرندے کی فریاد" نہایت پُرسوز سریلی آواز میں سنایا کرتی تھیں۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لاہور سے سینکڑوں میل دور پس اُفتادہ علاقوں میں بھی علامہ کا کلام کتنا مقبول تھا۔

قصہ کوتاہ، ہم چاروں دوست پروفیسر کریم بخش شاکر صاحب کے مکان پر پہنچ گئے۔ پروفیسر صاحب نہایت بارُعب، کم گو اور کم آمیز بزرگ تھے۔ طویل قامت لیکن دبلے پتلے، فرش پر قالین بچھا کر بیٹھے تھے۔ سامنے ڈیسک پر نوشت و خواند کا سامان بڑے سلیقے سے چُنا ہوا تھا لیکن کمرے میں بے شمار کتابیں اِدھر اُدھر بکھری رہتیں۔ پرانی انارکلی کے دھوبی محلّہ میں ایک بالائی منزل کرائے پر لے رکھی تھی۔ اس میں اہل و عیال کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک علیحدہ کمرہ مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ ہمیں اسی کمرے میں ٹھہرایا

گیا۔ عام ضرورت کی تمام چیزیں مہیّا تھیں۔

پروفیسر صاحب ہمہ وقت مطالعہ اور غالباً تالیف و تصنیف میں مصروف رہتے تھے۔ ملاقاتی بہت کم آتے تھے۔ ملازم بھی کوئی نہیں تھا۔ محمد بخش نام کے ایک شخص جو کہیں لاہور ہی میں جز وقتی ملازم تھے ان کے ہاں اقامت گزیں تھے۔ اندر باہر کے سارے کام انہی کے سپرد تھے۔ ہم لوگ منہ ہاتھ دھو کر کچھ دیر آرام کر چکے تو یہی صاحب ہمارے کمرے میں آئے اور کہا کہ پروفیسر صاحب نے یاد فرمایا ہے۔ ہم ان کے ساتھ پروفیسر صاحب کے دارالمطالعہ میں پہنچے اور اشارہ ملنے پر ان کے سامنے نیم دائرہ سا بنا کر نیچے فرش پر بیٹھ گئے۔ پروفیسر صاحب نے ہر ایک کے کوائف پوچھے۔ پھر فرمایا:

> تمہارے لاہور میں آنے کا مقصد مجھے مہر نور محمد صاحب نے خط کے ذریعے بتا دیا ہے اور میں نے اس عظیم ہستی سے بات بھی کر لی ہے جس سے تم ملنا چاہتے ہو۔ کل سہ پہر کے پانچ بجے تم انھیں اپنا منتظر پاؤ گے۔ محمد بخش تمہیں ان کی کوٹھی پر چھوڑ آئے گا اور پھر واپس بھی لے آئے گا۔ لاہور کی سیر کرنا چاہو تو بھی محمد بخش تمہارے ساتھ رہے گا۔ کھانا یہیں گھر پر ہی کھاؤ گے۔ علامہ کے ہاں جا کر کوئی ایسی حرکت نہیں کرنی جو اُن کے اور خود تمہارے وقار کے منافی ہو یا ہماری علاقائی روایات کے خلاف ہو۔

جولائی کا پہلا عشرہ تھا۔ تاریخ یاد نہیں رہی۔ دن پیر کا تھا۔ برسات کا آغاز ہو چکا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ دوپہر کی بوندا باندی سے ہوا میں خوشگوار خنکی آ گئی تھی۔ ہم نے کلف لگے سفید اُجلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ شلوار، قمیض، کمری کوٹ، کالے بوٹ اور سر پر ترکی ٹوپی جو بہاولپور کی پہچان تھی۔

لاہور کی فلک بوس عمارتیں بارش سے دُھل کر نکھری ہوئی تھیں لیکن تانگے میں بیٹھے ہوئے ہم میں سے کسی کی نگاہ ان پر نہیں پڑ رہی تھی۔ سب تصورات میں گم تھے۔ کہاں وہ عقل و دانش کا مہر نیم روز [دوپہر کا سورج

جو اپنی پوری آب و تاب دیتا ہے] اور کہاں ہم علم و ادب کی موم بتیاں جو اپنی ہی لَو سے پگھلنے لگ جاتی ہیں۔ ہمارے ذہن میں علامہ کے مختلف انداز کی کئی تصویریں محفوظ تھیں۔ خدا معلوم آج ہم انھیں کس رنگ میں دیکھیں گے۔ دیکھ بھی سکیں گے یا نہیں کیونکہ ہم سب پر ایک ہیبت چھائی ہوئی تھی۔ دل میں ہزاروں خیالات کا ہجوم تھا لیکن زبانیں خاموش تھیں۔ تاہم ایک انجانی سی مسرّت بار بار ہمارے شعور اور اشتیاق کو جرأت کا احساس دلا رہی تھی۔ تانگہ ایک کوٹھی کے سامنے رُک گیا۔ پھاٹک آدھا کھلا تھا۔ محمد بخش نے کہا: "اندر چلے جائیں۔ میں آدھے گھنٹے تک آ جاؤں گا"۔ پھر ذرا مسکرایا اور چل دیا۔ جیسے کہہ رہا ہو:

آئینِ جوانمرداں، حق گوئی و بے باکی

[کلیات اردو، ص 386]

ہم پھاٹک کے اندر چلے گئے۔ ایک ملازم (غالباً علی بخش) ہمیں ایک کمرے میں بٹھا کر چلا گیا۔ ابھی ہم ماحول کی سادگی اور بے تکلفی کا جائزہ ہی لے رہے تھے کہ ایک وزن دار آواز نے ہمیں چونکا دیا:

السلام علیکم نوجوانو!

ہم سب احتراماً کھڑے ہو گئے۔ عالم اسلام کا بہت بڑا مفکر، فلسفۂ خودی کا خالق و مفسّر اور مابعد الطبیعیاتی مسائل کو نئے انداز سے پیش کرنے والا عظیم مدبّر نہایت شگفتہ انداز میں ہم سے مخاطب تھا۔

غلام مرتضٰی محمود کو ہم نے اپنا لیڈر منتخب کیا تھا۔ اس نے اپنا اور باری باری ہم سب کا تعارف کرایا۔ تعارف کے دوران شانِ سکندری والے مردِ قلندر ہر ایک سے پُرتپاک مصافحہ کرتے اور مشفق دوست کی طرح ذاتی سوالات پوچھتے رہے۔ ایک چٹکلا بھی چھوڑا کہ لتہ اور لاہور میں معنوی اشتراک

ہے۔ دونوں شہر کہتے ہیں جو کچھ تمہارے پاس ہے لے کر آ جاؤ۔اس پر ہلکا سا قہقہہ پڑا تو میں نے حوصلہ پکڑتے ہوئے کہہ دیا:

جناب والا! لیہ کو تو اہلِ لاہور کا قبلہ ہونا چاہیے کیونکہ یہ لاہور کے عین مغرب میں واقع ہے۔

میرے اس جملے پر بہت خوش ہوئے تاہم فرمایا:

ہر مغرب کو قبلہ نہ بنا لینا بیٹا! جس شعر کی تشریح کے لیے تم لوگ اتنی دُور سے میرے پاس آئے ہو، وہ بھی مغربی فکر کا نتیجہ ہے۔ہاں تو کیا ہے وہ شعر، ذرا تم ہی دہرا دو۔

اس اثنا میں اقبال پلنگ پر گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھ چکے تھے۔ہم نے کرسیاں ذرا قریب کر لیں۔ ہیبت اور احترام کے ملے جلے ابتدائی تاثرات میں پہلی سی شدّت نہیں رہی تھی اور ہمارے تصوّرات پر جو خوف سا چھایا ہوا تھا وہ اس تیقّن سے بدل چکا تھا کہ ہم یہاں سے اطمینانِ قلب کی دولت سے مالا مال ہو کر جائیں گے۔

میں نے قدرے دھیمے لہجے میں چکبست کا مذکورہ شعر پڑھ دیا اور ساتھ ہی گزارش کی کہ:

اس کے معنے تو صاف ہیں لیکن اس میں جو بات کہی گئی ہے ہمارا دل اسے نہیں مانتا۔ ہم جنابِ والا سے یہ وضاحت چاہتے ہیں کہ کیا زندگی اور موت واقعی اتفاقی حادثات ہیں یا ان کے پیچھے کوئی مقصد کارفرما ہے۔اگر مقصد ہے تو پھر یہ اتفاقیہ نہیں ہو سکتے۔ نیز اس مقصد کو تکمیل کی طرف آگے بڑھانے کے لیے کوئی بہت بڑا سرچشمۂ عقل و بصیرت بھی ہوگا۔

میرا جملہ ختم ہوتے ہی میرے ساتھی عبدالصمد واحد بولے:

جنابِ عالی! ہمیں محسوس ہوا ہے کہ اس شعر میں زندگی کو محض عناصر کی ترتیب کا نتیجہ کہہ کر زندگی کی توہین کی گئی ہے۔

تیسرے ساتھی شیخ غلام محمد نے فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا:

حالانکہ ہمارے نزدیک زندگی، سب سے زیادہ قیمتی اور سب سے حسین عطیہ ہے۔

علامہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھل رہی تھی۔ انھوں نے بڑے مشفقانہ انداز سے ہمارے چوتھے ساتھی غلام مرتضٰی محمود کی طرف دیکھا۔ وہ بولے:

جنابِ والا! آپ کا ارشاد ہے:

رہی زندگی موت کی گھات میں

[کلیات اردو، ص 455]

لیکن ہمارا مشاہدہ اس کے برعکس ہے اور چکبست کے اس شعر سے بھی یہی تاثر ملتا ہے کہ موت فاتح اور زندگی مفتوح ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ فکر اور مشاہدے کے اس تضاد کو بھی واضح کیا جائے۔

شاعرِ مشرق لمحے بھر کے لیے خاموش ہو گئے جیسے کسی سوچ میں ڈوب گئے ہوں۔ پھر ایک تیز، پار اترتی ہوئی نظر ہم سب کے پُرسکون چہروں پر ڈالی اور استفسار کیا:

آپ میں سے کوئی سائنس کا سٹوڈنٹ بھی ہے؟

غلام مرتضٰی محمود نے جواب دیا:

نہیں جناب اس وقت تو نہیں البتہ میٹرک میں ہم سب نے سائنس پڑھی تھی۔

فرمایا: ''خیر کوئی بات نہیں۔''

پھر قدرے توقف کے بعد اپنا ہی ایک شعر بلند آواز میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھا:

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

[کلیات اردو، ص 260]

اور ہمارے ذہنوں میں وہ تمام افکار سمٹ کر ابھر آئے جن کا اظہار آپ 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' کے عنوان کے تحت بانگِ درا میں کر چکے تھے۔ پھر فرمایا:

زندگی ایک حسین عطیہ ہی نہیں، میرے نوجوان دوستو! بلکہ ایک گراں بہا نعمت بھی ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے یہ وہ گوہریک دانہ ہے جو قطع و برید اور شکست و ریخت کے لیے تخلیق نہیں کیا گیا۔ شکست و ریخت مادی اشیاء میں ہوتی ہے کیونکہ یہ مادی عناصر سے ترکیب پاتی ہیں۔ انسانی جسم بلاشبہ عناصر ہی کی ترکیب و ترتیب سے ظہور پذیر ہوا ہے جو ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں۔ جسم کے ختم ہو جانے سے آدمی ختم نہیں ہو جاتا جو اس کا مالک و مختار ہے۔ سائنس کی تحقیق کے مطابق ہمارا جسم لاکھوں کروڑوں خلیوں سے مرکب ہے جو ہر لمحے ٹوٹتے اور پھر بنتے رہتے ہیں۔ یعنی جو خلیہ ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو جاتا ہے اس کی جگہ بالکل ویسا ہی ایک اور نیا خلیہ وجود میں آ جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سات سے دس سال کے عرصے کے دوران انسانی جسم کے سابقہ تمام خلیے ختم ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے خلیے وجود میں آ جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو، میرے عزیزو! کہ نیا جسم بال برابر بھی وہ نہیں ہوتا جو آٹھ دس سال پہلے تھا۔ پس اگر ہم عناصر کے ظہورِ ترتیب کو زندگی یا زندگی کو مشہود کرنے والا شخص قرار دے دیں تو تخریب و تعمیر کے اس عمل کے تحت وہ شخص ہی کالعدم ہو چکا ہوگا جس نے آپ کے ساتھ کوئی معاملاتی یا کاروباری معاہدے کر رکھے تھے۔ پھر تو دنیا کی کوئی عدالت کسی کو ان معاہدوں کی پابندی پر مجبور نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اس مفروضے کی رُو سے وہ شخص اور تھا جس سے آپ نے معاہدہ کیا تھا اور یہ شخص اور ہے جس سے آپ معاہدے کی پابندی کرانا چاہتے ہیں۔ قول، اقرار، معاہدے، سچ، جھوٹ، دیانتداری، مکر و فریب وغیرہ کی مثبت اور منفی صفات کا تعلق عناصر کے مجموعے یعنی جسم سے نہیں ہے اس شخص سے

ہے جو جسم کی ہر تبدیلی کے باوجود قائم اور برقرار رہتا ہے۔

عبدالصمد واجد نے عرض کی:

جنابِ والا! جدید تصورات کسی مستقل یا قائم الدائم وجود کے قائل نہیں ہیں بلکہ جنابِ والا کا بھی ارشاد ہے کہ

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

[کلیات اردو، ص 173]

ہمارے دیکھنے میں بھی کوئی ایسی چیز نہیں آئی جو تغیر ناآشنا ہو۔

شاعرِ مشرق کی آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی۔ پہلے سے بھی زیادہ قوی لہجے میں فرمایا:

عزیز من! ہم مادی دنیا میں رہتے ہیں۔ مادی دنیا کی چیزیں حواسِ خمسہ کے ذریعے ادراک میں آ سکتی ہیں لیکن بعض حقیقتیں ایسی بھی ہیں جن کا ادراک بصارت کی بجائے بصیرت سے ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ نے 'زندہ' چیزیں تو دیکھی ہیں لیکن کیا آپ نے یا چکبست نے کہیں 'زندگی' کو بھی دیکھا ہے؟ آپ نے انسانوں کو تو ہر جگہ دیکھا ہے کہیں 'ہیومینیٹی' [انسانیت] بھی آپ کو دکھائی دی ہے حالانکہ انسان آتے جاتے رہتے ہیں اور اتے جاتے رہیں گے لکن 'ہیومینٹی' جو ایک تجریدی تصور ہے، پائیدار ہے۔ اسی طرح زندہ چیزیں تغیر میں رہیں گی لیکن ''زندگی'' جو ایک تجریدی حقیقت ہے، دوامی ہے اور سیلِ رواں کی طرح آگے ہی آگے بڑھتی ہے۔ بصارت کی بجائے بصیرت کے ذریعے ادراک میں آنے والی حقیقتوں کو سمجھنے کے لیے علم ریاضی کی مبادیات پر غور کرو۔ مادی اشیاء تمام کی تمام لمبائی، چوڑائی اور اونچائی یا گہرائی کی محتاج ہیں لیکن ان تینوں ابعاد کا تصور 'نقطے' پر قائم ہے جس کی اپنی نہ لمبائی ہے نہ چوڑائی ہے اور نہ اونچائی وغیرہ۔ یعنی جو بصارت کے نزدیک عدم ہے لیکن بصیرت جسے عین حقیقت اور لازمی وجود سمجھتی ہے۔

عزیزو! یہ وہ حقیقتیں ہیں جو حواس کی رسائی اور گرفت سے باہر ہیں۔ ان کا

ادراک صرف ایمانِ کامل ہی کر سکتا ہے جو بصیرت کی آخری ارتقائی صورت ہے۔ یاد رکھو، مقرون کو پیچھے چھوڑ کر تجرید کی طرف آگے بڑھتے رہنا علم کی معراج ہے۔

میں آج چھپّن سال کے بعد اس ملاقات کی رپورٹنگ [بیان] کر رہا ہوں لیکن مجھے حافظے پر ذرا بھی زور دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی بلکہ ان تاریخی لمحات کا سارا نقشہ اس وقت بھی آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا اندازِ بیان صداقت اور خلوص پر مبنی ہونے کے باعث اتنا پُر تاثیر تھا کہ ان کی ارشاد کردہ ہر بات دل میں اترتی چلی جاتی تھی۔ ممدوح سے عقیدت خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہو اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ بعینہٖ کسی کو بھی یاد نہیں رہتے۔ انسانی فطرت معانی و مفاہیم کو یاد رکھتی ہے الفاظ کو بھلا دیتی ہے۔ میں یہ باتیں بھی اپنے الفاظ میں لکھ رہا ہوں تاہم ان کے مفاہیم سے سر مُو بھی نہیں ہٹ رہا۔

علامہ کی تقریر تجرید کی اہمیت پر ختم ہوئی تو شیخ غلام محمد بولے:

جنابِ والا! ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں کہ آپ نے اپنے نہایت قیمتی وقت میں سے چند لمحات ہم طلبہ کے لیے وقف فرمائے اور اپنے نورِ بصیرت سے ہمارے ذہنوں کو منور کر دیا۔ تاہم انسانی زندگی کے مقصد کے بارے میں بھی کچھ ارشاد ہو جائے تو عنایت ہوگی۔

اسی لمحے ملازم دوسری بار ٹھنڈے مشروبات کے گلاس لیے کمرے میں داخل ہوا۔ علامہ نے ارشاد فرمایا:

بیٹو، ایک مقصد تو یہی ہے کہ پیو اور پلاؤ۔

اس پر پھر ایک بار ہلکا سا قہقہہ پڑا اور ہم ادب آداب کو بلائے طاق رکھ کر حریصوں کی طرح مشروبات کی طرف لپکے۔

چند لمحات کے بعد پھر خاموشی چھا گئی تو فرمایا:

زندگی...ارتقا کی مختلف منازل طے کر کے جب موجودہ سطح پر پہنچی تو اسے

'انسانی ذات' کا راہرو عطا کر دیا گیا لیکن یہ راہرو ناپختہ ہے۔اس کے سفر کو آسان بنانے کے لیے اسے کچھ صلاحیتیں بھی دی گئیں مثلاً علم، تفہیم، احساس اور ارادہ وغیرہ۔انسانی ذات کے اندر دونوں امکانات ہیں۔اپنی 'ذات' یعنی خودی کو مستحکم کرنے کے بھی اور اسے توڑ پھوڑ دینے کے بھی۔اس نے اپنے آپ کو مستحکم بنا لیا تو یہ 'زندگی' کی شاہراہ پر آگے بڑھنے کے قابل ہو سکے گی۔اگر انتشار کا شکار ہو گئی تو آئندہ کی اعلیٰ منازل طے نہ کر سکے گی۔ اسے یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ کون سے عوامل اسے مضبوط اور توانا بناتے ہیں اور کن عوامل سے یہ ضعیف اور ناتواں ہو جاتی ہے۔پس انسانی زندگی کا مقصد 'خودی' کو استحکام دینے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔انسانی جسم ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے، انھیں آزمانے اور انھیں ترقی دینے کا ذریعہ ہے۔یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح کسی کھلاڑی کو اپنی مضمر صلاحیتیں ابھارنے کے لیے کھیل کے میدان اور ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے۔

وقت ایک گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا۔باتیں بھی بڑی دقیق ہوئی تھیں لیکن ہم میں سے کسی کے چہرے پر تھکن کے آثار نہیں تھے۔رخصت ہونے کو جی نہیں چاہتا تھا۔اس نابغۂ روزگار ہستی سے چند لمحات کا براہِ راست استفادہ ہی ہمارے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ہم نے اطمینانِ قلب کی دولت حاصل کر لی تھی۔ہم کتنے خوش قسمت تھے کہ اتنی قد آور شخصیت کے تبحّرِ علمی سے فیضیاب ہو سکے۔

ہم نے شکریہ ادا کر کے رخصت لی۔در و دیوار سے صدائے خاموش آ رہی تھی:

دگر دانائے راز آید کہ ناید؟[2]

---

[2] ترجمہ:

پھر کبھی محرم راز آئے نہ آئے کوئی

[صدیقی، ص ۹۳]

[کلیات فارسی، ص ۷۷۵]

۲۱

اقبال— چند یادیں*٭

ائین اسٹیفنز[1] (مترجم سعید اختر درانی)

---

* سہ ماہی اقبال، جلد ۴۲ شمارہ ۲، لاہور، بزم اقبال، اپریل ۱۹۹۵ء۔

٭ یہ مضمون، جو اس کے مصنف جناب ائین اسٹیفنز نے مجھے یعنی مترجم کو ان الفاظ کے ساتھ بھیجا تھا: " یہ اس خطاب کی ذرا سی مختلف ہیئت ہے جو اقبال کے صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر کیمبرج میں ۱۹ر نومبر ۱۹۷۷ء پاکستان ایسوسی ایشن اور فیکلٹی آف اورینٹل اسٹڈیز کے ایک مشترکہ اجلاس میں پڑھا گیا۔"اسے میں نے انجمن ترقی اردو برمنگھم کے مجلہ اردو کے نخستیں [پہلے] شمارے میں شائع کیا تھا جو میری زیر ادارت دسمبر ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا تھا۔اس مضمون اور اس کے مصنف کا تعارف میں نے وہاں ان الفاظ میں کیا تھا:

> ائین اسٹیفنز صاحب پاکستان سے متعلق کئی ایک قابل ذکر کتابوں کے مصنف ہیں۔ وہ دی اسٹیٹسمین آف انڈیا کے مدیر اعلیٰ بھی رہ چکے ہیں اور کنگز کالج کیمبرج کے فیلو بھی۔ وہ یادیں جن پر یہ مضمون منحصر ہے، مصنف کے ذہن میں اس وقت جاگیں جب راقم الحروف (درانی) نے تابستان ۱۹۷۶ء میں دوران گفتگو ان سے سوال کیا تھا کہ آیا کبھی ان کی اقبال سے ملاقات ہوئی تھی اور پھر ان پر زور دیا تھا کہ عنقریب آنے والے صد سالہ جشن ولادت کے پیش نظر وہ اقبال سے متعلق اپنی یادداشتیں حیطہ تحریر میں لے آئیں۔

1 جناب ائین اسٹیفنز (۱۹۰۳ـ۱۹۸۴ء) سے پہلی بار کیمبرج میں اپنے زمانہ طالب علمی میں ملا تھا)جس کو اب قریب چالیس سال ہونے کو ہیں۔(انھی دنوں ان کی مشہور کتاب ہارنڈ مون[پہلی کا چاند] چھپی تھی، جس میں انھوں نے بہ تفصیل پنڈت نہرو کے ساتھ اپنی چپقلش کا حال بیان کیا تھا۔یعنی جب بحیثیت مدیر اعلیٰ سٹیٹسمین آف انڈیا جو ایک انگریز کمپنی کی ملکیت تھا، انھوں نے مسئلہ کشمیر پر متوازن ایڈیٹوریل [اداریے] لکھنے شروع کیے، جن میں پاکستان کے حقوق اور پالیسیوں کی کما حقہٗ پاسداری بھی کی گئی تھی تو پنڈت جی اس بات پر برہم ہوئے۔انھوں نے کہا کہ ایک اخبار جو بھارت میں چھپتا ہے پاکستان کی اس قدر حمایت کرنے کی جرات کیسے کر سکتا ہے؟ اسے ہندوستان کے نقطہ نظر کا پرچار کرنا چاہیے۔اس پر اسٹیفنز صاحب نے بربنائے اصول اخبار کی ادارت سے استعفیٰ دے دیا اور ہندوستان کو خیر باد کہہ کر کیمبرج میں اپنے پرانے کالج کنگز کی فیلو شپ [رکنیت] پر فائز ہو گئے۔ وہ ہماری انجمن دانش جویان پاکستان کیمبرج (پاکستان سٹوڈنٹس سوسائٹی کیمبرج یونیورسٹی) کے اکثر مہمان ہوا کرتے تھے اور اپنی کھینچی ہوئی خوبصورت تصاویر (سلائیڈز) کی مدد سے

میں اس مضمون کے بارے میں ہرگزیہ دعویٰ نہیں کروں گا کہ یہ کسی بڑی علمی حیثیت کا حامل ہے۔ یہ محض ایک ہلکی پھلکی سی ذاتی جھلک ہے جو ایک عظیم الشان قوم ساز موضوع کا تعارف کرتی ہے۔ میں اب بڈھا ہو چکا ہوں۔ مگر جب میں نوجوان تھا تو میں جنوبی ایشیا کی کئی ایسی ہستیوں سے ملا، جو بعد ازاں بہت شہرت مند ہو گئیں۔ ان لوگوں نے دوسری عالمی جنگ کے بعد اس خطے کے حالات کی تشکیل میں بڑے اہم اور مرکزی کردار ادا کیے۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جن کی سیاسی سوجھ بوجھ اور سوچ بچار کے بغیر ایک عظیم قوم و ملک جو تیس سال تک اپنی آزادی کی نگہداشت کرتا آیا ہے، اور جس کی ساخت و سامان آج بھی ایک عجوبہ ہے، شاید کبھی معرض وجود میں نہ آ سکتا۔

سال گذشتہ (۱۹۷۶ء) کے ماہ دسمبر میں مجھے دعوت دی گئی تھی کہ پہلے میں لندن اور پھر اسلام آباد میں پاکستان کے انسانی خالق اور قائد، مسٹر جناح کے بارے میں اپنی یادیں جگاؤں، جن کا صد سالہ جشن ولادت اس وقت

دلچسپ لیکچر دیا کرتے تھے۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں صدر ایوب خان کی دعوت پر وہ ایک دو سال تک پاکستان میں رہے اور عسکری و تاریخی موضوعات پر ریسرچ کرتے رہے۔ بعد ازاں انھوں نے پنگوین بکس کے لیے اپنی مشہور کتاب معنونہ پاکستان لکھی اور دی پاکستان کے نام سے ایک کتابچہ بھی۔ ۱۹۷۶ء میں جب اپنے قدیم کالج کیز میں فزکس کی ایک کتاب تصنیف کرنے کے لیے ٹھہرا ہوا تھا تو دوبارہ اسٹیفنز صاحب سے تجدید ملاقات ہوئی اور دراصل میری اقبالیات کی تحقیق کے ایک بڑے محرک وہی تھے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے میری کتاب اقبال یورپ میں) انھی کے اصرار پر میں نے علامہ کی تاریخ ولادت کے تعین کا بیڑا اٹھایا۔ پھر میں نے ان کے ساتھ مل کر ڈان کراچی میں ایک خط شائع کیا اور جناب ذوالفقار علی بھٹو، وزیر اعظم پاکستان کو یہ تجویز پیش کی کہ اقبال کے صد سالہ جشن ولادت کی تقریب سے کیمبرج یونیورسٹی میں ایک مسند اقبال بنام اقبال چیئر آف اسلامک سٹڈیز [مسند اقبال برائے اسلامی مطالعات] قائم ہونی چاہیے، جس پر کسی بھی قوم و مذہب کے اقبال سکالر [عالم] کا تقرر ہو سکتا ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں اس کی بجائے ایک اقبال وزٹینگ فیلوشپ قائم ہوئی، جو اب تک موجود ہے۔ اگرچہ اس پر سال بہ سال خرچ جاریہ حکومت پاکستان پر عائد ہوتا رہتا ہے، بجائے ایک ہی مرتبہ یکمشت عطیے کے، جس کے بعد ایک ہزار سال یا اس سے زیادہ دیر تک بلا کسی مزید خرچ کے یہ مسند قائم رہ سکتی تھی۔

منایا جا رہا تھا۔ واقعی میں ان سے کئی مرتبہ ذاتی طور پر بھی ملا تھا اوران کا دور سے دیدار بھی کیا تھا اور یہ واقعات مدت گزری ۱۹۳۱ء میں شروع ہوئے اور موسم بہار ۱۹۴۸ء تک انجام پذیر نہ ہوئے، یعنی ان کی وفات سے چند ہی ماہ پیشتر۔ اس کے برعکس، پاکستان کے فلسفی شاعر ڈاکٹر اقبال کے بارے میں کوئی طویل و عریض دعوے نہیں کر سکتا۔ اگرچہ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اقبال تصور پاکستان کے ساتھ مسٹر جناح سے پیش تر وابستہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ میں کافی پس و پیش کے بعد اس بات پر رضا مند ہوا ہوں کہ پہلے لندن میں، اور اب یہاں (یعنی کیمبرج میں) اقبال کے بارے میں گفتگو کروں۔

آج میں چند ایسے موضوعات کو چھوؤں گا جو شاید کیمبرج کے سامعین کے لیے زیادہ باعث دلچسپی ہوں، بہ نسبت لندن کے، کیونکہ یہی وہ شہر ہے جہاں، مدت ہوئی اقبال نے ٹرنٹی کالج کے ریسرچ اسٹوڈنٹ [تلمیذ تحقیق] کی حیثیت سے اپنی فلسفیانہ تعلیم کا آغاز کیا تھا اور مت بھولیے کہ یہی وہ شہر ہے کہ جہاں مسٹر جناح سے کافی پہلے ایک ریسرچ اسٹوڈنٹ مقیم تھا، یعنی چودھری رحمت علی، جس نے "پاکستان" کا لفظ اختراع کیا تھا۔[2] اور جس

---

[2] میں نے ۱۹۶۷ء کے قیام کیمبرج کے دوران چودھری رحمت علی کے پرانے عمانویل کالج کی لائبریری میں ان کی چار کامن پلیس بکس (ذاتی ڈائریوں) کا کھوج لگایا، جن میں اس نوجوان طالب علم نے لفظ "پاکستان" کے اختراع کا پورا ارتقا دکھایا تھا۔ جس کے پہلے ہجے Pakstan یعنی درمیان کی i کے بغیر۔ اس کے بعد میں دیکھا ایک روز وہ لکھتے ہیں کہ اس (خیالی) ملک کے باشندوں کو کس نام سے پکارنا چاہیے؟ اور اس کا جواب دیتے ہیں Pakistanese (بانداز Japanese)۔ اس سے اگلے روز لکھتے ہیں: نہیں، انھیں Pakistanian کہنا چاہیے۔ چند روز بعد وہ انھیں Pakistani پکارتے ہیں اور پھر بعد میں اعلان کرتے ہیں کہ نہیں، ان کا صحیح لقب The Paks ہونا چاہیے۔ (اس کے علاوہ وہ اس متصورہ ملک کے ہندوستان کے ساتھ روابط کے بارے میں بھی اظہار خیال رکھتے ہیں۔) میرے اصرار پر اب یہ ڈائریاں عمانویل کالج نے کنجی تالے کے ماتحت ایک محفوظ جگہ پر رکھ دی ہیں۔
۱۹۵۰ء کے عشرے میں جب میں کیمبرج پہنچا تو چودھری صاحب کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا، اوران کے

کے اجڑے اور نظر انداز مدفن[3] کی تلاش کے لیے آج سے دو عشرے پہلے میرا ایک دوست 'سعید درانی' جو اس وقت ایک انڈر گریجویٹ [بی اے کا طالب علم] تھا[4]، مجھے لے کر نکلا۔ یہ لحد یہاں کے وحشت ناک شہری قبرستان میں واقع ہے، جہاں پہنچنے کے لیے ہمیں نیو مارکیٹ روڈ کے بعض بڑے ہی گندے علاقوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

رحمت علی ہی کی طرح، مگر جناح کے برعکس، اقبال نے اس وقت وفات پائی جب وہ خاصے جوان تھے، اور یہ بھی ایک وجہ ہے کہ میں ان سے محض ایک مرتبہ ملا ہوں۔ تاہم، میں جن امور کا آج ذکر کروں گا، وہ صرف

ایک مصری دوست ڈاکٹر محمد عزت ابوہندیہ صاحب ان کے بارے میں ہمیں دلچسپ باتیں بتایا کرتے تھے، بلکہ ایک مرتبہ مقامی اخبار کیمبرج ڈیلی نیوز میں میں اپنی انجمن دانش جویاں کا اشتہار دینے گیا تو وہاں کے ایک کارکن نے جن کا نام جہاں تک مجھے یاد ہے جناب ڈی ڈبلیو فوکس تھا، مجھے بتایا کہ کیسے یہ بڑا محتاط اور مین میخ نکالنے والا [میٹکوسن] نوجوان اس اخبار کے دفتر میں آیا کرتا تھا اور ہندوستان میں اپنے مجوزہ ممالک (یعنی DINIA ڈاینا کے اجزا) "صدیقستان" اور "موپلستان" اور "عثمانستان" (حیدرآباد دکن) اور "بانگستان" (موجودہ بنگلہ دیش) کے نقشوں میں، جو وہ اس اخبار کے دفتر سے چھپوایا کرتا تھا، ذرا ذرا سے ردوبدل کرتا رہتا تھا، یعنی یہ لکیر ذرا سی ٹیڑھی کر کے یہاں لگا دیجیے اور وہ سرحد ذرایوں ترچھی کر کے لگایئے وغیرہ وغیرہ۔ میرے زمانہ طالب علمی میں ہم اپنی انجمن کی طرف سے چودھری رحمت علی کی گمنام اور خستہ سی قبر پر یوم پاکستان (۲۳ مارچ) کی تقریب پر پھول چڑھایا کرتے تھے۔ چودھری صاحب کے بارے میں ایک مفصل مضمون کے لیے میرے پاس بہت سا مواد جمع ہے۔ میرے ناچیز خیال میں ان کی شخصیت میں عظیم خوبیاں اور خامیاں پہلو بہ پہلو مجتمع تھیں۔ مگر ان چیزوں کی تفصیل میں کسی اور موقع پہ اٹھا رکھتا ہوں:
فرصت کشاکش غم دوراں سے گر ملی۔

[3] چند سال ہوئے چودھری رحمت علی کے پاکستانی لواحقین نے ان کی قبر پر، جس کا نمبر ۸۳۳۰/بی ہے، سنگ مرمر کا ایک عمدہ چبوترا بنا دیا ہے، (اگرچہ، جہاں تک مجھے یاد ہے، چودھری صاحب کی وہاں درج کردہ تاریخ وفات میں ذرا سی غلطی ہے۔ ان کی صحیح تاریخ وفات ۳ ؍فروری ۱۹۵۱ء ہے۔) اب ادھر کچھ عرصے سے کیمبرج میں ہر سال چودھری صاحب کے ماہ وفات (یعنی فروری) میں ان کے اعزاز میں ایک بڑا جلسہ ہوتا ہے اور ملک کے کونے کونے سے پاکستانی ان کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے جمع ہوتے ہیں۔

[4] میں ان دنوں دراصل "انڈر گریجویٹ" نہیں تھا، بلکہ نیوکلیر فزکس میں پی ایچ ڈی کے لیے کام کر رہا تھا۔

ایک شام کی خوش باشیوں کے واقعات پر مبنی ہیں جو دہلی میں گزری۔ مجھے اس کی تاریخ بھی اب اچھی طرح یاد نہیں۔ اگرچہ میرا حافظہ خاصے زور سے نومبر ۱۹۳۲ء کی طرف اشارہ کرتا ہے.... اور دراصل مجھے ان کی (یعنی اقبال کی) شکل و شباہت بھی کچھ اچھی طرح یاد نہیں، جس کے برعکس مجھے جناح صاحب کا حلیہ بہت اچھی طرح یاد ہے (جیسا کہ میں نے گذشتہ برس ان کے صد سالہ جشن ولادت کے دوران بیان کیا تھا) مگر اس بات سے تو سب اتفاق کریں گے کہ مسٹر جناح ایک غیر معمولی شخصیت تھے۔ دیکھنے میں بھی، اور سیاسی لحاظ سے بھی۔ بلکہ زیادہ نفیس اور صحیح الفاظ یہ ہوں گے کہ وہ ایک تخلیقی فرماں روائے مملکت تھے۔ بہر صورت، اقبال، جنھوں نے امور مملکت پر اثر تو ضرور ڈالا لیکن انھیں بدست خود ڈھالا نہیں، جہاں تک مجھے یاد ہے ایک عام سا چہرہ مہرہ رکھتے تھے۔ یعنی ایک ایسا شخص کہ پہلی نظر کے بعد آپ اس کی طرف دوسری نظر نہ ڈالیں گے، جب کہ مسٹر جناح کو پہلی نظر میں دیکھتے ہی آپ ٹھٹک جائیں گے۔ کم از کم میں ضرور ٹھٹک گیا تھا۔

اقبال نہ خاص طور سے دبلے پتلے تھے، نہ بلند و بالا۔ ان کے بال کچھ سفیدی مائل ہو رہے تھے اور ان کی مونچھیں کچھ ڈھلک رہی تھیں۔ ان کے سر کے بالوں میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جیسی کہ جناح کے بالوں میں وہ چونکا دینے والی سفید لٹ جو فوراً دیکھنے والے کو ان کی بلند پیشانی کی جانب متوجہ کرتی تھی۔ درحقیقت اقبال میں کوئی بھی خاص قابل توجہ بات نظر نہ آتی تھی، سوائے اس کے کہ جونہی کوئی بات انھیں خوش کرتی ایک بڑی دلکش مسکراہٹ یکایک ان کے چہرے پر کھل اٹھتی۔ طور طریقے میں وہ ذرا محتاط نظر آتے یا کچھ لیے دیئے سے رہتے۔

اب سنیے میری داستان، جیسی بری بھلی بھی وہ ہے اور یہ داستان بہ لحاظ

زمان پیچھے کی طرف دوڑے گی اور بہ لحاظ مکان پہلوؤں کی جانب۔ یعنی اس صدی کے تیسرے عشرے کے آغاز کی دلی سے لے کر اس سے بہت مدت پہلے کے کیمبرج کی طرف۔

مارچ ۱۹۳۰ء میں جب ستائیس برس کا ایک کندہ نا تراش تھا، میں برعظیم میں وارد ہوا، اور مجھے بڑا تعجب ہوا کہ وہاں پہنچتے ہی مجھے اسلام کے ساتھ ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ اس کا سبب یہ امر تھا کہ سولہ سال کی عمر میں مَیں نے عیسائیت کو کچھ ایسی وجوہات کی بنا پر خیر باد کہہ دی تھی جو دہلی آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ایک طرح سے اسلامی تھیں۔ میری آفتاد طبع مذہبی ہے، اور اگر میں ایک پشت پہلے پیدا ہوتا تو ممکن ہے کہ میں بالآخر ایک عیسائی انگلیکن [کلیسائے انگلستان] ڈین [کلیسائی حلقے کا منتظم] یا بشپ(اُسقف) کے درجے پر پہنچ جاتا۔ لیکن مدرسے کے زمانہ تعلیم ہی کے دوران وہ ایک کراہت سی جو میرے دل میں بیٹھ گئی تھی، یہ تسلیم کرنے سے متعلق کہ خدا تعالیٰ نے ایک ''اکلوتے بیٹے کو جنم دیا تھا'' اس نے مجھے ایسے پیشے (عیسائی پادری بننے) سے بچا لیا۔[5] اس کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ میرے بہت سے ہم عمر ساتھی اور میں اس خلیج کو کبھی نہ پاٹ سکے جو مروجہ عیسائی اعتقادات، تخلیق کائنات اور ڈارون کے مسئلہ ارتقائے حیات کے درمیان پھیلی ہوئی تھی۔

چنانچہ ایک تو میرا یہ غیر عیسائیانہ نقطہ نظر اور پھر ایشیا میں ایک نووارد کی حیثیت سے وہاں کے نامانوس طرز تعمیر کی میرے لیے دلربائی، ان سب

---

[5] ائین اسٹیفنز صاحب پر اسلام کا اثر اس قدر غالب آ چکا تھا کہ میں نے خود انھیں کئی مرتبہ اپنے مکان ۱۴۹ ہیری فورڈ سٹریٹ میں جائے نماز کے اوپر نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ (اگرچہ میرا خیال نہیں کہ انھوں نے باقاعدہ اسلام کبھی قبول کیا۔ برسر تذکرہ درج کرتاہوں کہ وہ تمام عمر غیر شادی شدہ رہے۔)

چیزوں کا اثر یہ ہوا کہ جلد ہی میں نے دلی کی تاریخی عمارتوں میں جانا شروع کر دیا۔ شام کے وقت میں اکثر اس حسین و جمیل اور تنہائی میں کھوئی ہوئی چھوٹی سی مسجد میں چلا جاتا جو پرانے قلعے کے اندر گرد و نواح کے مناظر سے بڑی بلندی پر آشیاں پرداز ہے۔ وہاں سے دور تک نظر آنے والا منظر اور تنہائی اور پھر اذان کی آواز یہ سب چیزیں مجھے مسحور کر دیتیں۔ میں کچھ عرصہ وہاں سے کچھ فاصلے پر واقع اس دوسرے مذہبی مقام میں بھی گھوما کرتا تھا جو بہت مشہور ہے، یعنی نظام الدین اولیاء کی خانقاہ۔ پھر جلد ہی خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس درگاہ کے موروثی گدی نشین خواجہ حسن نظامی کے ساتھ میری واقفیت ہو گئی۔ گو مجھے اب یہ تفصیل یاد نہیں کہ ایسا کیونکر ہوا۔ خواجہ صاحب کا یہ ایک خوشگوار دستور بھی تھا کہ دہلی کی سردیوں کے موسم میں وہ اپنے احباب کو اپنے مکان میں، جو ایک طرح سے اس مزار کا ایک حصہ ہی تھا، مشاعرے یا قوالی وغیرہ کے لیے بلا لیا کرتے تھے، جس کے بعد ان کے گھر میں جو درگاہ شریف سے ملحق تھا، کھانے کی دعوت ہوتی۔

تو جلد ہی خواجہ صاحب نے مجھے ایک ایسی ہی محفل میں مدعو کیا۔ میں اس محفل سے بڑا مسحور ہوا، اگرچہ زبان سے ناآشنا ہونے کے باعث اس شام جو کاروائی ہو رہی تھی اس کا بڑا حصہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ یہ دیکھ کر میں اس بزم سے کافی محظوظ ہوا ہوں، خواجہ صاحب نے باردیگر مجھے شمولیت کی دعوت دی۔ ان محفلوں کی یاد اب بھی میرے ذہن میں ترو تازہ ہے، اور میرا خیال ہے کہ میں اب بھی خواجہ صاحب کو کافی وضاحت کے ساتھ تصور میں لا سکتا ہوں۔ وہ ایک اکہرے بدن کے پستہ قد، ادھیڑ عمر کے آدمی تھے، جن کی اچکن کچھ خاص صاف ستھری نہ تھی۔ ان کی داڑھی چھدری سی تھی اور ان کے بال لمبے تھے، جو گندھی ہوئی لٹوں کی صورت میں تھے۔ ان کی نظر اچھی نہ تھی، اور وہ اپنی لوہے کی کمانی والی عینک کے اندر سے ، لوگوں کو مسکراتی

آنکھوں سے جھانکا کرتے تھے۔ وہ مجھے بڑے پسند آئے۔

دلّی میں میرے تیسرے سیزن [6] کے آغاز کی بات ہے کہ میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ خواجہ صاحب کا فون آیا (اور مجھے یاد ہے کہ اپنی حالیہ ترقی کے بعد میں سیکریٹریٹ [مرکزی دفتر حکومت] کے ایک پہلے سے بڑے کمرے میں جاگزین تھا، جو سورج والے جنوبی پہلو میں واقع تھا۔ اس بات کی مدد سے میں ان واقعات کی تاریخ ڈال سکتا ہوں، یعنی ۱۹۳۲ء کا موسم خزاں... میں اب بھی حافظے کی آنکھوں سے اپنے دفتر، اور اس میں رکھے ہوئے اپنے ڈیسک [لکھنے کا میز] کو دیکھ سکتا ہوں۔ کھڑکیاں، جن میں سے سورج کی کرنیں چھن چھن کر آ رہی تھیں، میرے دائیں ہاتھ پر تھیں ...) خواجہ صاحب نے (ٹیلی فون) پر پوچھا کہ کیا میں ان کی محفل میں، جو دو تین روز بعد منعقد ہونے والی تھی، آ سکوں گا یا نہیں؟ میں نے فوراً ہاں کر لی۔ اس کے کچھ دیر بعد انھوں نے دوبارہ فون کیا اور بتایا کہ اس شب علامہ اقبال بھی تشریف لائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ علامہ ابھی لاہور سے پہنچے ہیں اور [مرکزی] مجلس قانون ساز کے چند مسلمان ارکان ان سے ملنے کے مشتاق ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس رات کی محفل، جو مسلمانوں کا کچھ رسمی اور خاصا بڑا اجتماع ہوگا، اس میں مَیں ہی ایک تنہا برطانوی ہوں گا اور یوں اچھا خاصا نمایاں لگوں گا۔ انھوں نے کہا: تم بُرا تو نہ مانو گے؟ میں نے کہا: کوئی مضائقہ نہ ہوگا اور بلا سوچے میں نے یہ اضافہ بھی کر دیا کہ اگر باقی شرکائے محفل کی بے تکلفی کی خاطر میں اپنے ''ہندوستانی لباس'' میں آ جاؤں تو کیسا

---

[6] ان دنوں سٹیٹسمین آف انڈیا کا صدر دفتر کلکتے میں ہوتا تھا، اور ایک ذیلی دفتر دلی میں۔ چنانچہ اسٹیفنز صاحب غالباً سردیوں میں دلی میں بیٹھا کرتے تھے اور شاید سیزن سے ان کی یہی مراد ہے یا ہو سکتا ہے کہ ان کا مطلب تیسرے سال سے ہو۔

رہے گا؟ میں نے وضاحتاً یہ بھی کہا کہ میں وقتاً فوقتاً یہ کپڑے اس لیے پہنتا ہوں کہ اس طرح میں پرانی دلّی کے گلی کوچوں میں آزادی کے ساتھ گھوم سکتاہوں، اور باقی لوگوں کے ساتھ بہت اجنبی لگے بغیر گھل مل سکتاہوں۔ یہ سن کر خواجہ صاحب کافی محظوظ ہوئےاور کہنے لگے: جیسے آپ کی مرضی۔ چنانچہ شب معینہ، جب کہ میں جہلم کے علاقے میں رہنے والے مسلمانوں کے لباس میں ملبوس تھا، میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ رات کے کھانے کا وقت آیا تو میں علامہ اقبال کے پہلو میں ان کے بائیں ہاتھ پر بٹھلا دیا گیا ہوں!

کسی نے یہ بتانے کی ضرورت نہ سمجھی کہ میں کون ہوں اور تھوڑی دیر بعد کچھ ایسا خلط مبحث وقوع پذیر ہوا جس کے نتائج خاصے ناخوشگوار ہو سکتے تھے۔ میرے پرانے کرم فرما سر [جناب: ایک، احترامی خطاب] محمد یعقوب، جو میرا خیال ہے ان دنوں لیجسلیٹو اسمبلی [مجلس قانون ساز] کے ڈپٹی اسپیکر [نائب صدر] تھے، علامہ اقبال سے ذرا ہی دور بیٹھے تھے۔ان کے سامنے سر ظفر اللہ خان تشریف فرما تھے، جو اس وقت بھی ایک ممتاز قانون دان تھے۔ مزید برآں وہ ایک بڑے پکے بلکہ جوشیلے احمدی یا قادیانی بھی تھے۔ جلد ہی یہ بات ظاہر ہو گئی کہ جناب اقبال کو یہ اچنبھا ہو رہا تھا کہ آخر میں کس باغ کی چڑیا ہوں اور میں خود اس جھینپ میں تھا کہ کیا بتاؤں۔

جب سر محمد یعقوب نے یہ دیکھا تو مجھے بتانے کی خاطر شرارتاً انھوں نے اقبال پر یوں ظاہر کیا گویا میں ایک تازہ یورپین نومسلم ہوں۔ اس پر میز کی دوسری جانب سے سر ظفر اللہ نے مداخلت کرتے ہوئے یعقوب صاحب کو سختی سے جھاڑا کہ اس طرح مذہبی معاملات میں مضحکہ خیزی بڑی معیوب ہے۔ صورت حالات بڑی نازک ہو گئی اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ پھر یکایک ایک غیبی اشارہ سمجھیے کہ مجھے یاد آیا کہ علامہ اقبال کیمبرج

کے پڑھے ہوئے تھے۔ اگرچہ ان کی تعلیم فلسفہ خود میرے زمانہ سے پہلے کی بات تھی۔ چنانچہ میں نے انھیں بتایا کہ میں بھی کیمبرج کا فارغ التحصیل ہوں۔ اس کا بے حد خوشگوار اثر ہوا، اور ہم نے اطمینان کی سانس بھر کر بات چیت شروع کر دی۔ اور یہ گفتگو ایک خاصی دلچسپ یادوں کی بارات ثابت ہوئی، جس میں ہم کیمبرج یونیورسٹی کے مشاہیر کے بارے میں یادیں تازہ کرتے رہے، جنھیں اقبال پہلی جنگ عظیم سے پیشتر جانتے تھے، اور جن کی صورت یا کم از کم ان کے تذکرے سے خود میں بھی اپنے انڈر گریجویٹ زمانہ تعلیم کے دوران واقف تھا، یعنی اقبال کے وقتوں کے دس پندرہ سال بعد۔

ان اساتذہ میں ٹرنٹی کالج کے میک ٹیگرٹ شامل تھے جو اپنے زمانے کے سب سے مشہور کیمبرج فلاسفر [فلسفی] تھے اور اس کے علاوہ کچھ سنکی بھی تھے۔ پھر سورلی صاحب کی بات بھی ہوئی اور وہ ایک ممتاز فلسفی تھے، اگرچہ میک ٹیگرٹ سے ذرا کم تر... مگر چونکہ وہ (سورلی) میرے کالج یعنی کنگز کے آدمی تھے، اس لیے وہ میرے دیکھے ہوئے تھے۔ مزید برآں پروفیسر براؤن کی بات ہوئی، جو فارسی زبان و ادب کے ماہر تھے۔ ان کا عظیم الشان مکان، جو ٹرمپنگٹن اسٹریٹ کے پرلے سرے پر واقع تھا[7]، مجھے دور سے دکھایا گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی جب مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ اس قدر شہرہ آفاق مستشرق بننے سے پہلے انھوں نے طب میں ڈگری حاصل کی تھی تو مجھے بے حد حیرت ہوئی تھی۔

- ٹرمپنگٹن اسٹریٹ کیمبرج شہر کے جنوب میں واقع ہے اور اس کے سرے پر یونیورسٹی [جامعہ] کا مشہور متحف فٹز ولیم میوزیم [فٹز ولیم عجائب گھر] واقع ہے، جو مصری آثار و نوادر کے لیے بالخصوص شہرت رکھتا ہے۔

یہ ظاہر تھا کہ اقبال کے لیے یہ چٹکلہ بازی خاصی دل لگی اور تفریح طبع کا باعث ہوئی۔ میں نے اس بات کا بھی ذکر کیا جس کی وجہ سے میک ٹیگرٹ دیکھنے میں اس قدر نمایاں ہو جاتے تھے، یعنی یہ کہ انھیں ایگرا فوبیا (خوفِ وسعت) یعنی کھلی جگہوں سے وحشت کی بیماری لاحق تھی۔ اقبال کو بھی اس بے چارے کا یہ مرض یاد تھا۔ میں نے انھیں بتایا کہ کیسے ہم کنگز کالج کے انڈر گریجویٹ بعض اوقات میک ٹیگرٹ صاحب کو اپنے کالج سے نکل کر ٹرنٹی کالج کو جاتے ہوئے دیکھ کر لطف لیا کرتے تھے۔ بلاشبہ وہ کنگز میں گبز بلڈنگ کی سب سے اوپر کی منزل میں جناب لوس ڈکن سن کے ساتھ ہیگل کے بارے میں بحث کرنے کے بعد نکل رہے ہوتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ ان دو حضرات میں کبھی اس بات پر اتفاق نہیں ہو سکا تھا کہ درحقیقت ہیگل کا مطلب کیا تھا۔ اس کے بعد میک ٹیگرٹ صاحب کنگز کالج سے برآمد ہونے لگتے اور اسی کا تماشا دیکھنے کے لیے ہم طلبہ وہاں لگے رہتے تھے۔ کالج کے فرنٹ لان [پیش باغ] کے گرد گھومنے کے بعد باب داخلہ میں پورٹرز لاج [8] کے پاس سے گزرتے ہوئے، وہ باہر نکلتے تو انھیں کنگز پریڈ کی سڑک کے ساتھ ساتھ شمالی جانب کو سر گرم سفر ہونا پڑتا تھا۔ یہاں شروع شروع میں تو انھیں کوئی مشکل درپیش نہ آتی تھی، کیونکہ کوئی خوفناک کھلی جگہ وہاں واقع

---

[8] پورٹرز لاج کیمبرج (اور آکسفورڈ) کے ہر کالج کے باب داخلہ میں واقع ہوتا ہے۔ جہاں کالج کے فیلوز اور طالب علموں کی ڈاک جمع ہوتی ہے، نیز زائرین کو کالج کے بارے میں معلومات مہیا کی جاتی ہیں۔ رات کو کالج کا صدر دروازہ بند کرنے کی ذمہ داری بھی کالج کے پورٹرز یا محافظین کے سر ہوتی ہے۔ میرے زمانے میں طالب علموں کو رات کے دس بجے سے پہلے کالج کے اندر ہونا پڑتا تھا، ورنہ جرمانہ ہوتا تھا (جو کئی صدیوں سے غالباً ایک دو پینی یا یوں سمجھیے ایک دو آنے مقرر تھا) اور صبح کو اپنے ٹیوٹر [اتالیق] کے سامنے حاضر ہو کر وجہ بیان کرنی پڑتی تھی۔ اب کہ زمانہ بہت کھلا ڈھلا ہو گیا ہے، داخلے کی حد بڑھا کر رات کے دو بجے کر دی گئی ہے۔ باب داخلہ کے بند ہونے کے بعد بہت سے طلبہ دیوار پھاند کر اندر آیا کرتے تھے اور یہ کلائمبنگ [چڑھنا] خاصے تفاخر کی بات سمجھی جاتی تھی!

نہ تھی۔ آج کل کے برعکس ان دنوں کوئی نیچی سی دیوار کنگز کالج کی زمینوں کو کنگز پریڈ کے فٹ پاتھ [پیدل پٹری] سے جدا نہیں کرتی تھی بلکہ اس کی بجائے ایک موٹا اور وزنی اونچا سا لوہے کا جنگلہ کالج کی حفاظت کرتا تھا، جیسا کہ اب بھی کالج سے متصل سینٹ ہاؤس کے بچاؤ کے لیے کھڑا ہے۔ یہ جنگلہ بے چارے میک ٹیگرٹ کے لیے بہت باعث سکون ہوتا تھا، جو خالی جگہوں سے بڑے خوف زدہ تھے۔

چنانچہ وہ بدحلیہ، بے چارہ، بڑا ممتاز، بوڑھا پروفیسر ہمارے سامنے سے گزرتا جب ہم نوجوان اپنے کالج کے پورٹرز لاج کے آس پاس منڈلا رہے ہوتے تھے۔ میک ٹیگرٹ صاحب اپنی لڑکھڑاتی چال کے ساتھ ٹرنٹی کالج کو روانہ ہوتے وقت اول حصے میں تو زیادہ جلدی میں نہ ہوتے تھے، کیونکہ وہ آہنی جنگلہ ان کے سہارے اور دل بڑھانے کے لیے بالکل پاس ہی ہوتا۔ (جہاں تک مجھے یاد ہے، وہ ایسے بوٹ پہنے ہوئے تھے، جن کے تسمے عموماً ٹھیک طرح سے بندھے نہ ہوتے تھے اور تن پر ایک پرانا بد وضع سا اوور کوٹ [لمبا کوٹ] ہوتا تھا۔) لیکن پھر جب وہ سینٹ ہاؤس کے نزدیک پہنچتے تو وہ بھیانک مسئلہ درپیش آتا جس کی تاک میں ہم بے تابی کے ساتھ انتظار کر رہے ہوتے تھے۔ یعنی جب سینٹ ہاؤس کے پہلو کی گلی یکایک جانب مشرق کو کشادہ ہو جاتی ہے تو ایک رخنہ سا در آتا جو ایک خالی جگہ پیدا کر دیتا، پیشتر اس کے کہ وہ کیز کالج [9] کی اونچی عمارت کی دیواروں میں پناہ پا سکیں، اس

---

[9] یہ راقم الحروف یعنی مترجم کا کالج ہے، جو کنگز اور ٹرنٹی کالجوں کے درمیان واقع ہے، اور یونیورسٹی کا چوتھا قدیم ترین کالج ہے (مؤسسہ ۱۳۴۸ء)۔ اس کے بانی ڈاکٹر جان کیز نے طب کی تعلیم "اٹلی" کی مشہور یونیورسٹی پاڈیو سے پائی تھی، اس لیے انھوں نے اپنے نام کے ہجے اطالوی بنا لیے، یعنی Caius... اگرچہ اس نام کا تلفظ "کیز" ہی کیا جاتا ہے۔

کھائی کو پار کرنے سے پہلے وہ کچھ دیر کے لیے رک جاتے کہ ہمت ہو جائے، اور پھر قریباً ڈلکی چال چلتے، جو ہم تماش بینوں کے لیے مضحکہ خیز مگر دراصل قابلِ رحم ہوتی، وہ اس خالی جگہ کو پھاند جاتے، اور پھر ٹرنٹی اسٹریٹ کی تنگ گزرگاہ میں داخل ہونے کے بعد اپنی پہلی سی ڈگمگاتی چال چلنے لگتے۔

اور علامہ نے اگر مجھے ٹھیک سے یاد ہے، میرے بیان سے اتفاق کیا، کیونکہ انھیں میک ٹیگرٹ صاحب کے اس عجیب عارضے کی خبر تھی، اگرچہ ہم نوجوانوں کی نسبت ان کا اس بارے میں رویہ زیادہ ہمدردانہ تھا۔

بہر صورت، اقبال کو پروفیسر سورلی کے المیے کی قطعاً خبر نہ تھی، جس کا میں نے اس شب تذکرہ کیا: ان کا ایک بڑا چہیتا بیٹا جنگ (عظیم) میں مارا گیا تھا، جو ایک ابھرتی ہوئی نوجوان ادبی شخصیت تھا اور حقیقی امتیاز کا مالک۔ میرے زمانہ طالب علمی کے دوران، یا اس سے ذرا پیشتر ہمارے کنگز کالج میں ایک بڑا تلخ مناقشہ برپا ہو چکا تھا، جس کا تعلق اس نئے وار میموریل (یادگارِ جنگ) سے تھا جو کالج کے چیپل[10] میں نصب کیا جا رہا تھا اور جس پر کالج کے ان طالب علموں کے نام کندہ کیے جا رہے تھے جو جنگ میں جاں بحق ہوئے تھے۔ وہ کندہ کاری جو کہ باعث نزاع تھی، ایک ہنگیرئین طالب علم کا نام تھا، جو دوران جنگ مارا گیا تھا... لیکن ظاہر ہے کہ وہ دشمن

---

[10] کنگز کالج کا چیپل یا کلیسائے صغیر، ندرت و جمال و رعنائی تعمیر میں دنیا کے حسین ترین گرجوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے منقش زجاجی دریچوں (سٹینڈ گلاس ونڈوز) کی نظیر فرانس کے چند ایک گرجوں کے علاوہ کہیں اور مجھے نظر نہیں آئی۔ اور اس کی چھت پر لانبے ستونوں سے پھوٹتے ہوئے، جو ہسپانوی یا جاپانی پنکھوں کے سے مورچنور کی طرح چکر کھاتے اور لہراتے ہوئے (فلوٹنگ) نقش و نگار اور نازک آرائشی کمانیں بنائی گئی ہیں، وہ لاجواب ہیں، اور میر کے اس شعر کی یاد دلاتی ہیں:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

کی جانب سے لڑ رہا تھا، اور یہ مسئلہ کالج کونسل [مجلس کلیہ] کے لیے ایک کشمکش بن گیا تھا۔ تاہم کافی تذبذب اور بحث و مباحثے کے بعد کونسل والوں نے سمجھا کہ انھیں ایک بڑا اچھا حل مل گیا ہے اور وہ یہ کہ بڑی فراخ دلی کے ساتھ (مگر باوصف اختلاف) انھوں نے فیصلہ کیا کہ یہ نام فیرنس بیکاسی بھی اس میموریل پر کندہ تو کیا جائے .... مگر باقی سب ناموں سے الگ اور پتھر کی ایک علیحدہ سل کے اوپر۔ ہم نے سنا تھا کہ سورلی صاحب اس بات پر سخت مشتعل ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ عمل ان کے محبوب بیٹے کی یاد کی توہین تھا، بلکہ اس قومی مقصد کی بے عزتی کے مترادف تھا جس کے لیے اس نے جان دی تھی۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ انھوں نے کالج کونسل کو عمر بھر معاف نہیں کیا اور ہائی ٹیبل [کالج کے منتظمین اور اساتذہ کے کھانے کی میز] پر اپنے کئی ایک رفیق تدریس اساتذہ سے انھیں کشیدگی ہو گئی۔[11]

اس تنازعے پر لامتناہی بحثیں ہوتی رہیں۔ ہم طالب علموں میں سے اکثریت کا خیال تھا کہ کونسل کا فیصلہ صحیح تھا (ہم لوگ ۱۹۲۱ء میں کالج میں داخل ہوئے تھے۔) ہمیں سورلی صاحب ایک پرانے تنگ نظر اڑیل ٹٹو نظر آتے تھے، جو کوئی خاص اچھے فلسفی بھی نہیں تھے۔ یعنی جیسا کہ عام بول چال میں اس اصطلاح کا مطلب لیا جاتا ہے۔ ویسے ہم خود جنگ میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہوئے تھے اور جب جنگ عظیم ختم ہوئی تو ہماری عمر محض ۱۵ یا ۱۶ سال کی رہی ہو گی اور بعد از جنگ کی شکست فریب' (ڈس الوژن) کے دوران

[11] ہائی ٹیبل کیمبرج (اور آکسفورڈ) کے ڈائننگ ہالوں [ایوانات طعام] میں کمرے کی باقی سطح سے کچھ اونچی کرسی پر واقع ، لکڑی کی لمبی اور چوڑی میزیں ہوتی ہیں، جو ہال کے ایک سرے پر دیوار تا دیوار پھیلی ہوتی ہیں۔ ان میزوں کے گرد کالج کے اساتذہ اور فیلوز [ارکان] کی نشستیں لگتی ہیں، جب کہ باقی ہال میں (قدیم لکڑی کی طویل میزوں کے اطراف) طلبہ کھانا کھاتے ہیں۔ استعارتاً ہائی ٹیبل سے مراد کالج کے اساتذہ لی جاتی ہے۔

ہم سن بلوغت کو پہنچے تھے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے، علامہ اقبال نے اس موضوع پر کوئی اظہار خیال نہ کیا اور نہ مجھے یہ معلوم ہے کہ ان کا سورلی کی فلسفیانہ حیثیت کے بارے میں کیا خیال تھا۔ یہ عیاں تھا کہ میک ٹیگرٹ ان کے لیے زیادہ باعث دلچسپی تھے۔

بہرحال، کیمبرج کی بدولت، مدتیں گزریں ۱۹۳۲ء کی اس شام، دلّی کے اس مشاعرے کے موقع پر یعقوب و ظفر اللہ کے درمیان پیدا ہونے والی تلخی کی بات آئی گئی ہو گئی۔

تو خواتین و حضرات ، آج اس نومبر کی ایک شام [۱۹۷۷ء میں] ہم یہاں کیمبرج میں اس غرض سے مجتمع ہیں کہ ایک عظیم انسان (یعنی اقبال) کو خراج عقیدت پیش کریں، اور آج سے پینتالیس برس پہلے کے ایک نومبر کی شام کی یادیں تازہ کر رہے ہیں جب دور افتادہ دلی میں اس شخص کے ساتھ اسی کیمبرج کی باتیں ہو رہی تھیں۔

۲۲

ایک بلوچ طالب علم کی علامہ اقبال سے چند ملاقاتیں*

غلام قاسم مجاہد بلوچ[1]

عطا محمد قیصرانی بلوچ نے ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۸ء کے عرصے کے دوران علامہ اقبال سے چند ملاقاتیں کی تھیں۔ یہ ملاقاتیں اس وقت ہوئی تھیں جب وہ لاہور میں زیر تعلیم تھے۔ عطا محمد قیصرانی بنیادی طور پر قیصرانی بلوچ قبیلہ کے صدر مقام 'کوٹ قیصرانی' تحصیل تونسہ شریف ضلع ڈیرہ غازی خاں کے رہنے والے ہیں۔ قیصرانی قبیلہ کے مرادانی بڈاع (بدیع) شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد احمد خاں قیصرانی علاقے کے متوسط زمیندار تھے۔ عالم فاضل اور عربی فاضل تھے۔ دادا علی خاں قیصرانی نابینا تھے لیکن سینہ قرآن پاک کے نور سے منور تھا۔ پردادا یعقوب خاں قیصرانی بھی حافظ قرآن تھے۔

---

* سہ ماہی، اقبالیات اردو، جلد ۳۸-۳۹، شمار ۴،۲، اقبال اکادمی پاکستان، جنوری/جولائی ۱۹۹۸ء۔

1 غلام قاسم مجاہد بلوچ کی علامہ اقبال کے بارے میں ایک اور نگارش کے لیے دیکھیے:
غلام قاسم مجاہد بلوچ، اقبال اور عطائی، ڈیرہ غازی خان، بزم اقبال۔ ۲۰۰۰ء۔
بلوچستان میں اقبال شناسی کی روایات کے بارے میں مزید جاننے کے لیے دیکھئے:
نادر قمبرانی، ''علامہ اقبال اور بلوچی ادب''، مشمولہ، وحید عشرت، مرتبہ، اقبال ۸۴، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۶ء؛ انعام الحق کوثر، علامہ اقبال اور بلوچستان، اسلام آباد، اوپن یونی ورسٹی، ۱۹۸۶ء؛ ________، مرتبہ، اقبال شناسی اور بلوچستان کے کالج میگزین، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۸۹ء؛ ________، مرتبہ، اقبال شناسی اور ادبائے بلوچستان کی تخلیقات، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۹۰ء؛ فیصل احمد گوندل، ''بلوچستان میں اقبال شناسی کی روایت''، مشمولہ، جواد مرتضائی، ہمایش بین المللی اقبال لاہوری و اندیشہ ہائے او [بین الاقوامی کانفرنس اقبال لاہوری اور اس کی فکر]، مشہد، انتشارات دانش گاہ فردوسی، [۲۰۱۲ء]۔

عطا محمد خان کے فرزند ارجمند جناب ایاز احمد خان قیصرانی فی الوقت ڈیرہ غازی خان کے ممتاز قانون دان وکیل ہیں۔ اس طرح عطا محمد قیصرانی کا خاندان شناخت کے حوالے سے ایک مذہبی اور علمی خانوادہ ہے۔

عطا محمد قیصرانی نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی قصبہ کوٹ قیصرانی میں حاصل کی۔ میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول تونسہ شریف سے پاس کیا۔ ایف۔اے ۱۹۳۲ء میں دیال سنگھ کالج لاہور سے پاس کیا۔ بی۔اے بھی اسی کالج سے پاس کیا، جبکہ ایم۔اے فارسی پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ۱۹۳۷ء میں پاس کیا۔ پیشہ وارانہ تعلیم بی۔ٹی بھی لاہور سے پاس کیا۔ لاہور میں ان کے اساتذہ کرام میں پروفیسر مولوی فضل حق (گورنمنٹ کالج لاہور)، پروفیسر کھیم چند مترا (دیال سنگھ کالج لاہور)، حافظ محمود شیرانی (اورینٹل کالج لاہور) اور پروفیسر شیخ محمد اقبال (اورینٹل کالج لاہور، ماڈل ٹاؤن والے) شامل تھے۔

ستمبر ۱۹۴۲ء میں عطا محمد قیصرانی نے شعبہ تعلیم کے ڈسٹرکٹ بورڈ مڈل سکول گلہرہ گلی، کوہ مری میں بطور ہیڈ ماسٹر[مدرّسِ اعلیٰ] اپنی سروس کا آغاز کیا۔ کچھ عرصہ بعد سرکاری ملازمت مل جانے کے سبب گورنمنٹ ہائی سکول راجن پور میں بطور ایس ایس ٹی سیکنڈری سکول ٹیچر[استاد مدرسۂ ثانویہ] مقرر ہوئے۔ پھر ان کا یہاں سے گورنمنٹ ہائی سکول تونسہ شریف میں تبادلہ ہو گیا۔ دو سال وہاں گزارنے کے بعد ۱۹۴۹ء میں گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ۱ ڈیرہ غازی خاں میں تبدیل ہو کر آئے۔ تین سال یہاں پر رہنے کے بعد ان کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی سکول لیہ، ازاں بعد کوٹ ادو میں ہو گیا۔ ۱۹۵۴ء میں گورنمنٹ ہائی سکول مظفر گڑھ میں تبادلہ ہوا لیکن ایک ہفتہ گزارنے کے بعد ان کو ڈیرہ غازی خان میں بطور 'اے ڈی آئی' اسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر[معاون ضلعی معائنہ کار] تعینات کیا گیا۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۸ء تک اسی عہدے پر کام

کرتے رہے۔ لیکن پھر ایک سال کے لیے 'ڈسٹرکٹ انسپکٹر' بنا دیے گئے جو آج کل کے 'ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر'[ضلعی افسر تعلیم] کے برابر کا عہدہ تھا۔ ازاں بعد ہائی سکول راجن پور میں بطور ہیڈ ماسٹر تعینات ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں ان کا تبادلہ اس بلوچ خطہ کی ممتاز علمی درسگاہ گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 1 ڈیرہ غازی خاں میں بطور ہیڈ ماسٹر کیا گیا۔ ۱۹۷۱ء تک اس سکول کے ہیڈ ماسٹر رہے۔ ۱۹۷۱ء میں اپنی ملازمت کے آخری چھ ماہ جامعہ ہائی سکول ڈیرہ غازی خاں کے 'پرنسپل' مقرر ہوئے اور اسی سال ساٹھ سال کی عمر میں ریٹائر ہو کر حکومت سے پانچ سو روپے کی پنشن پائی۔ پھر شہر ڈیرہ غازی خان کی 'فرید آباد کالونی' نزد مولوی محمد قاسم مسجد، میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔

عطا محمد قیصرانی نے علامہ اقبال سے زمانہ طالب علمی میں جو تین چار ملاقاتیں کی تھیں، وہ نہ صرف ان کے لیے باعث افتخار ہیں بلکہ پوری بلوچ قوم کے لیے بھی برابر باعث یادگار اور دائمی اعزاز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ راقم نے ان ملاقاتوں کی تفصیل کو منظر عام پر لانے کے لیے ان سے ایک انٹرویو لیا، اور انھوں نے کمال شفقت سے ان ملاقاتوں کی تفاصیل فراہم کیں جنھیں قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

سوال: آپ کے دل میں علامہ اقبال سے ملاقات کرنے کی خواہش کس طرح پیدا ہوئی اور اس پہلی ملاقات کی بنیادی غایت کیا تھی۔ اس کی کچھ تفصیل؟

جواب: میری ملاقات کی بنیادی غایت علمی اور نصابی تھی۔ میں ۱۹۳۵ء میں اورینٹل کالج لاہور میں ایم۔اے فارسی کا طالب علم تھا۔ فارسی ادب سے متعلق چند باتیں میرے لیے وضاحت طلب تھیں۔ میں نے سن رکھا تھا کہ علامہ اقبال بھی ہمارے کالج میں پروفیسر رہ چکے ہیں، لہٰذا میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس بارے میں علامہ اقبال سے مستند معلومات حاصل کر لی جائیں۔ چنانچہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت علامہ اقبال 'شاہو کی گڑھی' کی

کوٹھی میں رہتے تھے۔ میں تقریباً دن کے ایک بجے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔

یہ سردیوں کا موسم تھا۔ علامہ صاحب باہر لان میں چارپائی ڈال کر دھوپ میں تشریف رکھتے تھے۔ میں نے 'اسلام علیکم' کہا اور بلوچ رواج کے مطابق ان سے ہاتھ ملایا۔ انھوں نے 'وعلیکم السلام' کہا ہاتھ ملایا پھر کہا بیٹھو عزیزا کرسی لے لو۔" چنانچہ میں کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا: "میرا نام عطا محمد ہے۔ میں یہاں پڑھتا ہوں۔ بلوچ ہوں۔ قصبہ کوٹ قیصرانی ضلع ڈیرہ غازی خان سے تعلق رکھتا ہوں۔" علامہ نے پوچھا "آپ بلوچوں کے کس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں؟" میں نے عرض کیا: "میں بلوچوں کے قیصرانی قبیلہ سے تعلق رکھتا ہوں۔" پھر انھوں نے ہماری بود و باش کے بارے میں دریافت فرمایا "آپ لوگ وہاں کیسی زندگی بسر کرتے ہیں؟ وہاں کے کیا اور کیسے حالات ہیں؟" میں نے بتایا: "وہاں اکثر لوگ جھونپڑیوں میں رہتے ہیں اور علاقے میں صحرائی ببول، ریت کے ٹیلے، وادیاں، لئی (گزلی)، لانڑہ (لانڑو)، بوئی (بو آٹ) وغیرہ ہوتے ہیں۔" علامہ اقبال کو میری یہ باتیں "لئی، لانڑہ اور بوئی" سمجھ میں نہ آئیں، چنانچہ انھوں نے پوچھا کہ یہ لئی، لانڑہ اور بوئی وغیرہ کیا ہوتے ہیں...میں نے بتایا: "یہ چھوٹے چھوٹے پودے ہوتے ہیں۔ انھیں مال مویشی اور اونٹ وغیرہ کھاتے ہیں۔ جلانے کے کام بھی آتے ہیں۔" پھر انھوں نے پوچھا "آپ لوگ اپنا گزارہ کیسے کرتے ہیں؟" میں نے بتایا ہمارا بیشتر گزارہ مال مویشی اور بھیڑ بکریاں پالنے پر ہے۔ زمینیں تو ہیں لیکن رود کوہی کا پانی قسمت ہی سے آتا ہے۔ بارش ہوتی ہے تو پھر کہیں کوئی فصل وغیرہ اُگتی ہے۔ پھر انھوں

نے پوچھا ''اچھا بلوچ! یہ آپ کے 'تمن مار' کیا ہوتے ہیں؟'' میں نے انھیں بتایا کہ ''جناب یہ تمن مار نہیں ہوتے بلکہ 'تمن دار' ہوتے ہیں۔ تمن بلوچی کا لفظ ہے جس کے معنی قبیلہ کے ہیں۔ جس بلوچ قبیلہ کی مسلح لڑاکا آبادی دس ہزار کے قریب ہوتی ہے، اس کے سربراہ کو 'تمن دار' کہتے ہیں۔''

علامہ صاحب نے بلوچ 'تمن دار' کا جس انداز میں خاکہ اڑایا تھا اور ذو معنی بات کی تھی، یعنی 'مار' بمعنی سانپ۔ مار بمعنی مارنا، قتل کرنا۔ 'تمن مار' بمعنی 'تمن کا سانپ' یا 'تمن مار' بمعنی 'تمن کا قاتل'...گویا دونوں صورتوں میں یکساں مہلک! بلوچ قبائل کے اکثر غدار اور انگریزی مفادات کے محافظ اور وفادار سرداروں کی خود غرضی کو انھوں نے جس واحد مگر بلیغ ترکیب میں بیان فرمایا تھا، وہ ان کی اسلامی اور ملی طرزِ فکر کا بے مثل اظہار تھا۔ 'تمن دار' کے دوسرے معنی 'تمن کی سولی' بھی ہو سکتے تھے مگر انھوں نے ''اپنی ترکیب سے جس انداز میں مزاح کا پہلو پیدا کیا تھا، وہ ان کا روایتی ظریفانہ نکتہ رس انداز تھا۔ پھر انھوں نے پوچھا کہ یہ کیا سلسلہ ہے کہ آپ بلوچ لوگ آدمی کو دیکھتے ہی شک کی بنا پر گولی مار دیتے ہیں۔ میں نے بتایا ''کہ یہ بات درست نہیں ہے بلکہ جب تک ہمیں پورا یقین نہ ہو جائے اس وقت تک ہم کسی کو گولی نہیں مارتے۔'' پھر انھوں نے پوچھا ''اچھا! یہ بتاؤ کہ بلوچوں میں یہ قتل و غارت کیوں زیادہ ہے؟'' میں نے عرض کیا کہ جناب! یہ 'غیرت' کی وجہ سے ہے۔ پھر انھوں نے فرمایا کہ ''یہ جو آپ نے غیرت مندی کی بات کی ہے اور جو ابھی وادیوں میں بھیڑ بکریوں اور اونٹوں کا ذکر کیا ہے، اس کے بارے میں کبھی کچھ ضرور لکھوں گا۔'' پھر شاید انھوں نے اپنی نظم 'بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو' لکھی ہو!

سوال: علامہ اقبال نے اس وقت کس قسم کا لباس پہن رکھا تھا؟

جواب: انھوں نے تہمد باندھ رکھا تھا۔ جسم پر کُرتا تھا۔ اس کے اُوپر سویٹر پہنا ہوا تھا۔ حقہ ان کے سامنے تھا۔ وہ کش لگا رہے تھے۔ وہ حقہ دھیرے دھیرے پیتے تھے۔

سوال: اس ملاقات میں جو علمی و نصابی باتیں ہوئیں، وہ کیا تھیں؟

جواب: اس وقت ایم۔اے فارسی کے نصاب میں ایک کتاب *Literary History of Persia* [لٹریری ہسٹری آف پرشیاء: تاریخِ ادبیاتِ ایران] ہوا کرتی تھی جو پروفیسر براؤن نے لکھی تھی۔ اس وقت فارسی پڑھنے کے لیے انگریزی کتب بھی پڑھنی ہوتی تھیں اور لکھنا بھی انگریزی میں ہوتا تھا۔ اس میں پروفیسر براؤن نے امام غزالیؒ کے متعلق کچھ لکھا تھا۔ میں اس سلسلے میں علامہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ میں نے عرض کیا ''جناب یہ غزالیؒ ولی اللہ تھے، فلاسفر تھے، کیا تھے؟'' علامہ نے فرمایا ''وہ سب کچھ تھے۔'' میں نے استفسار کیا کہ براؤن صاحب تو ان کے بارے میں اس طرح اور اس طرح لکھتے ہیں۔ علامہ نے فرمایا ''دراصل یہ مغربی مستشرقین ہماری زبانوں کے ماہر نہیں ہو سکتے۔ گو براؤن ایک متجسس آدمی ہے، لیکن ان مستشرقین کو ہماری زبانوں، شخصیات اور نظریات کا پورا ادراک نہیں ہو سکتا۔'' پھر میں نے قدیم ایرانی بادشاہوں کی تاریخ کے حوالے سے ان سے کسی مستند کتاب کے مطالعے کے لیے مشورہ طلب کیا تو انھوں نے فرمایا آپ ایران باستان لے لیں۔ چنانچہ بعد ازاں میں نے وہ کتاب لائبریری سے حاصل کر لی۔ بس انہی معروضات کے بعد میں نے ان سے اجازت طلب کی۔ فرمایا: ''اچھا بیٹا! کبھی کبھی ملتے رہا کریں۔''

سوال: علامہ سے اپنی دوسری ملاقات کے بارے میں بھی کچھ بیان

فرمائیے!

اصل میں بات یہ ہے کہ اب بہت وقت گزر چکا ہے، اور وقت کے ساتھ ساتھ بہت سی باتیں ذہن سے اتر جاتی ہیں۔ دوسری یا تیسری ملاقات کی تفصیل ترتیب وار بیان کرنا میرے لیے مشکل امر ہے۔ لیکن میرے خیال میں دوسری یا تیسری ملاقات بھی علمی حوالے ہی سے ہوئی تھی۔ بلکہ علامہ صاحب نے خود مجھے طلب فرما کر ملاقات کا اعزاز بخشا تھا۔ دراصل اس ملاقات کے پس منظر میں ایک دلچسپ واقعہ تھا، وہ یہ کہ میں غالباً ۱۹۳۵ء میں کراچی سے لاہور، بذریعہ ریل سفر کر رہا تھا۔ میرے ساتھ دو ایرانی مسافر بھی سفر کر رہے تھے۔ اس سفر میں علامہ کی مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق میرے زیر مطالعہ تھی۔ سکھر کے قریب ایک ایرانی نے مجھ سے وہ کتاب دیکھنے کے لیے طلب کی اور پوچھا کہ ''ایں کتاب از کیست؟'' [یہ کتاب کس نے لکھی ہے؟] میں نے کتاب اسے دیتے ہوئے کہا ''ایں از علامہ اقبال است'' [یہ علامہ اقبال کی تصنیف ہے]...اس نے وہ کتاب لے لی۔ اس کے دوسرے ایرانی ساتھی نے اس سے پوچھا ''ایں اقبال بہ مقابلہ'' [یہ اقبال اس کے مقابلے میں] (قزوینی یا کسی اور شاعر کا نام لیا تھا جو اب مجھے یاد نہیں ہے) ''چون است؟'' [کیسا ہے؟] اس کتاب بردار ایرانی نے جواب دیا 'آں آبجو، ایں بحر بیکراں۔' [وہ ذرا سی ندی، یہ بیکراں سمندر]

میں لاہور پہنچ گیا تو کچھ دنوں بعد ہمارا، دیال سنگھ کالج میں پروفیسر کھیم چند مترا کے پاس ایک لیکچر تھا۔ اس وقت ہماری یونیورسٹی کلاسیں دوسرے کالجوں میں بھی جایا کرتی تھیں۔ چنانچہ پرفیسر مترا نے اپنے لیکچر کے دوران علامہ کے بارے میں کہا کہ علامہ صاحب نے فارسی میں لکھ کر ایسے ہی تکلف کیا ہے، ان کے لیے تو اردو ہی اچھی تھی۔ پروفیسر مترا کے اس تبصرے کے ساتھ مجھے قطعی

اتفاق نہ ہوا۔ ایک تو اس لیے کہ میں فارسی کا طالب علم تھا دوسرے ان دو ایرانیوں کا واقعہ اور تبصرہ بھی میرے پیش نظر تھا۔ چنانچہ میں اعتراض کے لیے پروفیسر مترا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا ''نہیں جناب! اقبال کی فارسی شاعری تو ان کی اردو شاعری سے بدرجہا بہتر ہے۔'' انھوں نے وضاحت طلب کی ''وہ کیسے؟'' تو میں نے انھیں اپنے دو ایرانی ہم سفروں کے تبصرے سے آگاہ کیا اور انھیں بتایا کہ ''دیکھیں ایرانی تو فارسی کے ماہر ہوتے ہیں اور وہ اقبال کو بحر بیکراں تصور کرتے ہیں، اور آپ فرماتے ہیں کہ ''علامہ صاحب نے فارسی میں لکھ کر ایسے ہی تکلف کیا ہے۔'' انھوں نے فرمایا ''ہوگا۔ لیکن میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔'' چنانچہ اچھی خاصی بحث ہوتی رہی۔ اس بحث کی اطلاع علامہ صاحب کو پہنچ گئی، یوں کہ شام کو ہمارے یونیورسٹی فیلو [جامعہ کے ساتھی] ان سے ملتے رہتے تھے۔ چنانچہ میرے کسی یونیورسٹی فیلو کے ذریعے علامہ صاحب نے کہلا بھیجا کہ وہاں کوئی قیصرانی لڑکا ہے، اسے میرے پاس بھیج دینا۔ اس دن تو میں کسی مجبوری کے سبب ان کے ہاں نہ جا سکا، لیکن دوسرے دن تقریباً تین بجے بعد از دوپہر ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ حسب سابق علیک سلیک کے بعد میں ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا ''ہاں بیٹا! مترا کے ساتھ آپ کی کیا گفتگو ہوئی؟'' میں نے انھیں سارا واقعہ تفصیل کے ساتھ سنایا۔ انھوں نے میری گفتگو سننے کے بعد فرمایا کہ ''وہ (مترا) بھی ٹھیک کہتے ہیں، اور آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔'' میں نے عرض کیا ''جناب وہ کیسے ٹھیک کہتے ہیں؟ وہ تو فارسی کا صحیح تلفظ بھی ادا نہیں کر سکتے۔ بود کو بود، ماند کو ماند پڑھتے ہیں۔'' تو علامہ صاحب نے فرمایا کہ فارسی کا انگریزی ترجمہ تو ٹھیک کرتے ہیں نا؟ میں نے عرض کی جی ہاں! انگریزی ترجمہ تو ٹھیک کرتے ہیں۔

پھر انھوں نے فرمایا "آپ ڈیرہ غازی خان سے تعلق رکھتے ہیں۔ خواجہ غلام فرید کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟" چنانچہ اس وقت تک مجھے جو کچھ معلوم تھا، میں نے ان کے سامنے بیان کیا۔ پھر انھوں نے فرمائش کی "اچھا! خواجہ صاحب کی کوئی کافی سنائیں!" تو میں نے انھیں خواجہ صاحب کی

"آ مل اج کل سانول سائیں
نہ تاں مفتی خون تھیسائیں
انکھیاں بلکن منہ ڈیکھن کوں
گل لاون کوں پھٹکن باہیں"[2]

[غلام فرید]

والی کافی سنائی۔ لیکن کافی سننے کے بعد علامہ صاحب کو اس بار بھی پہلے کی طرح "پھٹکن" اور "بلکن" کے معنی اچھی طرح سمجھ میں نہ آئے۔ انھوں نے پوچھا یہ "پھٹکن" اور "بلکن" میری سمجھ میں نہیں آئے، ان کے کیا معنی ہوتے ہیں؟" چنانچہ میں نے پھٹکن کے معنی تو ان کے سامنے بازو پھیلا کر اور ہاتھ ہلا ہلا کر، باقاعدہ اداکاری کر کے سمجھائے، جبکہ بلکن کے معنی "روشنی اور جھپکنا" کے بتائے۔

---

[2] ترجمہ:

اے میرے محبوب مجھے جلدی آ کر مل
کہیں خوامخواہ میرا خون ہو جائے
آنکھیں بلک رہی ہیں تیرا مکھڑا دیکھنے کو
باہیں، بے چین ہیں تجھے گلے لگانے کو

مترجم: محمد سہیل عمر

میں نے جب رخصت کے لیے اجازت طلب کی تو انھوں نے فرمایا کہ
”دیکھو! جب بھی آیا کرو تو مجھے خواجہ صاحب کی کوئی کافی ضرور سنایا کرو!“

۲۳

علامہ اقبال کی زندگی کا ایک دن از علی بخش*

ممتاز حسن
ترجمہ: محمد سہیل عمر

سطور ذیل میں ہم ایک ایسا بیان آپ کے گوش گذار کر رہے ہیں جو علامہ اقبال کے یومیہ معمولات، زندگی بسر کرنے کے طور اور ان کی شخصیت کا نقشہ نگاہوں کے سامنے لے آتا ہے۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کا بیان ہے جس کا علامہ سے سالہا سال تک شب و روز خدمت کا ساتھ رہا۔ علی بخش[1] لگ بھگ دس سال کا تھا کہ علامہ کی خدمت میں آیا اور

---

* سہ ماہی، اقبالیات اردو، جلد ۴۴، شمار ۲، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، جولائی ۲۰۰۰ء۔

[1] میاں علی بخش کی علامہ اقبال کے بارے میں تاثرات، یاداشتوں اور اُن کے باہمی روابط کے لیے دیکھئے:
میاں علی بخش، ''ڈاکٹر اقبال''، مشمولہ، چراغ حسن حسرت، مرتبہ، اقبال نامہ، لاہور، ہونہار بک ڈپو، ۱۹۴۰ء؛ ، ''میرے ڈاکٹر صاحب''مشمولہ، ایم ایس ناز، مرتبہ، اقبال کے ہم صفیر، لاہور، شیخ غلام علی، ۱۹۷۷ء؛ ، ''علامہ اقبال کی زندگی کا ایک دن''مشمولہ، خالد حامدی مرتبہ، تلاشِ اقبال، دہلی، ادارۂ شہادتِ حق، ۱۹۸۰ء؛ ، ''علامہ اقبال: زندگی کا ایک دن'' مشمولہ، رفیع الدین ہاشمی + محمد سہیل عمر+ وحید عشرت، اقبالیات کے سو سال، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۲ـ؛ممتاز حسن ،''علی بخش سے انٹر ویو''مشمولہ، رحیم بخش شاہین، مرتبہ، اوراقِ گم گشتہ، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۷۵ء؛ محمد عبداللہ چغتائی، ''علی بخش''، اقبال کی صحبت میں،لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء؛ محمد عبداللہ چغتائی، ''علی بخش''،روایات اقبال، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء؛ صابر کلوروی،''اقبال کے بارے میں مختصر تاثرات: علی بخش''، اقبال کے ہم نشین، لاہور، مکتبۂ خلیل، ۱۹۸۵ء؛ عرشی امرتسری، ''علامہ اقبال کے ملازم خاص علی بخش سے ایک ملاقات'' مشمولہ، تصدق حسین راجا، مرتبہ، اقبال۔ پیامبرِ امید، لاہور، فیروز سنز پبلشرز،۱۹۹۰ء ؛ عبدالمجید خان ساجد، ''اقبال کے قریبی لوگ: علی بخش''، اقبال۔ حیات عصر، ملتان، ادارہ تحقیق وادب، ۱۹۹۴ء؛ ،چراغ حسن حسرت، ''انتساب

علامہ کی رحلت تک دن رات ان کے اندازِ زیست کا شاہد رہا۔ علی بخش سے یہ سوالات ممتاز حسن صاحب نے ایک انٹرویو کے دوران کئے اور ڈاکٹر جاوید اقبال کی موجودگی میں اس کی یادداشتیں درج کرتے گئے۔ انٹرویو ۲۲ ستمبر ۱۹۵۷ء کو لیا گیا۔ (محمد سہیل عمر)

س) اقبال صبح کو عموماً کب بیدار ہوتے تھے؟

ج) بہت سویرے۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ بہت کم خواب تھے۔ نماز فجر کی بہت پابندی کرتے اور نماز کے بعد قرآن کی تلاوت کرتے تھے۔

س) وہ قرآن کس انداز میں پڑھتے تھے؟

ج) جب تک ان کی آواز بیماری سے متاثر نہیں ہوئی تھی وہ قرآن کی تلاوت بلند آہنگ میں خوش الحانی سے کرتے تھے۔ آواز بیٹھ گئی تو بھی قرآن پڑھتے ضرور تھے مگر بلند آواز سے نہیں۔

س) نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کر کیا کرتے تھے؟

ج) آرام کرسی پر دراز ہو جاتے۔ میں حقہ تیار کر کے لے آتا۔ حقے سے شغل کرتے ہوئے اس روز کے عدالتی کیسوں کے خلاصوں پر بھی نظر ڈالتے رہتے۔ اس دوران میں گاہ گاہ شعر کی آمد بھی ہونے لگتی۔

س) آپ کیسے پہچانتے تھے کہ علامہ پر شعر گوئی کی کیفیت طاری ہو رہی ہے؟

ج) وہ مجھے پکارتے یا تالی بجاتے اور کہتے ''میری بیاض اور قلمدان لاؤ'' میں یہ چیزیں لے آتا تو وہ اشعار لکھ لیتے۔ اطمینان نہ ہوتا تو بہت بے چین ہو جاتے۔ شعر گوئی کے دوران میں اکثر قرآن مجید لانے

بنام میاں علی بخش (خادمِ اقبال)''مشمولہ، محیط اسماعیل، مرتبہ، الوداع! علامہ اقبال، لاہور، عوامی کتاب گھر، ۲۰۱۱ء۔

کو کہتے۔ شعر گوئی کے علاوہ بھی دن میں کئی بار مجھے بلا کر قرآن مجید لانے کی ہدایت کرتے رہتے۔

س) عدالت جانے کا وقت عموماً کیا ہوتا تھا؟

ج) عدالتی اوقات سے دس پندرہ منٹ قبل روانہ ہوتے تھے۔ پہلے بگھی میں، اور آخری زمانے میں گاڑی خرید لی تھی۔

س) وکالت کا کیا عالم تھا، بہت کام کرتے یا تھوڑا؟

ج) وکالت میں ایک حد سے زیادہ اپنے آپ کو مصروف نہیں ہونے دیتے تھے۔ عام طور پر یوں ہوتا تھا کہ ۵۰۰ روپے کے برابر فیس کے کیس آ جاتے تو مزید کیس نہیں لیتے تھے۔ دیگر سائلین کو اگلے ماہ آنے کا کہہ دیتے۔ اگر مہینے کے پہلے تین چار دنوں میں چار پانچ سو روپے کا کام مل جاتا تو باقی سارا مہینہ مزید کوئی کیس نہیں لیتے تھے۔

س) یہ پانچ سو روپے کی حد کیوں لگائی گئی تھی؟

ج) ان کا تخمینہ تھا کہ انھیں ماہانہ اخراجات کے لیے اس سے زیادہ پیسوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس زمانے میں اس رقم میں گھر کا کرایہ، نوکروں کی تنخواہیں، منشی کی تنخواہ اور گھر کے عمومی اخراجات سب شامل تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے، جب علامہ صاحب انار کلی اور میکلوڈ روڈ پر رہا کرتے تھے۔

س) علامہ صاحب نے کتنے عرصے تک وکالت کی؟

ج) جب تک انھیں گلے کی بیماری لاحق نہیں ہوئی تھی، وکالت کرتے رہے۔ یہ اندازاً ۳۳-۱۹۳۲ء کا زمانہ تھا۔

س) گلے کی بیماری کیسے شروع ہوئی تھی؟

ج) وہ عید کی نماز پڑھنے گئے۔ سردی کا موسم تھا گھر واپس آ کر سوّیوں

پر دہی ڈال کر کھایا جو انھیں بہت مرغوب تھا۔ اگلے ہی روز گلے کی تکلیف شروع ہو گئی۔ اس رات کے دو اڑھائی بجے تک کھانستے رہے۔ اگلے دن ان کی آواز بیٹھ گئی اور وفات تک آواز کی یہی کیفیت رہی۔

س) اب ذرا ان کے روز مرہ کے معمول پر دوبارہ بات ہو جائے۔ عدالت سے لوٹ کر آتے تو کیا کیا کرتے تھے؟

ج) سب سے پہلے تو مجھے کہتے کہ میرا لباس تبدیل کرو اؤ، رسمی دفتری لباس انھیں کبھی پسند نہ تھا۔ عدالت جانے کے لیے مجبوراً پہن لیتے اور گھر آتے ہی سب سے پہلے اس سے چھٹکارا حاصل کرتے۔

س) لباس بدل کر کیا کیا کرتے تھے؟

ج) اگر شعر کہنا ہوتے تو اس کے لیے حسب معمول بیاض، قلمدان اور قرآن مجید لانے کو کہتے؟

س) کیا وہ اپنی وکالت پر سنجیدگی سے توجہ دیتے تھے؟

ج) اگر اگلے دن عدالت میں کوئی مقدمہ ہوتا تو اس مقدمے کی مسل دیکھ لیتے تھے۔ ورنہ مقدمے کے کام میں اپنے آپ کو نہ الجھاتے۔

س) کیا وہ گھر پر عدالت کا کام کیا کرتے تھے؟

ج) اگلے روز کے مقدمات سے متعلق کاغذات پر نظر ڈالنے کے سوا اور کچھ نہیں۔

س) سہ پہر میں سونے کی عادت تھی؟

ج) معمول تو نہیں تھا، کبھی سو بھی جاتے۔

س) ان کی نیند کیسی تھی؟

ج) نیند کچی تھی، ذرا سی آواز سے چونک جاتے تھے۔

س) جسمانی تکلیف اور بے آرامی برداشت کرنے میں کیسے تھے؟

ج) بہت نرم دل تھے۔ تکلیف کی برداشت بہت کم تھی۔ کسی اور کو بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ خون بہتا دیکھنے کی بالکل تاب نہ تھی۔ ایک مرتبہ پاؤں پر بھڑ نے کاٹ لیا، اس سے وہ ایسے لاچار ہوئے کہ حرکت کرنے کے لیے بھی میرے سہارے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ ایک مرتبہ جاوید کو بچپن میں ابرو کے قریب چوٹ لگ گئی جس سے تھوڑا سا خون بہ نکلا۔ خون دیکھ کر علامہ کو غش آ گیا۔

س) کھانا کس وقت کھاتے تھے؟

ج) بارہ ایک بجے کے درمیان ایک ہی مرتبہ کھانا کھاتے۔ رات کے کھانے کا معمول نہ تھا۔

س) کھانے میں کیا پسند تھا؟

ج) پلاؤ، ماش کی دال، قیمہ بھرے کریلے، اور خشکہ

س) کھانے پر کئی طرح کی غذائیں ہوتی تھیں کیا؟

ج) جی نہیں ایک وقت میں زیادہ کھاتے نہ تھے، خوراک خاصی کم تھی

س) کسی خاص کھانے کو ناپسند کرتے تھے؟

ج) جی ہاں۔ سری پائے اور ٹھنڈے گوشت

س) ورزش کیا کرتے تھے؟

ج) ابتداء میں تو ورزش کرتے تھے۔ مگدر گھماتے اور ڈنٹر پیلتے تھے۔ انارکلی کے قیام تک یہ معمول رہا۔ اس کے بعد ورزش چھوٹ گئی۔

س) کھیلوں سے دلچسپی تھی؟

ج) کشتیوں کے دنگل شوق سے دیکھتے تھے۔

س) دیگر دلچسپیاں کیا تھیں؟

ج) شروع کے دنوں میں کبوتر پالنے کا شوق رہا، کبھی کبھار تاش بھی کھیل لیتے۔

س) شام کو کبھی کہیں باہر جایا کرتا تھے؟

ج) شام کو کہیں باہر نکلنا ان کے لیے تقریباً ناممکن تھا۔ جس زمانے میں قیام بھاٹی دروازے کے اندر تھا تو بسا اوقات حکیم شہباز الدین کے گھر کے باہر کے چبوترے تک ٹہل لیتے تھے۔ کبھی کبھار سر ذوالفقار علی اپنی موٹر لیکر آ جاتے اور انھیں باہر گھمانے لے جاتے۔

س) رات کو سوتے کس وقت تھے؟

ج) شام کو احباب کی محفل جمتی تھی۔ چوہدری محمد حسین ہمیشہ سب سے آخر میں رخصت ہوتے تھے۔ مجلس عموماً دس بجے برخاست ہو جاتی اور اس کے بعد علامہ چوہدری محمد حسین کے ساتھ بیٹھ کر انھیں اس روز کے تازہ اشعار سنایا کرتے تھے۔

س) چوہدری صاحب عموماً کتنی دیر ٹھہرتے تھے؟

ج) رات کے بارہ ایک بجے تک، اس کے بعد ڈاکٹر صاحب سونے کے لیے لیٹ جاتے۔ لیکن بمشکل دو تین گھنٹے سو کر تہجد کے لیے بیدار ہو جاتے۔

س) طیش میں آتے تھے یا نہیں؟

ج) بہت نرم دل اور طبیعت کے مہربان تھے، شاذ و نادر ہی غصے میں آتے۔ لیکن اگر اشتعال میں آ جاتے تو اپنے اوپر قابو پانا مشکل ہو جاتا۔ مجھے ان کی نرم دلی کا ایک واقعہ یاد ہے۔ ایک مرتبہ گھر میں ایک چور گھس آیا۔ ہم میں سے کسی نے پکڑ کر اس کی پٹائی کر دی۔ علامہ اقبال نے اس کا ہاتھ روک دیا اور کہا کہ چور کو مت پیٹو۔

یہی نہیں بلکہ اسے کھانا کھلایا اور آزاد کر دیا۔

س) تہجد پابندی سے پڑھتے تھے کیا؟

ج) جی ہاں پابندی سے پڑھتے تھے۔

س) تہجد کے بعد کیا معمول تھا؟

ج) اس کے بعد ذرا دیر کو لیٹ رہتے، تاوقتیکہ فجر کا وقت آن لیتا اور وہ نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔

س) کیا شعر کی آمد رات کو بھی ہوتی تھی؟

ج) جی ہاں۔ راتوں کو بھی شعر گوئی کرتے۔ عموماً یہ کیفیت ان پر رات کے دو اور اڑھائی کے درمیان طاری ہوتی تھی۔ جب بھی ایسا ہوتا مجھے آواز دے کر بیاض اور قلمدان طلب کرتے۔

۲۴

اقبال کے بعض حالات*

میر غلام بھیک نیرنگ

آغازِ تعلقات

اللہ اکبر! وقت کی رفتار کس قدر سست اور باایں ہمہ کس قدر تیز ہے۔ اقبال کی اور میری پہلی ملاقات بظاہر کل کی بات ہے، مگر حساب لگا کر دیکھیے تو پورے پچاس سال کا واقعہ ہے۔۔آدھی صدی گزر گئی اور کل کی بات ہے!

میں نے ۱۸۹۵ء میں پنجاب یونیورسٹی کا انٹرنس پاس کیا اور اسی سال گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوا۔ چونکہ میں تمام یونیورسٹی میں اوّل رہا تھا، اس لیے کالج میں داخل ہوتے ہی بہت سے قابل طلبہ میرے دوست بن گئے۔ انھی میں میرے مرحوم دوست چوہدری جلال الدین [1] بھی تھے جو ڈسکہ ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے تھے اور سیالکوٹ سے انٹرنس پاس کرکے لاہور آکر گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے تھے۔ وہ اور مَیں بورڈنگ ہاؤس [دارالاقامہ] میں رہتے تھے۔ بہت جلد معلوم ہو گیا کہ چوہدری صاحب کو

---

* سہ ماہی اقبال، جلد ۴۹ شمارہ ۴، ۳لاہور، بزم اقبال ، جولائی اکتوبر ۲۰۰۲ء

[1] چوہدری جلال الدین میرے مخلص ترین دوستوں میں سے تھے۔ وہ چار سال تک گورنمنٹ کالج ، لاہور میں میرے ساتھ پڑھتے رہے۔ میرے ساتھ بی۔اے پاس کیا اور محکمہ ڈاک خانہ میں انسپکٹر [معائنہ کار] بھرتی ہو گئے پھر ترقی پا کر سپرنٹنڈنٹ ہوئے۔ خطاب 'خان صاحب' پایا۔ بے حد شریف انسان تھے، عمر نے دیر تک وفا نہ کی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کا ایک فرزند سیالکوٹ میں وکیل ہے۔ اس سے مل کر چوہدری صاحب کی محبت اور شرافت یاد آ گئی!

شعر سے خاص ذوق ہے اورانھوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کے ذوق کی پرورش مولانا سید میر حسن کی صحبت میں ہوئی۔انھوں نے اقبال کا ذکر بھی کیا، کہ وہ مولوی صاحب موصوف کے خاص تربیت یافتہ بھی ہیں اور شاعر بھی ہیں ، ابھی ابھی سیالکوٹ سے آکر گورنمنٹ کالج کی بی۔اے [بیچلر ان آرٹس:] کلاس [جماعت] میں داخل ہوئے ہیں۔

ایک روز شام کے قریب مَیں اور چوہدری جلال الدین مرحوم بورڈنگ ہاؤس سے شہر کو گئے۔ بھاٹی دروازہ کے قریب پہنچے تو سامنے سے ایک سادہ وضع، گورے چٹے، کشیدہ قامت، جوان رعنا آتے ہوئے دکھائی دیے۔چوہدری صاحب نے کہا کہ شیخ محمد اقبال شاعر جن کا میں نے ذکر کیا تھا آ رہے ہیں۔جب ہم ایک دوسرے کے قریب پہنچ گئے توسب ٹھہر گئے۔چوہدری صاحب سے اور شیخ محمد اقبال سے متعارفانہ ملاقات ہوئی اور چوہدری صاحب نے میرا تعارف کرایا۔اس کے بعد ہم اپنے اپنے راستے چلے گئے۔معلوم ہوا کہ اقبال اس وقت بھاٹی دروازہ کے اندر شیخ گلاب دین مرحوم کے مکان پر رہتے تھے۔شیخ صاحب موصوف بھی سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔عدالت ہائے لاہور میں عرصہ دراز سے مختار کی حیثیت سے پریکٹس [وکالت] کرتے تھے اور لاہور میں جائداد حاصل کر لی تھی۔اس کے بعد اقبال سے تعلق کی وجہ سے شیخ گلاب دین سے ہم لوگوں کا تعارف اور تعلق ہوا اور کئی مرتبہ ان کے بالا خانے میں بیٹھ کر ہم نے محرم کا جلوس دیکھا۔

بھاٹی دروازے کے باہر جو اقبال سے سرراہ سرسری ملاقات ہوئی، تو دل میں خیال پیدا ہوا کہ ان کا کلام سننا یا دیکھنا چاہیے، دیکھیں تو یہ کیسا شعر کہتے ہیں۔مَیں نے چوہدری جلال الدین سے کہا کہ ان سے ان کے کچھ اشعار لائیے، مَیں دیکھنا چاہتا ہوں۔دو ایک روز کے بعد چوہدری صاحب ایک پرچہ لائے۔اس پر اقبال کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک غزل تھی جس کے یہ شعر

اس وقت تک یاد ہیں:

بر سر زینت جو شمع محفل جانانہ ہے
شانہ اس کی زلف پیچاں کا پر پروانہ ہے
پائے ساقی پر گرایا جب گرایا ہے تجھے
چال سے خالی کہاں یہ لغزش مستانہ ہے

میں دیکھتا ہوں کہ بانگ درا میں یہ غزل نہیں ہے۔ یہ بھی میرے علم میں ہے کہ اقبال یورپ سے واپس آنے کے بعد اپنی ابتدائے کار کے کلام سے بہت بیزار ہو گئے۔ ان کا معیار سخن بڑی بلندی پر پہنچ گیا تھا۔ انھوں نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ اس زمانے کے اپنے اشعار مجھے دیکھ کر اب بڑی شرم آتی ہے مَیں اس تمام کلام کو تلف کرنا چاہتا ہوں۔ علاوہ بریں بانگ درا میں جو غزلیں درج کی گئیں، ان کے بھی بعض اشعار حذف کیے گئے۔

مثلاً اس غزل میں :

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئے

دو شعر تو ضرور کاٹے گئے ہیں، ایک کا دوسرا مصرع تھا (پہلا مصرع یاد نہیں، بادہ نوشی اور حالت نشہ کا مضمون تھا):

اور مَیں گروں تو مجھ کو سنبھالا کرے کوئی

اور یہ مقطع:

اقبال عشق نے مرے سب بَل دیے نکال
مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

ان حالات میں کوئی تعجب نہیں 'وہ غزل' جانانہ ہے ، پروانہ ہے، اب اقبال کے شائع شدہ مجموعۂ کلام میں نہیں، مگر جب مَیں نے یہ غزل دیکھی تو

میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں نے اُس وقت تک اہل پنجاب کی اُردو شاعری کے جو نمونے دیکھے تھے، ان کو دیکھ کر مَیں اہل پنجاب کی اردو گوئی کا معتقد نہ تھا، مگر اقبال کی اس غزل کو دیکھ کر مَیں نے اپنی رائے بدل لی اور مجھ کو معلوم ہوگیا کہ ذوقِ سخن کا اجارہ کسی خطۂ زمیں کو نہیں دیا گیا۔ جب بندشوں کی ایسی چستی، کلام کی ایسی روانی اور مضامین کی یہ شوخی ایک طالب علم کے کلام میں ہے ، تو خدا جانے اسی پنجاب میں کتنے چھپے رستم پڑے ہوں گے جن کا حال ہم کو معلوم نہیں۔ خیر اوروں کو چھوڑیے، اقبال کا تو مَیں قائل ہو ہی گیا۔

چوہدری جلال الدین نے اقبال کا پرچہ مجھ کو دیا کہ اقبال بھی آپ کے کلام کا نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ان کو کچھ اشعار بھیجے۔ اب یاد نہیں کہ وہ کون سے اشعار تھے مگر یہ یاد ہے کہ ان میں ایک شعر یہ بھی تھا:

حرم کو جانا جنابِ زاہد یہ ساری ظاہر پرستیاں ہیں
مَیں اس کی رندی کو مانتا ہوں جو کام لے دَیر سے حرم کا

یہ تو لکھ چکا کہ کلام کا نمونہ دیکھ کر میں نے اقبال کو کیا سمجھا، یہ معلوم نہیں کہ میرے اشعار دیکھ کر انھوں نے کیا رائے قائم کی، مگر بہرحال اس مبادلۂ اشعار سے میرے اور اُن کے تعلق میں ایک خصوصیت ضرور پیدا ہوئی۔

بورڈنگ ہاؤس کی صحبتیں

اس ایک سرسری ملاقات کے بعد اقبال سے زیادہ صحبت کا موقع اُس وقت ملا جب وہ بھی بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہو گئے۔ میں اس وقت ایف۔اے میں پڑھتا تھا، اس لیے جونیئر [چھوٹے] طلبہ کے زمرے میں

ایک ڈارمیٹری میں رہتا تھا۔ ڈارمیٹری ایک بڑا کمرہ ہوتا تھا جس میں چھ چھ طلبہ رہا کرتے تھے۔ اقبال چونکہ بی۔اے کلاس میں سینئر طلبہ کے زمرے میں تھے، وہ کیوبکل میں رہتے تھے۔ [کیو بکل چھوٹا کمرہ ہوتا تھا جس میں صرف ایک طالب علم رہتا تھا۔]بی ۔اے اور ایم۔اے کے تمام طلبہ کو کیوبکل ملے ہوئے تھے، کھانے کا انتظام سینئر اورجونیئر طلبہ کا ایک ہی مطبخ میں تھا، صرف اس قدر تفریق تھی کہ مسلمانوں کا مطبخ الگ تھا اور ہندوؤں اور سکھوں کا مطبخ الگ۔ اب تو گورنمنٹ کالج کے بورڈنگ ہاؤس کی بڑی کایاپلٹ ہو گئی ہے۔ خود کالج کی عمارت میں بہت سے اضافے ہو گئے ہیں۔ ہمارے زمانے میں بورڈنگ ہاؤس میں کمروں کی تین قطاریں تھیں۔ جنوبی قطار میں کیوبکل ہی کیوبکل تھے۔ اس جنوبی قطار کے ساتھ زاویۂ قائمہ بناتی ہوئی ایک قطار مشرق میں تھی، ایک مغرب میں۔ اس مشرقی و مغربی قطار کے دونوں سروں پر دو دو کیوبکل تھے۔ باقی تمام حصے ڈار میٹری کی وضع کے کمرے تھے۔ جنوبی قطار کے وسط میں بورڈنگ ہاؤس کا پھاٹک تھا، اسی وسطی حصے کے اوپر سپرنٹنڈنٹ کے لیے کمرے بنے ہوئے تھے۔ اور جنوب مشرقی و جنوب مغربی گوشوں کے اوپر بھی ایک ایک کیوبکل بنا ہوا تھا، باقی تمام عمارت ایک منزلہ تھی اور تینوں قطاروں کے آگے آگے برآمدہ تھا۔ اقبال کو نیچے کی منزل میں مغربی قطار کے جنوبی سرے پر کیوبکل ملا۔ مَیں مشرقی قطار کی ایک ڈار میٹری میں رہتا تھا۔ گویا بلحاظ سکونت ہم دونوں میں بُعد المشرقین تھا۔ لیکن کالج کے اوقات درس کے سوا ہم دونوں کا وقت زیادہ تر ایک دوسرے کے ساتھ ہی گزرتا تھا اور اوقات مطالعہ کے بعد اور گرمی کے موسم میں رات کے وقت ان کا پلنگ ہماری ڈار میٹری کے آگے ہمارے ہی پاس بچھتا تھا۔

اقبال کی طبیعت میں اُسی وقت سے ایک گُونہ قطبیت تھی اور وہ قطب از جانمی جُنبد [ ] کا مصداق تھا ۔میں اورکالج کے بورڈنگ ہاؤس میں جو جوان

کے دوست تھے، سب انھی کے کمرے میں اُن کے پاس جا بیٹھتے تھے، وہ وہیں میر فرش بنے بیٹھے رہتے تھے۔ حُقّہ جبھی سے ان کا ہمدم و ہم نفس تھا۔ برہنہ سر، بنیان در بر، ٹخنوں تک کا تہ بند باندھے ہوئے اور اگر سردی کا موسم ہے تو کمبل اوڑھے ہوئے بیٹھے حقہ پیتے رہتے تھے اور ہر قسم کی گپ اُڑاتے رہتے تھے۔ طبیعت میں ظرافت بہت تھی، پھبتی زبردست کستے تھے۔ ادبی مباحثے بھی ہوتے تھے۔ شعر کہے بھی جاتے تھے اور پڑھے بھی جاتے تھے۔ مَیں اس وقت بورڈنگ ہاؤس میں چار سال رہا۔ ان میں سے تین سال ایسے تھے کہ اقبال بھی اسی بورڈنگ ہاؤس میں مقیم تھے۔ اس عرصہ میں مَیں نے بی۔ اے پاس کر لیا، اور قانون کا امتحان ،لائسینٹ ان لاء [قانون میں سند یافتہ] پاس کرنا باقی تھا۔ مثل امتحانات سابقہ بی۔ اے پاس کرنے پر بھی مجھ کو ایم۔ اے [ماسٹرز ان آرٹس:] کے لیے وظیفہ ملا۔ میرے خانگی حالات میں اور خصوصاً دو چھوٹے بھائیوں کی تعلیم کی ضرورت نے مزید تحصیل علم کی تمناؤں کو دفن کرکے مجھ کو مجبور کیا کہ قانون کا یہ آخری امتحان پاس کر لوں اور وکالت شروع کر دوں۔ انھی حالات کی وجہ سے بی۔ اے کے ساتھ ساتھ میں نے قانون کے دو امتحان پاس کیے تھے اور بی۔ اے کی تعلیم پر بہت کم توجہ کر سکا تھا۔ اس لیے میں صرف اس مقصد سے کہ وظیفہ ملتا رہے، ایم۔ اے کلاس میں داخل تو ہوگیا۔ مگر مضمون وہ اختیار کیا جس میں اساتذہ کو میری بے توجہی محسوس نہ ہو، یعنی اور صرف قانون کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ انھی حالات کے ماتحت تخفیف مصارف کی غرض سے مَیں نے گورنمنٹ کالج کا بورڈنگ ہاؤس چھوڑ دیا۔ کچھ عرصہ ایک دوست کا شریک مکان و طعام ہو کر موری دروازہ میں ایک بالا خانہ میں رہتا رہا اور اس کے بعد اورینٹل کالج کے بورڈنگ ہاؤس واقع حضوری باغ (متصل شاہی مسجد و قلعہ) میں چلا گیا اور وہیں سے قانون کا یہ آخری امتحان دیا۔

مَیں اقبال کے حالات لکھتے لکھتے اپنا قصہ لکھنے بیٹھ گیا۔ مگر دکھانا یہ تھا کہ جب میں بی۔اے پاس کر چکا اور اُدھر اقبال ایم۔اے پاس کر چکے تو ہم دونوں نے گورنمنٹ کالج بورڈنگ ہاؤس چھوڑ دیا اور جو صحبتیں وہاں تین سال تک رہیں وہ ختم ہو گئیں۔

ان سہ سالہ صحبتوں میں خاص بات کیا تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم کو اس وقت اتنا شعور ہی نہ تھا کہ اس زمانے کے اقبال میں زمانۂ ما بعد کے اقبال کو دیکھ لیتے۔ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ ایک ذہین طالب علم ہے جس نے شاعرانہ طبیعت پائی، اس کو مرزا غالب کی شاعری سے خاص ذوق بھی ہے اور غالب کے اُسلوب بیان کی تقلید کا شوق بھی، وہ اگر شعر کا شغل کرتا رہا تو غالب کا سا لکھنے لگے گا اور بہرحال اسی قسم اور اسی معیار کا ایک شاعر بن جائے گا جیسے ہمارے یہاں کے شاعر ہوتے ہیں۔ اگر ہم اُس وقت یہ سمجھ سکتے کہ یہ شخص تو آگے چل کر، اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی لکھے گا، اُس کے قلم سے ضربِ کلیم، ارمغان حجاز اور جاوید نامہ نکلیں گے۔ یہ گوئٹے کے نام عالم ارواح میں پیام مشرق بھیجے گا، تو ہم اسی وقت سے اس کے حالات و ملفوظات کی یادداشتیں رکھنے لگتے۔ اس کے ایک ایک لفظ کو اس کے مستقبل کا آئینہ دار سمجھتے ہوئے محفوظ رکھتے اور آج جب اس کے کمالات کے دفتر دنیا میں موجود ہیں، اس کا سوانح نگار دکھا سکتا کہ دیکھیے اس کے فلاں نظریہ کی اساس فلاں وقت کے فلاں واقعہ میں موجود ہے۔ مگر اس ابتدائی زمانہ میں کسی کو بھی اقبال میں ایک اچھے شاعر مگر عام معیار کے شاعر کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ یا اگر آپ اجازت دیں تو یہ کہوں کہ دیکھنے والوں کی کوتاہ نظری نہ تھی بلکہ اُس وقت وہ چیز موجود ہی نہ تھی جو بعد میں بن گئی۔ شمس العلماء سید میر حسن مرحوم و مغفور کی تربیت سراسر ادبی تھی، پروفیسر آرنلڈ (بعدہٗ

سرطامس آرنلڈ) کا فیض تعلیم مطالعۂ فلسفہ و تحقیق علمی کا رہنما ہوا، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ تصوف کی بنیاد گھر میں پڑ چکی تھی کہ اقبال کے والد ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ اصل سرچشمہ جہاں سے اقبال نے تلاش حق کی، کبھی نہ بجھنے والی پیاس کو بار بار تسکین دی، قرآن کریم ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہے۔

ہاں ایک بات ضرور لکھنے کے قابل ہے۔ ہماری ان سہ سالہ صحبتوں میں اقبال اپنی ایک سکیم بار بار پیش کیا کرتے تھے۔ ملٹن کی مشہور نظم پیراڈائز لاسٹ [جنت گم گشتہ] اور پیراڈایز ری گینڈ [جنت پھر حاصل کرنا] کا ذکر کر کے کہا کرتے تھے کہ واقعات کربلا کو ایسے رنگ میں نظم کروں گا کہ ملٹن کی پیرا ڈایزری گینڈ کا جواب ہوجائے ، مگر اس تجویز کی تکمیل کبھی نہیں ہو سکی۔ مَیں اتنا اور کہ دوں کہ اُردو شاعری کی اصلاح وترقی کا اور اس میں مغربی شاعری کا رنگ پیدا کرنے کا ذکر بار بار آیا کرتا تھا۔

بہرحال مَیں نے آخر ۱۸۹۹ء میں قانون کا آخری امتحان پاس کیا اور ابتدائے ۱۹۰۰ء میں انبالہ میں وکالت شروع کر دی۔ اقبال بدستور لاہور میں رہے اور گورنمنٹ کالج میں استاد فلسفہ مقرر ہو گئے۔ اب ہماری صحبتوں کا مسلسل دَور ختم ہو گیااور صرف کبھی کبھی کا ملنا رہ گیا۔

سیالکوٹ میں ملاقات

مَیں پیٹ کے دھندے میں لگا ہوا تھا اور اقبال اپنی ملازمت میں مبتلا تھے۔ دل چاہتا تھا کہ اُن سے ملوں۔ آخر ستمبر کا مہینہ آیا اوردیوانی عدالتیں ایک ماہ کے لیے بند ہوئیں۔ اُس وقت کالج میں تعطیل تھی اور اقبال گھر پر سیالکوٹ میں تھے۔ اس لیے اُن سے ملنے کے لیے مَیں سیالکوٹ گیا اور ان کا مہمان ہوا۔ غالباً یہ ذکر ۱۹۰۱ء کا ہے۔ صبح کے وقت دو بجے میرے سامنے

آئے۔ کالج کے زمانے میں اقبال سے بارہا سنا تھا کہ سیالکوٹ میں بعض ایسے مسلمان بھی ہیں جو اہل بیت رسول [ﷺ] سے جلتے ہیں۔ اُن کو جلانے کے لیے اقبال نے اپنے لڑکے کا نام آفتاب حسین رکھا ہے اور اپنے بھتیجے کا نام اعجاز حسین۔ [حالت یہ تھی کہ اقبال بارہا ایسے افسانے بھی گھڑ کر سنا دیا کرتے تھے، جن کی اصلیت کچھ نہ ہوتی تھی۔ اس لیے آفتاب حسین اور اعجاز حسین کے قصے کو بھی مَیں باور نہ کرتا تھا۔] یہ بچے جو آئے تو اقبال نے ایک کا تعارف کرانے کے لیے پنجابی میں کہا کہ ’ ایہ آفتاب وانگوں سحر خیز اے‘ (یہ سورج کی طرح علی الصباح جاگ اٹھنے والا ہے) مَیں نے سمجھ لیا کہ یہ ان کا بچہ آفتاب ہے اور بچے سے کہا کہ بھئی یہ تمھارا باپ ایسا ہی گپی ہے کہ اس نے تمھارا ذکر بارہا کیا مگر مجھ کو یقین نہیں آیا کہ تم کوئی واقعی ہستی ہو۔ آج تم کو دیکھ کر یقین آیا۔ اعجاز کا تعارف معمولی الفاظ میں تھا اور مَیں نے بھی اس سے اس قسم کی کوئی بات نہ کہی۔ بعد میں آفتاب تعلیم کے لیے انگلستان گئے۔ وہاں سے ایم۔ اے اور بیرسٹر [وکیل عدالت العالیہ] ہو کر آئے اور اب وہ آفتاب اقبال ہیں۔ افسوس ہے کہ اُن میں اور اقبال میں بعض وجوہ سے اَن بن اور مغائرت رہی۔ اس خوردسالی کی ملاقات کے بعد وہ مجھے کلکتہ میں ملے۔ معلوم ہوا کہ وہاں کے اسلامیہ کالج میں پروفیسر ہیں۔ مَیں نے اُن کو سیالکوٹ کی یہ ملاقات انھیں الفاظ میں یاد دلائی۔ اعجاز اب اعجاز احمد اور پنجاب کی جوڈیشیل سروس [عدالتی خدمت] میں سینئر جج [بڑامنصف] ہیں۔ مگر ان سے اس روز کے بعد پھر کبھی ملاقات نہ ہوئی۔ آفتاب کلکتہ کے بعد بھی کئی مرتبہ مل چکے ہیں۔

مَیں سیالکوٹ کے اسی چکّر میں اقبال کے ساتھ جا کر حضرت علامہ میر حسن رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت سے بھی مشرف ہوا۔ عجب نورانی بزرگ تھے، بے حد شفقت سے پیش آئے۔ اقبال کے والد ماجد مرحوم کی زیارت ہوئی۔

بڑے بابرکت لوگ تھے، اقبال کے ایک خاص دوست جھنڈے خاں بھی ملے جن کے تذکرے بارہا سننے میں آئے تھے، گورنمنٹ کالج لاہور کے قدیم طلبہ میں سے میرے دوست اور اقبال کے ہم جماعت، بی۔اے کلاس کے فلسفہ میں ہم سبق اور دوست میاں سر فضل حسین بھی (جو اُس وقت صرف میاں اور بیرسٹر تھے) سیالکوٹ میں پریکٹس کرتے تھے، ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان دونوں کو ایک شرارت سوجھی۔ ایک سرخ رنگ کا ایریٹیڈ [بلبلے دار] پانی گلاسوں میں ڈال کر کچھ ایسے انداز سے پینا شروع کیا اور مجھ کو پینے کو دیا کہ مَیں نے اس کو شراب سمجھا اور پینے سے انکار کیا۔ وہ دیر تک کہتے رہے کہ ایسی بھی کیا پارسائی ہے، پی لو۔ مَیں برابر انکار کرتا رہا۔ آخر مجھ کو خوب بنا چکے، تب بتایا کہ یہ کیا ہے اور تب مَیں نے پیا۔

مخزن: عبدالقادر اور اقبال

'مخزن' مرحوم کو محبت اور حسرت سے یاد کرنے والے تمام ہندوستان میں جا بجا موجود ہیں۔ اس رسالے کو جاری کرکے شیخ عبدالقادر نے اردو زبان و ادب کی نہایت گراں بہا خدمت کی، جس کی داد ملک کے تمام صاحب ذوق دیتے آئے ہیں۔ اجرائے رسالہ مخزن کے بعد شیخ عبدالقادر کو کارکنان قضا وقدر نے اپنی نامعلوم حکمتوں کے ماتحت جبراًاور یکایک انگلستان بھیج دیا۔ وہاں سے وہ بیرسٹر ہو کر آئے، پھر بیرسٹری کے کام میں منہمک ہو کر سرکاری وکیل ہوئے۔ خان بہادر ہوئے، ہائی کورٹ کے جج اور سر ہوئے۔ وزیر تعلیم پنجاب رہے اور بہت سے مناصب جلیلہ پر سرفراز رہنے کے بعد ریاست بہاولپور کے چیف جسٹس ہوئے۔ ان حالات میں مخزن ان کے فیض سے محروم ہو گیااوران کے انگلستان سے واپس آنے کے بعد چند سال تک دوسرے ہاتھوں میں رہ کر آخر بند ہی ہو گیا۔ لیکن جو کام مخزن نے کیا وہ

اُردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا۔

اسی رسالے کے ذریعہ سے شیخ عبدالقادر بڑے بڑے قابل لوگوں کو منظر عام پر لے آئے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔ منشی دیانرائن نگم آنجہانی (بعدش رائے بہادر) اول مخزن میں مضامیں لکھنے لگے۔ پھر انھوں نے کانپور سے اپنا ماہانہ رسالہ زمانہ جاری کیا اور مدیر زمانہ کے فرائض بڑی قابلیت سے ادا کیے۔ حسرت موہانی نے مخزن میں مضامین لکھے، اُس کے بعد اردوئے معلی جاری کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی طفلانہ مشق اول اول مخزن ہی میں شائع ہوئی ۔میں نے اپنی ماہانہ تنقید میں اس مضمون پر اعتراض کیا۔ مگر شیخ جوہر شناس نے لکھا کہ آپ ان کو دیکھیں گے توان کی حوصلہ افزائی ہی مناسب سمجھیں گے۔ چنانچہ وہ آخر الہلال کے سحر طراز مدیر بنے اور ان کی جادوبیانی کو دنیا نے تسلیم کیا۔

شیخ عبدالقادر ہی کی جوہر شناسی اول اول اقبال کو بھی کشاں کشاں منظر عام پر لائی۔ شیخ صاحب اقبال سے کہ سکتے تھے:

اول آنکس کہ خریدار شدت، من بودم
باعث گرمئ بازار شدت، من بودم[2]

(رومی)

شیخ صاحب نے بانگ درا کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اقبال سے ان کا

میں تھا جس نے سب سے پہلے تیرا مول لگایا
میں تھا جس کی وجہ سے بازار میں تیری مانگ پیدا ہوئی

[مترجم: محمد سہیل عمر]

تعارف ۱۹۰۱ء سے دو تین سال پیشتر ہوا یعنی ۱۸۹۸ء یا ۱۸۹۹ء میں۔ شیخ صاحب سے میرا تعارف اس سے بہت پیشتر ہو چکا تھا۔ اجرائے مخزن کے بارے میں جو مشورے ہوئے، اُن میں مرزا اعجاز حسین اعجاز دہلوی مرحوم اور مَیں بھی شریک تھے۔ میں مخزن کا پرچہ پہنچنے پر ہر ماہ شیخ صاحب کو مفصّل تنقید لکھا کرتا تھا، اورجب شیخ صاحب نے یکایک قصد انگلستان کیا تو مجھے لاہور بلا کر مخزن میرے سپرد کیا۔ مَیں اُن کی غیر حاضری میں بلااظہار نام اس کا مدیر رہا۔ شیخ محمد اکرم اسسٹنٹ ایڈیٹر [نایب مدیر] اور مینیجر [مہتمم] رہے۔ وہ تمام مضامین ڈاک سے میرے پاس بھیج یا کرتے تھے اور میں فیصلہ کیا کرتا تھا کہ کون سا مضمون یا نظم قابل اشاعت ہے، مگر یہ کرامت شیخ عبدالقادر ہی کی تھی کہ وہ انگلستان میں بیٹھے تھے اور رسالہ اس حسن و خوبی سے چل رہا تھا کہ گویا وہ لاہور میں موجود ہیں۔

لوگ شیخ عبدالقادر کو وسیع الاخلاق کہا کرتے تھے، مگرمیں اُن کو ہمیشہ وسیع المحبت سمجھتا رہا ہوں، اگر وہ وسیع الاخلاق ہوتے ہوئے وسیع المحبت بھی نہ ہوتے تو ان کا دائرہ احباب اس قدر وسیع نہ ہوتا۔ اخلاق ایک حد تک دوسروں کو گرویدہ کر لیتے ہیں۔ محبت اس گرویدگی میں گہرائی اور پائداری پیدا کرتی ہے۔ شیخ صاحب نے جس کسی میں ذرا بھی کچھ قابلیت دیکھی، اُس کو اپنا بنا لیا اور ایسے راستے پر لگایا کہ اس کی قابلیت ترقی کرے۔

اقبال کے بارے میں شیخ صاحب نے یہی کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اقبال کی وجہ سے مخزن کو چارچاند لگے اور مخزن کی وجہ سے اقبال کا جوہر روز بروز زیادہ ہی چمکتا گیا۔

اقبال شیخ صاحب کو شیخ عالم گنڈھ کہا کرتے تھے، یعنی دنیا بھر کو گانٹھ لینے والے، گرہ میں باندھ لینے والے، اپنا بنا لینے والے۔ اقبال نے عربی لفظ

عالم کو پنجابی لفظ گنڈھ سے ملا کر باقاعدہ فارسی میں ایک اسم فاعل ترکیبی بنایااورا س طرح اس لقب میں ایک رنگِ ظرافت پیدا کردیا۔ مگر ظرافت کے باوجود یہ لقب پھبتی یا تمسخر نہیں ہے، بلکہ ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ تمسخر کا تو خیال بھی نہیں ہوسکتا، اقبال تو عبدالقادر کووہ سمجھتے تھے جو بانگ درا میں ان کی نظم 'عبدالقادر' کے نام سے ظاہر ہے۔

سفر یورپ

۱۹۰۵ء کے موسم گرما میں اقبال نے مزید تعلیم کے لیے انگلستان جانے کا ارادہ کیا۔ انھوں نے اپنی روانگی کی تاریخ مجھ کو لکھ دی تھی اور یہ طے ہو گیا کہ مَیں اُن کو خدا حافظ کہنے کے لیے دہلی میں اُن سے ملوں گا۔ اتفاق کی بات کہ دہلی میں ان سے ملنے کی جو تاریخ تھی، اس سے پہلے روز شملہ میں میرا ایک مقدمہ برائے سماعت مقرر تھا۔ اس وقت تک شملہ اور کالکا کے درمیان ریل نہ تھی۔ محکمۂ ڈاک کے انتظام سے دواسپہ تانگے چلتے تھے، مسافر انھی تانگوں میں آتے جاتے تھے، لیکن مسافروں کے تانگے صرف دن میں چلتے تھے، ڈاک کا تانگہ شام کے چھ بجے شملہ سے روانہ ہو کر کالکا تک کا دو تہائی یا نصف راستہ بعد غروب آفتاب طے کرتا تھااور پہاڑ کی سڑک پر رات کا یہ سفر جس میں گھوڑے ڈاک کو بروقت پہنچانے کے لیے فروٹ جاتے تھے، خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے اگر کوئی مسافر ڈاک کے تانگے میں سفر کرنا چاہتا تھا تو اس سے مطبوعہ اقرار نامے پر دستخط کرائے جاتے تھے، جس کا مضمون یہ تھا کہ اگر کوئی حادثہ ہو جائے تو گورنمنٹ کسی ضرر جسمانی یا نقصان جان کا ہرجانہ ادا کرنے کی ذمہ دار نہ ہوگی۔

مَیں اُس روز عدالت کے کام کی وجہ سے دن کے تانگے میں سفر نہیں کر سکتا تھا، مگر اقبال سے ملنے کے لیے دہلی اسی شام کو جانا ضروری تھا، اس

لیے مَیں نے اس اقرار نامہ پر دستخط کردیے اور عدالت میں اپنا کام ختم کرنے کے بعد ڈاک کے تانگے میں کالکا کو روانہ ہو گیا۔ شاید آدھا ہی راستہ طے ہوا کہ تھا کہ سورج چھپ گیا اور تھوڑی ہی دیر میں بالکل اندھیر ہو گیا ۔جب کالکا تین چار میل رہ گیا تو ایک جگہ ایک کھیت میں آگ جلتی دیکھ کر گھوڑے چمکے اور بے قابو ہو کر تانگے سڑک کے دائیں جانب کو لے چلے۔ آگے ایک چھوٹا سا پُل تھا ایک پہیہ اُس کی سینڈ پر چڑھ گیا اور تانگہ الُٹ گیا، بم ٹوٹ گیا، گھوڑوں کی راسیں ڈرائیور کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں اور تانگے کو وہیں چھوڑ کر ٹوٹے ہوئے بم کے ساتھ جتے ہوئے گھوڑے ہَوا ہو گئے۔ڈاک کے تھیلے سڑک پر پھیل گئے، ڈرائیو کو چوٹ آئی اور سواریوں کو بھی چوٹ آئی۔ چنانچہ میرا بھی گھٹنا چھِل گیا اور خون جاری ہو گیا۔ یہ سب کچھ ہوا مگر اس وقت سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ اب دہلی جانے کے لیے ریل کیوں کر ملے گی۔آدھ گھنٹہ کے بعد کالکا کی طرف سے بگل سنائی دیا اور اس سے چند منٹ بعد ایک خالی تانگہ آ پہنچا۔ڈاک کے تھیلوں اور سواریوں کو لے کر اس دوسرے تانگے والے نے ڈاک گاڑی کے چلنے سے پیشتر کالکا کے اسٹیشن پر پہنچا دیا اور سب نے خدا کا شکر ادا کیا۔ چنانچہ اپنا زخمی گھٹنا لیے ہوئے میں حسبِ وعدہ دہلی پہنچ گیا اور حضرت سلطان المشائخ محبوب ِ الٰہی (قدس سرہ) کے آستانہ پر حاضر ہو گیا۔ وہاں اقبال مل گئے، اُن کے ساتھ شیخ نذر محمد، بی۔اے اسسٹنٹ انسپکٹر [نایب ِ معاینہ کار] مدارس تھے جو اقبال سے بے حد محبت کرتے تھے اقبال اور شیخ صاحب موصوف خواجہ حسن نظامی کے مہمان تھے۔

دہلی میں اقبال کے ٹھہرنے کا مقصد یہ تھا کہ حصول برکت کے لیے حضرت محبوبِ الٰہی کے مزار شریف پر حاضری دی جائے اور التماس دعا کی جائے۔ چنانچہ اقبال حاضر ہوئے، ہم لوگ ہمراہ تھے۔اقبال نے حضرت محبوبِ

الٰہی کو مخاطب کرتے ہوئے ایک نظم پڑھی جو بانگ درا میں 'التجائے مسافر' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ ایک اور نظم بھی اس وقت پڑھی تھی جس کا صرف یہ آخری مصرع یاد ہے:

لاج رکھ لینا کہ مَیں اقبال کا ہم نام ہوں

اس مصرع میں خواجہ اقبال کی طرف اشارہ تھا جو حضرت محبوب الٰہی کے خادم تھے اور اس وقت اس تلمیح کا خاص لطف اُٹھایا گیا تھا، مگر اب وہ دوسری نظم بانگ درا سے غائب ہے۔ شاید بعد میں غور کرنے پر اقبال نے اس کو اپنے معیار سے فروتر قرار دیا اور شائع کرنا مناسب نہ سمجھا ہو۔

یورپ سے واپسی پر پہلی ملاقات

اقبال نے دوران قیام یورپ میں کیمبرج سے بی۔ اے کی سند فضیلت حاصل کرنے کے علاوہ بیرسٹری کی سند بھی حاصل کی اور جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی [ ] کی ڈگری لی۔ جب وہ یورپ سے واپس آئے تو انھوں نے لاہور میں بیرسٹری کی پریکٹس شروع کی۔ یورپ سے اُن کی واپسی کے بعد اُن سے میری پہلی ملاقات لاہور میں ہوئی۔ محرم کی تعطیل تھی۔ میں انھیں سے ملنے کی غرض سے لاہور گیا تھا، انھوں نے اپنے قیام کے لیے چنگڑ محلّہ میں مکان لیا تھا۔ مَیں دن کے وقت لاہور پہنچا اور سیدھا ان کے وہاں گیا۔ ملازموں نے میری پذیرائی کی مگر معلوم ہوا کہ اقبال کہیں گھومنے گئے ہیں۔ مَیں نے کہا کہ خدا کا شکر ہے، اقبال نے بھی گھر سے نکلنا سیکھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ آئے تو مَیں نے دیکھا کہ نہایت نستعلیق سوٹ پہنے ہوئے ہیں۔ مَیں نے دوسرا شکر ادا کیا کہ اقبال نے لباس پہننا سیکھا۔ (اس سے پیشتر وہ لباس کے بارے صرف سادہ ہی نہیں بلکہ لاپروا تھے)۔ خیر گلے ملے، مزاج پرسی ہوئی، اس کے بعد وہ سوٹ اُتر گیا۔ وہی ہمیشہ کا تہبند بندھ گیا، وہی بنیان بدن پر رہ گیا، وہی کمبل

شانوں پر سوار ہو گیا ، ہمنفس (حقّہ) حاضر ہو گیا۔ میں اور اقبال پہلے کی طرح فرش پر بیٹھ گئے، دنیا بھر کی باتیں چھڑ گئیں اور ہوتی رہیں۔ میرے قیام کے تین دن اسی ہیئت کذائی سے گزر گئے، کہاں اقبال اور کہاں گھر سے نکلنا اور کس کا سُوٹ، یورپ ہو آئے، دماغ کو گاناگوں فضائل علمی سے آراستہ کر لائے۔ سینے کو طرح طرح کی اُمنگوں اور عزائم سے بھر لائے، مگر رندی اور قلندری میں فرق نہ آیا۔ تین دن کی شبانہ روز صحبت کے بعد میں رخصت ہو کر انبالے چلا آیا۔

فلسفۂ خودی

اقبال نے ۱۹۱۵ء میں مثنوی اسرارِ خودی شائع کی تو مجھ کو بھی اس کا ایک نسخہ بھیجا۔ اس سے پہلے مَیں آگاہ نہ تھا کہ اس قسم کی کوئی کتاب لکھی جا رہی ہے۔ اس میں تصوّف اور خواجہ حافظ پر جو سخت گیری کی گئی ہے، وہ مجھ کو ناگوار گزری اور مَیں نے اقبال کو ایک طومار اختلاف لکھ کر بھیجا اور اس خط میں یہ بھی لکھا کہ مَیں اس بارے میں مفصل مضمون لکھ کر شائع کروں گا۔ اقبال نے جواب میں لکھا کہ ابھی آپ اشاعت کے لیے کچھ نہ لکھیں، پہلے مجھے آپ سے بالمشافہ مبادلۂ خیالات ہو جائے، پھر اگر آپ ضروری سمجھیں تو اپنے خیالات کو لکھ کر شائع کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے یہ بھی لکھا کہ مَیں نے اس مرتبہ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ خیالات قائم کیے ہیں۔ اس سے مَیں متنبہ ہوا اور مَیں نے اپنی تنقید کو لکھ کر شائع کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ البتہ وقتاً فوقتاً خطوط میں اور زبانی اقبال سے مذاکرہ ہوتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب انھوں نے رموزِ بےخودی لکھنے کا ارادہ کیا تو پہلے سے اس کا ایک خاکہ لکھ کر چند احباب میں بغرض مشورہ بھیجا۔ ان میں راقم، مرزا اعجاز حسین مرحوم اعجاز دہلوی اور لسان العصر خان بہادر سیّد

اکبر حسین الٰہ آبادی مرحوم۔ تین نام تو مجھے یاد ہیں، شاید کسی اور کو بھی بھیجا ہو۔ ہم میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی رائے لکھ کر بھیج دی اور اس کے بعد مثنوی رموزِ بے خودی لکھی گئی۔ اس کے دیباچہ میں اقبال نے اس مشاورت کا ذکر اس پیرایہ میں کیا ہے کہ مجھ کو فلاں فلاں سے امداد ملی۔

اقبال کے مطالعۂ قرآن مجید کی کیفیت میرے مشاہدہ میں نہیں آئی، مگر اُن کی تلاوت میں جو جذبہ ہوتا تھا، اُس کا ایک نمونہ میں نے دیکھا ہے۔ چنگڑ محلے والے مکان کے بعد وہ بازار انار کلی میں اُن بالاخانوں میں جا کر رہے، جن میں ہمارے ایامِ طالب علمی میں میاں محمد شفیع مرحوم رہتے تھے اور اُن کی بیرسٹری کا دفتر تھا، اس کے بعد میاں صاحب موصوف ترقی کرتے کرتے لاہور بار کے لیڈر ہو گئے، سر کا خطاب پایا اور انھوں نے ہائی کورٹ کے عقب میں اقبال منزل کے نام سے (اقبال اُن کے چھوٹے صاحبزادے کا نام ہے) ایک بڑی وسیع اور عالیشان کوٹھی بنوائی اور اس میں رہنے لگے۔ پھر اس کے بعد وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل [مجلس منتظمہ] کے ممبر ہو گئے۔ میاں صاحب جیسے مشہور ممتاز بیرسٹر کا پرانا مسکن ایک عالمی شہرت حاصل کر چکا تھا، اس لیے قانون پیشہ لوگ اس میں رہنا اورا پنا دفتر قائم کرنا اپنے لیے موجب ترقی سمجھتے تھے، غالباً اسی خیال کے تحت کسی نے اقبال کو مشورہ دیا ہوگا کہ اپنی سکونت اور دفتر کے لیے یہ بالا خانہ لے لیں۔

اچھا تو جب وہ ان بالا خانوں میں رہتے تھے ایک مرتبہ میں لاہور گیا۔ ٹرین ایسے وقت لاہور پہنچی کہ اقبال کے مکان پر پہنچنے کے بعد صبح کی نماز کا وقت باقی تھا۔ میں اوپر پہنچا تو ایک کمرے سے تلاوت کلام اللہ کی بلند مگر نہایت شیریں اور درد انگیز آواز میرے کانوں میں آئی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کس کی آواز ہے۔ میں نے فوراً جلدی جلدی وضو کیا اور نماز پڑھنے کے لیے اُس

کمرے میں گیا۔ دیکھا کہ اقبال مصلّے پر بیٹھ کر قرآن حکیم پڑھ رہے ہیں۔ مجھ کو دیکھ کر انھوں نے مصلیٰ خالی کر دیا اور خود پاس کے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے اسی مصلیٰ پر نماز پڑھی تو نماز میں خاص کیفیت محسوس کی اور مَیں نے اپنے دل میں اس وقت یہ کہا کہ یہ کیفیت وہ شخص یہاں چھوڑ گیا ہے، جو ابھی ابھی یہاں بیٹھا ہوا کلام اللہ پڑھ رہا تھا۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ اقبال صبح کی نماز بہت سویرے پڑھ کر تلاوت کیا کرتے ہیں۔ مگر نمونہ اس روز دیکھا۔ اس روز سے مَیں اقبال کی روحانیت کا قائل ہو گیا اور دوسروں سے یہ کہنے لگا کہ اقبال بڑے بزرگ آدمی ہیں۔

اعزاز نائٹ ھڈ

جنوری ۱۹۳۲ء میں اقبال کو نائٹ ھڈ [سرداری: ایک برطانوی اعزاز] ملی اور وہ سر محمد اقبال ہوئے۔ مَیں اس اللہ کے قلندر کو خوب سمجھتا تھا، مگر یہ بھی معلوم تھا کہ شیطان اپنے داؤں پیچ سب پر چلاتا ہے، اس لیے ضروری سمجھا کہ مبارکباد کے ساتھ اُن کو یہ بھی یاد دلاوں کہ اسلامی دنیا ان سے کیا کیا توقعات رکھتی ہے۔ مَیں نے خط لکھا۔ اس کا جواب جو انھوں نے دیا مکاتیب اقبال، صفحہ ۲۰۷/۲۰۶ پر درج ہے۔ اس کے ساتھ اُن کی اصل تحریر کا فوٹو بھی ہے۔ اس خط میں وہ لکھتے ہیں:

> میں آپ کو اس اعزاز کی خود اطلاع دیتا، مگر جس دنیا کے مَیں اور آپ رہنے والے ہیں، اُس دنیا میں اس قسم کے واقعات احساسات سے فروتر ہیں، سینکڑوں خطوط اور تار آئے اور آ رہے ہیں، اور مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ لوگ ان چیزں کو کیوں گراں قدر جانتے ہیں۔ باقی رہا وہ خطرہ جس کا آپ کے قلب کو احساس ہوا ہے۔ سو قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضہ میں میری جان اور آبرو ہے، اور قسم اس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ

سے مجھے ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں، دنیا کی کوئی قوت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ انشاء اللہ! اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں لیکن اس کا دل مومن ہے۔

مسلمانانِ الور کی امداد

ریاست الور کی حکومت عرصہ دراز سے وہاں کے مسلمانوں کو مٹانے کی فکر میں تھی۔ کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کے مکاتب تعلیم قرآن و اُردو بند ہو جائیں۔ مسلمان بچے اگر پڑھیں بھی تو ریاست کے مدارس میں جن میں ذریعہ تعلیم ہندی تھی اور وہ بھی ایسی سنسکرت آمیختہ [ملی ہوئی] ہندی کہ مسلمان بچے اس کو پڑھنے کے بعد بھی عملاً اس سے کورے ہی رہیں اور ریاست کی کسی ملازمت کے قابل کبھی نہ بن سکیں۔ اس کے علاوہ مساجد کو منہدم کیا جاتا تھا، مسجدوں کو مندر بنایا جا تا تھا، قبرستانوں میں سڑکیں نکالی جاتی تھیں اور طرح طرح سے مسلمانوں کی مذہبی زندگی کو ناممکن بنایا جا رہا تھا۔ اگر مسلمان اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے آئینی جدوجہد کرتے تھے تو ان کو باغی اور مخالف ریاست اوران کی قائم کردہ انجمنوں کو خلاف قانون قرار دیا جاتا تھا۔ یہ قصہ طویل ہے مگر اس سلسلہ میں ۲۹ مئی ۱۹۳۲ء کو ریاست کی فوج نے بلاوجہ اور بالکل ناجائز طورپر مسلمانوں کے پُر امن مجمع پر گولی چلائی۔ کئی مسلمان شہید ہوئے، کئی زخمی ہوئے اور اس کے بعد مسلمانوں پر گوناگوں تشدد کیا گیا۔ آخر تنگ آکر ہزار ہا مسلمانوں نے الور سے ہجرت کی۔ اس زمانے میں آل انڈیا مسلم کانفرنس قائم تھی اور اس وقت اس کے صدر اقبال تھے۔ جمعیت مرکزیہ تبلیغ الاسلام کے معتمد عمومی کی حیثیت سے مَیں نے معاملات الور کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور میں نے مسلم کانفرنس مذکورہ سے معاونت کی درخواست کی۔ چنانچہ قرار پایا کہ مسلم کانفرنس کا ایک

وفد وائسرائے [نایب السلطنت] کی خدمت میں پیش ہو کر مسلمانان الور کی داد رسی کے لیے وائسرائے کو توجہ دلائے۔ اس وفد کے ارکان کی تعداد تو زیادہ تھی مگر وائسرائے نے تاریخ اس قدر نزدیک مقرر کی کہ ہندوستان کے مختلف مقامات سے اکثر لوگ اس تاریخ پر شملہ نہ پہنچ سکتے تھے اور وائسرائے کا خیال تھا کہ دو چار چیدہ آدمی آ جائیں، زیادہ مجمع کرنا غیر ضروری ہے۔ چنانچہ اقبال بحثییت صدر آل انڈیا مسلم کانفرنس اس وفد کی قیادت کے لیے لاہور سے شملہ تک کی سفر کی صعوبت گوارا کرتے ہوئے شملہ پہنچے۔ کالکا سے مَیں ان کے ہمراہ ہوا اور ہم دونوں نے کالکا سے شملہ تک کا سفر ایک ہی موٹر میں کیا۔

شملہ میں اُن کا قیام لوئر [نچلا] بازار کے ایک بالا خانہ میں رہا۔ کیونکہ اس مرد خدا کے مزاج میں یہ بات تھی ہی نہیں کہ ہم بڑے آدمی ہیں، وائسرائے سے ملنے کے لیے آئے ہیں، ہمارے قیام کے لیے کسی بڑے ہوٹل یا کوٹھی میں پر تکلف انتظام ہو۔ اس کے بعد ۶؍ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو وفد وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حاضریٔ وفد کے بعد کیا کیا ہوا، اس کو یہاں بیان کرنا مقصود نہیں۔ صرف دو یا تین باتیں دکھانے کے لیے مندرجہ بالا سلسلہ واقعات لکھا گیا۔ پہلی بات یہ کہ قومی ضرورتوں کے موقع پر اقبال جو عموماً غیر متحرک رہتے تھے، ایسے متحرک بن جاتے تھے جیسے کوئی اورجوشیلا کارکن۔ دوسری بات یہ کہ جب مَیں اور وہ موٹر میں کالکا کو جارہے تھے تو حسب معمول اسلامی موضوعات پر گفتگو چھڑ گئی۔ میں نے کہا کہ آپ نے قرآن کریم کا بہت مطالعہ کیا ہے اور اس زمانے کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے خیالات سے بھی آپ واقف ہیں، یہ دیکھتے ہوئے کہ ابنائے زمانہ کو قرآن کریم کی تعلیم سے بیگانگی اور بُعد کیوں ہے، آپ اُن کے لیے قرآن کی تفسیر یا قرآن پر حواشی لکھیے۔ اُنھوں نے اس کام سے اپنی معذوری ظاہر کی۔ اس

اظہار معذوری کے سلسلہ میں جو انھوں نے تقریر کی تو اس میں بعض نازک مسائل آ گئے، ان کو بیان کرتے کرتے ان پر ایک حالت جوش و جذبہ طاری ہو گئی اور ایسا معلوم ہوا کہ ان کا دل سینے سے نکل پڑے گا۔ مگر دو چار ہی سیکنڈ [دقیقہ] میں انھوں نے خاموش رہ کر پھر سلسلۂ گفتگو جاری کر دیا اور دیر تک جاری رکھا، اس حالت پر ضبط پا لیا اور ذرا کی ذرا اسی قسم کا جوش جذبہ میں نے ایک اور موقع پر بھی دیکھا۔ اس ملاقات کی بھی کچھ تفصیل لکھ دوں۔

۱۹۳۴ء میں منٹگمری میں تعلیمی کانفرنس صوبہ پنجاب کا اجلاس ہوا۔ راقم بھی اس کانفرنس میں شریک ہوا۔ علی گڑھ سے سر راس مسعود مرحوم اور نواب صدر یار جنگ بہادر، مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی بھی تشریف لا کر شریک اجلاس ہوئے۔ جب یہ اجلاس ختم ہو گیا تو واپسی میں نواب صدر یارگ جنگ اور راقم ایک دو روز کے لیے لاہور ٹھہر گئے اور شیخ سر عبدالقادر کے مہمان ہوئے۔ ایک روز اقبال سے ملنے گئے۔ وہ اس وقت میکلوڈ روڈ پر اس بنگلے میں رہتے تھے جس کے عقب میں حضرت شاہ ابوالمعالی رحمتہ اللہ علیہ کا مزار ہے۔ بازار انار کلی کے بالا خانہ سے اٹھ کر وہ اسی بنگلہ میں آ گئے تھے اور جب تک ان کی کوٹھی جاوید منزل تعمیر نہ ہو گئی، اسی میں رہتے رہے۔ ہم جو گئے تو اُن کو سامنے کے بڑے کمرہ میں جس کے آگے برآمدہ تھا، بیٹھا ہوا پایا۔ کمرے میں نیچے چٹائی اور اس کے اوپر دری کا فرش تھا اور سامنے کی دیوار کی طرف کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اقبال اپنے معمولی قلندرانہ لباس (بنیان، تہبند، کمبل) میں ملبوس بیٹھے حُقہ پی رہے تھے۔ وہ ہم لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوئے اور باتیں شروع ہو گئیں۔ مَیں نے دیکھا کہ اس کمرے میں ایک طرف دیوار کے قریب کئی قالین لپٹے ہوئے رکھے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ یہ قالین کیوں رکھے ہوئے ہیں، کہنے لگے کہ مَیں افغانستان گیا تھا، نادر

شاہ نے یہ قالین بطور تحفہ دیے تھے، ان کو بچھانے کی کوئی جگہ نہیں، یہ رکھے ہیں۔ مَیں نے اپنے دل میں کہا کہ قلندر کو جو کوئی تحفہ دے، خواہ دینے والا بادشاہ ہی ہو، اس تحفہ کا یہی حشر ہوتا ہے۔ (لیکن ان قالینوں کی دعا آخر قبول ہوئی۔ جب جاوید منزل تعمیر ہو گئی تو یہ اس میں بچھائے گئے)۔

اس زمانے میں اقبال جاوید نامہ لکھ رہے تھے ، مجھ کو اور شروانی صاحب کو اس کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے۔ پڑھتے پڑھتے ان پر دو چار سیکنڈ کے لیے وہی جوش و جذبہ طاری ہو گیا، جو میں نے شملہ کے سفر میں دیکھا تھااور اسی طرح انھوں نے اس جوش پر فوراً قابو پا لیا۔

مَیں اس بنگلہ میں کئی مرتبہ اقبال کا مہما ن ہوا۔ جس کمرے میں میرا قیام ہوتا تھا۔ وہ پھاٹک میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ کو تھا، وہ اس کمرہ میں میری ضروری آسائش کا انتظام کرا دیا کرتے تھے، ویسے شاید وہ کمرہ ان کے منشی کی نشست کے لیے تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ وہ سامنے کے بڑے کمرے کے برآمدے میں ایک پلنگ بچھوا کر اس پر بیٹھ جایا کرتے تھے ، پلنگ کے ایک جانب اور سامنے کرسیاں ہوتی تھیں۔ جو لوگ اُن سے ملنے کے لیے آتے تھے، وہ ان کرسیوں پر بیٹھتے تھے۔ وہ خود پلنگ پر بیٹھے حُقّہ پیتے رہتے تھے۔ ملاقات کے لیے آنے والوں میں ہر درجہ کے لوگ ہوتے تھے۔ طلبہ آتے تھے، عام معزز لوگ اور معمولی درجہ کے لوگ آتے تھے۔ ہائی کورٹ کے جج اور حکومتِ پنجاب کے منسٹر [وزرا] بھی آتے تھے۔ وہ اللہ کا قلندر سب کے ساتھ یکساں اخلاق کا برتاؤ کرتا تھا، مگر ایک شانِ استغنا برابر قائم رکھتا تھا، نہ بڑے آدمی کے سامنے جھکتا تھا، نہ چھوٹے سے بے اعتنائی کرتا تھا، بے تکلف، بے تصنع گفتگو کرتا تھا، اسی میں ہنسی مذاق بھی ہوتا رہتا تھا، پھبتیاں بھی اڑتی رہتی تھیں۔ تقدس کا جامہ کبھی پہنا ہی نہیں۔ مَیں اُن کو رندِ

بے ریا کہا کرتا تھا۔

مجدد صاحب کے مزار پر حاضری

اقبال نے جا بجا خانقاہوں اور خانقاہ نشینوں پر اعتراضات کیے ہیں۔ اسرارِ خودی کے شایع ہونے پر ان کو تصوّف اور سلاسلِ تصوّف کا مخالف سمجھا گیا تھا، مگر ان کے کلام کے وسیع مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا اعتراض ریا کار، دکاندار، دنیا طلب صوفیوں پر ہے اور وہ تصوف سے ان دور از کار عقائد و مسائل کو خارج کرنا چاہتے ہیں جو عجمیت کے زیرِ اثر اسلامی تصوّف میں داخل ہو گئے ہیں۔ مَیں لکھ چکا ہوں کہ اُن کے تصوّف کی بنیاد گھر میں پڑ چکی تھی۔ اُن کے والد ماجد ایک صوفی منش بزرگ تھے، خود اقبال سلسلۂ قادریہ میں بیعت کیے ہوئے تھے۔ اکابر طریقت سے اُن کی عقیدت کا حال اسی سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ وہ مولانا جلال الدین رومی کی نظم سے بے حد متاثر تھے۔ پیر رومی کا ذکر ہر جگہ بڑی تعظیم سے کرتے ہیں اور خود کو ان کا مرید ہندی کہتے ہیں۔ بزرگوں کے مزارات پر بالقصد بغرض زیارت و طلب برکت حاضر ہوتے تھے۔ بانگ درا میں اُن کی نظم 'التجائے مسافر' کو دیکھیے۔ اس سے حضرت محبوب الٰہی سے انتہائی عقیدت ظاہر ہوتی ہے۔ یہ اقبال کی جوانی اور انگلستان جانے سے پیشتر کا واقعہ ہے۔ لیکن اگر بالفرض یہ جوانی کی خام کاری تھی تو بعد کی پختہ کاری بھی قابل غور ہے۔ بالِ جبریل ملاحظہ ہو۔ اس کے صفحہ ۳۷ پر ایک نظم درج ہے، جس کا پہلا شعر ہے:

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا
غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندازۂ صحرا

اس نظم کے شروع میں جو تمہیدی عبارت ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں:

"نومبر ۱۹۳۳ء میں مصنف کو حکیم سنائی غزنوی کے مزار مقدس کی زیارت نصیب ہوئی۔ یہ چند افکار پریشان جن میں حکیم ہی کے ایک مشہور قصیدے کی پیروی کی گئی ہے، اس روز سعید کی یادگار میں سپرد قلم کیے گئے۔" الفاظ، مزار مقدس اور 'روز سعید' اپنی کہانی خود کہ رہے ہیں۔

اس پختہ کاری کے زمانے میں غالباً ۱۹۳۴ء میں حضرت امام ربانی شیخ احمد سرہندی * مجدد الف ثانی کے مزار پاک کی زیارت کے لیے اقبال لاہور سے چل کر سرہند آئے۔ مجھ کو لکھا کہ میں بھی پہنچوں۔ چنانچہ' میں انبالے سے گیا اور وہ لاہور سے آئے، ہم دونوں سرہند جنکشن پر مل گئے اور پھر روضہ شریف پہنچے۔ مزار پر اقبال کی حاضری میرے ہمراہ ہوئی اور فاتحہ خوانی کے بعد وہ دیر تک مراقبے میں رہے۔ زیارت کے بعد کچھ عرصہ روضہ شریف میں ٹھہرے۔ سجادہ نشین صاحب سے ملے اور پھر وہ لاہور کو روانہ ہو گئے اور مَیں انبالے چلا آیا۔ حالت مراقبہ میں اقبال نے کیا دیکھا اور کیا محسوس کیا؟ یہ ایک روحانی سرگزشت ہے جس کو نہ مَیں پوچھ سکتا تھا، نہ شاید اقبال بیان کر سکتے، لیکن اُن کا لاہور سے اتنی دُور چل کر آنا ہی ثابت کرتا ہے کہ اُن کو حضرت مجدد رحمتہ اللہ علیہ سے کس قدر عقیدت تھی۔ بال جبریل میں ایک نظم کا عنوان ہے 'پنجاب کے پیرزادوں سے'۔ اس کے یہ چار شعر ظاہر کرتے ہیں کہ وہ مجدد صاحب کو کیا سمجھتے تھے:

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر

---

* سرہند کا نام استعمال میں بگڑ گیا ہے۔ صحیح نام سہرند تھا۔ عوام اس کو سرہند کہنے لگے، یعنی حرف رکا تلفظ اس طرح کرتے تھے کہ ہ کو اس سے پہلے بولنے کی بجائے اس کے بعد اور اس سے مخلوط کرکے بولتے تھے۔ بالکل اس طرح جس طرح بھی اور تھی میں ہ ب اور ت سے مخلوط ہے۔ بعد کے زمانہ میں اس نام کو لفظ سر اور لفظ ہند سے مرکب سمجھ لیا گیا اور اسی طرح لکھا جانے لگا۔ عوام اب بھی اسی طرح سرہند بولتے ہیں، مگر پرانی عربی تحریروں میں لفظ سہرند صاف لکھا ہوا ہے۔

وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحب اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیِ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

تحریک تبلیغ اور اقبال

ہندوستان میں ہندوؤں کی جانب سے کم از کم ستر سال سے کبھی خفیہ، کبھی علانیہ، کبھی منظم اور جماعتی سازشیں اور کوششیں ہوتی رہی ہیں کہ یہاں کے مسلمانوں کو مرتد کیا جائے۔ اس اجمال کی تفصیل طویل ہے۔ ۱۹۲۳ء کے آغاز میں اسی سلسلہ کی ایک منظم اور علانیہ تحریک شدھی آگرہ، متھرا، بھرت پور، ایٹا وغیرہ اضلاع میں جاری ہوئی اور مسلمانوں نے اس حملہ کی مدافعت کے لیے ان شدھی زدہ علاقوں میں اپنے واعظ اور مبلغ بھیجے۔ اس زمانے میں جو تجربات و مشاہدات ہوئے، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے راقم نے یکم جولائی ۱۹۲۳ء کو بہ مشورہ و امداد بعض اکابر ملت مثل حاجی مولوی سر رحیم بخش مرحوم، مولانا عبدالماجد بدایونی، نواب عبدالوہاب خاں مرحوم ایک مرکزی جمعیت تبلیغ الاسلام قائم کی، جو بفضل تعالیٰ اب تک قائم ہے اور راقم اس وقت سے اب تک اس کا معتمد عمومی ہے۔ چونکہ اقبال کو تبلیغ و اشاعت اسلام کا خاص شوق تھا، وہ ماہ اکتہ ۱۹ ۳ء میں ہماری اس جمعیت کے ممبر

ہو گئے۔

جمعیتہ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کے رجسٹر ہائے مراسلت میں یہ اندراج ہے کہ ۲۰ جنوری ۱۹۲۷ء کو اقبال کا ایک خط میرے نام آیا، جس کا مضمون یہ تھا کہ چند احباب کی تجویز ہے کہ آئندہ سال لاہور میں یورپین مسلمانوں کی ایک کانفرنس [مجلس] کی جائے جس کا خرچ قریباً تیس ہزار روپیہ ہوگا۔ انھوں نے دریافت کیا کہ آیا ہماری جمعیتہ اس میں کچھ مدد کر سکے گی۔ میرے جواب مورخہ ۲۳ جنوری ۱۹۲۷ء کا خلاصہ یہ لکھا ہے کہ یورپین کانفرنس کا ارادہ بہت اچھا ہے لیکن روپے کا انتظام بہت ضروری ہے۔ مناسب ہو کہ کسی بڑے آدمی کو صدر بنایا جائے اور اس سے رقم وصول کی جائے۔ پراپیگنڈہ [تشہیر] آپ کے نام سے مَیں کر لوں گا۔ میرے خط کے جواب میں ۲۴ جنوری کو اقبال نے وہ خط لکھا جو مکاتیب اقبال کے صفحہ ۲۰۷/ ۲۰۸ پر درج ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> آٹھ ہزار روپے جمع کر دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ باقی روپیہ بھی اس غرض کے لیے عام مسلمان دینے کو تیار و جائیں گے اور میں کہتا ہوں کہ رقم مطلوبہ کا بہت بڑا حصہ غالباً لاہور ہی سے جمع کر لوں گا۔ بلکہ میرا ارادہ یہ ہے کہ جب تک رقم مطلوبہ کے وعدے پرائیوٹ طور پر نہ ہو جائیں، اس کانفرنس کے متعلق کوئی اعلان نہ کیا جائے۔ یورپ اور امریکہ سے کم از کم آٹھ دس آدمیوں کو دعوت دی جائے گی۔ باقی جو یورپین مسلمان ہندوستان میں موجود ہیں، ان کی فہرست تیار کی جائے گی۔ آپ فی الحال اس فہرست کی تیاری میں مدد دیں اور اپنے احباب کو خط لکھ کر ان کے مفصل پتے دریافت کریں۔ کم از کم سو یورپین مسلمان اس کانفرنس میں جمع ہو جائیں تو خوب ہو۔ کانفرنس کے اجلاسوں کے لیے ٹکٹ لگانے کا قصد ہے۔ آپ اپنے دوستوں سے کہیں کہ فی الحال یہ خیال کانفیڈنشل [خفیہ] ہے۔ مسٹر پکٹ ہال کو میں نے حیدرآباد خط لکھا تھا۔[۱] ان[۲] کو اس خیال سے نامعلوم کیوں ہمدردی

نہیں! میں انگلستان سے خط و کتابت کر رہا ہوں۔

بعض وجوہ سے اس کانفرنس کی یہ تجویز کبھی عمل میں نہ آ سکی، مگر اسی سال ۱۳ اگست ۱۹۲۷ء کو جمعیتہ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کی جماعت منتظمہ نے یہ تجویز منظور کی کہ ایک آل انڈیا تبلیغ کانفرنس کسی مناسب مقام پر مناسب وقت معین کر کے انگلستان سے الحاج لارڈھیڈلے الفاروق کو مدعو کیا جائے۔ چنانچہ یہ کانفرنس لارڈ موصوف کی صدارت میں ماہ دسمبر ۱۹۲۷ء بمقام دہلی نہایت کامیابی سے منعقد ہوئی اور اقبال کی مجوزہ کانفرنس کا مقصد ایک حد تک اس سے پورا ہو گیا۔

میرے ایجنٹ [نمایندے]

اقبال اپنے مشہور لیکچر دینے کے لیے مدراس جانے والے تھے۔ میں نے ان کو لکھا کہ دوران قیام مدراس میں وہاں کے مسلمانوں کو تبلیغ کی طرف توجہ دلائیں اور جمعیتہ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کی مالی امداد کے لیے آمادہ کریں۔ میرے خط کے جواب میں انھوں نے مجھے ایک خط مورخہ ۵ دسمبر ۱۹۲۸ء کو لکھا جو مکاتیب اقبال کے صفحہ ۲۰۹ /۲۱۱پر درج ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں

> میرے نزدیک تبلیغ اسلام کا کام تمام کاموں پر مقدم ہے۔ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا مقصد سیاسات سے محض آزادی اور اقتصادی بہبودی ہے اور حفاظت اسلام اس مقصد کا عنصر نہیں ہے، جیسا کہ آج کل کے قوم پرستوں کے رویہ سے معلوم ہوتا ہے تو مسلمان اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ یہ بات میں علی وجہ البصیرت کہتا ہوں اور سیاسات حاضرہ کے تھوڑے سے تجربہ کے بعد ہندوستان کے سیاسیات کی روش جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، خود مذہب اسلام کے لیے ایک خطرۂ عظیم ہے اور میرے خیال میں شدھی کا خطرہ اس خطرے کے مقابلے میں کچھ وقعت

نہیں رکھتا ، یا کم از کم یہ بھی شدھی ہی کی ایک غیر محسوس صورت ہے۔ بہر حال جس جانفشانی سے آپ نے تبلیغ کا کام کیا ہے اس کا اجر حضور سرور کائنات [ﷺ] ہی دے سکتے ہیں۔ میں انشاء اللہ جہاں جہاں موقع ملے گا آپ کے ایجنٹ کے طور پر کہنے سننے کو حاضر ہوں، مگر آپ اور مولوی عبدالماجد بدایونی جنوبی ہند کے دورہ کے لیے تیار رہیں۔

مصری وفد

۱۹۳۶ء میں اچھوتوں میں اشاعت اسلام کا ایک خاص موقع پیدا ہوا۔ اچھوتوں کی ایک کانفرنس نے جس کے حاضرین کی تعداد دس ہزار نفوس بیان کی گئی تھی، ایک ریزولیشن [قرارداد] پاس کیا کہ اچھوتوں کو ہندو دھرم چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کرنا چاہیے۔ اس کانفرنس اور ریزولیشن کا غلغلہ تمام ہندوستان میں پھیل گیا۔ ایک جانب تو ہندوؤں نے خاص کوشش کی کہ اچھوتوں کو کسی طرح اس ارادے سے باز رکھا جائے، دوسری جانب مسلمان، عیسائی، سکھ اور بدھ دھرم والے اس کوشش میں مصروف ہو گئے کہ اچھوتوں کو اپنے مذہب کی دعوت دیں۔ اس سلسلہ میں ہماری جمعیتہ نے بھی ڈھائی سال تک بہت کچھ جدوجہد کی، مگر اس کی تفصیل یہاں بیان کرنا مقصود نہیں۔ یہاں صرف یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ اچھوتوں کے ریزولیشن دربارہ تبدیل مذہب کی اطلاع مصر میں بھی پہنچی۔ جامعہ الازہر قاہرہ نے فیصلہ کیا کہ اچھوتوں میں تبلیغ الاسلام کا کام کرنے کے لیے الازہر کے علماء کا ایک وفد ہندوستان بھیجا جائے۔ چونکہ اقبال کے علم و فضل کا شہرہ تمام ممالک اسلامی میں عرصۂ دراز سے پہنچا ہوا تھا، اس لیے الازہر کے شیخ الجامعہ شیخ مصطفیٰ مراغی نے اقبال کو خط لکھ کر ان کو وفد بھیجنے کے ارادہ سے مطلع بھی کیا اور ان کی رائے بھی دریافت کی کہ آیا ایسے وفد کا بھیجنا مناسب اور مفید ہوگا اور اگر اقبال کا جواب اثبات میں ہو تو ارکان وفد کن کن صفات کے

آدمی ہوں۔ یہ بھی دریافت کی کہ آیا علمائے ازہر کی تقریروں کی ترجمانی کے لیے ہندوستان میں آدمی مل جائیں گے، یا وفد اپنے ترجمان ہمراہ لائے۔ اقبال نے شیخ مصطفیٰ مراغی کے اس خط کو اخبار احسان لاہور میں شائع کردیا اور مجھ کو اپنے خط مورخہ یکم جولائی ۱۹۳۶ء میں لکھا:

مجھ سے شیخ صاحب نے مشورہ طلب کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس وفد کے متعلق آپ ضروری ہدایات دیں۔ مہربانی کرکے آپ لکھیں کہ ان کو کیا مشورہ دیا جائے۔ بعض باتیں میرے خیال میں ہیں، مگر میں آپ کی رائے بھی معلوم کرنا چاہتاہوں۔ اس کے علاوہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اس وفد کے ہمراہ ملک کا دورہ بطور پروپیگنڈا سیکرٹری [معتمد تشہیر] کے کریں۔ اس سے بہت اچھے نتائج نکلیں گے اور وفد کو آپ کے معلومات اور مشوروں کے امیال و عواطف [میلانات و جذبات] سے بے حد فائدہ پہنچے گا۔

لیکن اس خط کا جواب نہ لکھنے پایا تھا کہ اقبال نے ۴ جنوری کو اسی موضوع پر مجھ کو دوسرا خط لکھا اور اس میں مجھ سے چند باتیں کرنے کے بعد لکھا۔ ''مصری وفد کی ہر طرح حوصلہ افزائی کرنا چاہیے۔ اس کے نتائج نہایت دور رس ہوں گے، آپ ضرور ان کے ساتھ دورہ کریں۔ یہ واقعہ ہندوستان بلکہ اسلام کی تاریخ میں یادگار ہوگا۔ آپ کا جواب آنے پر شیخ جامعہ ازہر کا اصل خط ارسال کروں گا، تاکہ آپ بھی ان کو ایک علیحدہ خط لکھ سکیں۔ میں اپنے خط میں ان کو لکھ دوں گا کہ وہ آپ کے خط کا انتظار کریں۔''

ان کو تبلیغ اسلام سے اور مسلمانوں کے بین الممالک اشتراک عمل سے اس قدر گہری دلچسپی تھی کہ جب میرا جواب ان کو پہنچ گیا تو انھوں نے ۹ جولائی کو پھر ایک خط لکھا، ان کا اقتباس درج کرتاہوں:

آپ کا خط عین انتظار میں ملا۔ یہ تمام مشکلات میرے ذہن میں تھیں جو آپ نے خط میں لکھی ہیں۔ باوجود ان کے میرا خیال تھا کہ ان کا ہندوستان آنا عام طور پر اعلیٰ ذات کے ہندوؤں پر اور نیز خود مسلمانوں پر اچھا اثر

ڈالے گا۔ان کے آنے سے مسلمانوں کے تبلیغی جوش میں اضافہ ہونا بہت ممکن ہے۔اس واسطے میرا خیال ہے کہ ان کو تمام مشکلات سے آگاہ کر دیا جائے اورجو فوائد ان کے وفد سے ممکن ہیں، ان کا بھی ذکر کر دیا جائے اور فیصلہ ان پر چھوڑ دیا جائے۔

اس کے بعد مجھ کو اقبال کا کوئی اور خط اس سلسلہ میں نہ آیا، مگر یہ قرار پا چکا تھا کہ اقبال شیخ جامعہ الازہر کو میرے بارے میں لکھ دیں گے۔ انھوں نے ضرور لکھا ہوگا۔مَیں نے اقبال کو اطمینان دلایا کہ میں وفد کو ہرامکانی امداد دوں گا۔مَیں نے شیخ جامعہ الازہر کو تار دے کر دریافت کیا کہ وفد کب ہندوستان پہنچے گا۔ابھی مجھ کو اس تار کا کوئی جواب نہ ملا تھا کہ اخبار ایسٹرن ٹائمز لاہور مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۳۶ء میں قاہرہ کا ایک پیغام جس کی نسبت لکھا تھا کہ ہوائی ڈاک سے آیا ہے، شائع ہوا۔اس میں درج تھا کہ علمائے ازہر کا وفد اطالوی جہاز کانٹی راس میں روانہ ہو کر ۱۲ نومبر کو بمبئی پہنچے گا۔بمبئی میں جو ہمارے تبلیغی دوست تھے، ان سے دربارہ وفد مذکور میری مراسلت ہو چکی تھی۔اخبار میں یہ خبر پڑھتے ہی میں نے بمبئی تار دیا اور خود بمبئی پہنچ گیا۔جہاز کانٹی راس ۱۷ نومبر ہی کو آیا۔ہم نے تمام سواروں کو اُترتے دیکھا اور بندرگاہ پر دریافت بھی کیا۔مصری وفد اُس میں نہ تھا۔آخر کار یہ وفد ۱۱ دسمبر ۱۹۳۶ء کو بمبئی جہاز سے اُترا۔احباب بمبئی نے ۹ دسمبر کو مجھ کو تار دیا تھا، وہ ۱۰ دسمبر کو ملا تھا، میں نے بذریعہ تار احباب بمبئی کو مطلع کر دیا تھا کہ میرا پہنچنا ممکن نہیں، آپ وفد کا استقبال کریں۔ان کا پروگرام [پیش نامہ] معلوم کر کے بذریعہ تار اطلاع دیں۔

۱۲ دسمبر کو رئیس وفد نے مجھ کو خط لکھا۔۱۲ نومبر کو وفد کے نہ پہنچنے کے وجوہ لکھتے ہوئے میری تکلیف کا شکریہ لکھا ور یہ لکھا کہ وفد مجھے انبالے میں ملنا چاہتا ہے۔شیخ ازہر کے نام جو تار مَیں نے بھیجا تھا، اس کا

جواب نہ دے سکنے کے لیے معذرت بھی لکھی۔ مَیں نے جواب میں وفد کا خیر مقدم کیا اور لکھا کہ انبالے کی بجائے دہلی میں ملنا زیادہ مناسب ہوگا۔ آخر کار وفد نے بذریعہ تار اطلاع دی کہ وہ ۳۰ دسمبر کو دہلی پہنچ گئے ہیں اور سیسل ہوٹل میں مقیم ہیں۔ میں ۳۱ دسمبر کی شام کو دہلی پہنچا اور یکم جنوری ۱۹۳۷ء کو سیسل ہوٹل میں وفد سے ملا۔ اخباروں سے معلوم ہو چکا تھا کہ اس وفد نے اپنا مقصد ہندوستان کے مسلم ادارات تعلیم کا معائنہ اور مطالعہ اور مسلمانان ہند سے ثقافتی تعلقات قائم کرنا بیان کیا ہے۔

دہلی میں ملاقات ہونے پر معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنے تبلیغی مقصد کو سب سے راز میں رکھا ہے اور اس بارے میں صرف مجھے اور اقبال سے بصیغہ راز مبادلہ خیالات اور اخذ معلومات کریں گے۔ مَیں سیسل ہوٹل میں چار روز تک ارکان وفد سے گفتگو کرتا رہا۔ وفد کے سیکرٹری [معتمد] شیخ محمد حبیب احمد آفندی اور اسسٹنٹ سیکرٹری شیخ صلاح الدین التجار انگریزی دان تھے، رئیس وفد اور باقی دو ارکان وفد عربی میں سوالات کرتے تھے اور جو معلومات ان کو حاصل ہو چکے تھے، ان کو بیان کرتے تھے۔ شیخ حبیب ان کی اور میرے جوابات کی ترجمانی کرتے تھے۔ چار روز کے مسلسل مکالمات کے بعد رئیس وفد نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں وہ تمام واقعات و خیالات جو میں بیان اور ظاہر کر چکا ہوں، انگریزی میں لکھ کر دے دوں۔ چنانچہ میں نے بائیس صفحہ کی ایک ٹائپ شدہ یادداشت مرتب کرکے وفد کو دے دی۔ اندریں اثنا ایک صاحب نے ناگپور سے وفد کو ایک چٹھی لکھی تھی۔ وفد نے چاہا کہ میں اس چٹھی پر بھی ایک تبصرہ لکھ دوں۔ چنانچہ پانچ صفحہ کا ٹائپ شدہ تبصرہ لکھ کر ان کے حوالے کیا گیا۔

دہلی میں مجھے ملنے سے پیشتر یہ وفد بمبئی بھوپال اور آگرہ کا دورہ کر چکا تھا، اس کے بعد علی گڑھ، رام پور، دیوبند اور پشاور کا دورہ کیا۔ میں علی

گڑھ میں ان کے ہمراہ تھا۔ پشاور کے بعد وہ لاہور گئے اور میں بھی وہاں پہنچا۔ اقبال نے ۲۷ جنوری ۱۹۳۷ء کو وفد کے اعزاز میں ایک لنچ دیا۔ اس وقت اقبال کی صحت کچھ عرصہ سے خراب تھی، لنچ ایک ہوٹل میں دیا گیا تھا، میزبان کی حیثیت سے اقبال کا موجود ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ وہ شریک ہوئے۔ اس وقت انھوں نے کہا کہ میں چھ مہینے بعد گھر سے نکلا ہوں، جاوید بھی موجود تھے، لنچ کے بعد ایک گروپ فوٹو [گروھی عکسی تصویر] لیا گیا۔ جاوید اس فوٹو میں بھی ہیں۔ یہ گروپ ایک نہایت یادگار ہے۔

وفد کے مقصد سے متعلق وفد کی اقبال سے باتیں ہوئیں۔ مَیں جو کچھ کر چکا تھا، وہ مَیں نے بیان کیا۔ اقبال نے میرے خیالات سے اتفاق کیا۔ اقبال سے جو خاص مشورہ ہوا۔ اس کی ایک ٹائپ شدہ یاد داشت مرتب کر کے میں نے وفد کو دے دی۔

وفد کے نقل و حرکت اور واپسی سے متعلق ابھی بھی بہت سے واقعات باقی ہیں اور میرے فائل [مسل] میں ان سے متعلق بہت سا مواد ہے۔ مگر یہاں اسی حد تک ان واقعات کا بیان کرنا مقصود تھا، جہاں تک اقبال کا تعلق تھا، وہ واقعات آ چکے اور اقبال نے علالت کے باوجود اس اہم اسلامی کام میں جو دلچسپی لی، وہ ظاہر ہو چکی۔ یہ وفد وسط مارچ ۱۹۳۷ء میں ہندوستان سے واپس ہوا۔ عرصۂ دراز کے بعد جب میں نے ایک شکایتی خط لکھ کر دریافت کیا، تو جون ۱۹۳۸ء میں شیخ حبیب آفندی نے وفد کی عربی رپورٹ کی ایک کاپی مجھ کو بھیجی۔ اس میں میری تجاویز سے وفد نے اتفاق رآئے کیا تھا، مگر اس وقت ازہر کی انتظامی کونسل نے اندریں باب کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد کوئی خبر نہیں آئی۔

تمنائے مدینہ

دنیا میں کون مسلمان ایسا ہوگا جس کو حج بیت اللہ کی آرزو نہ ہو جس کے دل کو مدینہ منورہ کی حاضری کی تمنا بے تاب نہ رکھتی ہو!اور پھر اقبال کے لیے تو یہ بات تصور میں بھی نہیں آ سکتی کہ اس کا دل حضور رسالت مآب ﷺ کے دربار میں حاضر ہونے کے لیے دن رات نہ تڑپتا ہو۔ان کے کلام میں جا بجا اس کے شواہد موجود ہیں۔مثال کے طور پر صرف دو شعر دیکھ لیجیے۔حضور رسالت مآب ﷺ کو وہ کیا سمجھتے تھے۔ملاحظہ کیجیے:

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است[3]

مدینہ منورہ ان کے نزدیک کیا تھا، ملاحظہ ہو:

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

(اسرارِ خودی)

چنانچہ اپنی زندگی کے آخری تین چارسال میں وہ حج بیت اللہ اور زیارت رسول اللہ [ﷺ] کی تجویزیں سوچتے رہے۔سوء اتفاق سے یہی زمانہ اُن کی صحت کی خرابی اور جسمانی کمزوری کا تھا۔اسی عرصہ میں اُن کی اہلیہ محترمہ کا بھی انتقال ہو گیا اور بچوں کی نگہداشت اور تربیت کی ذمہ داری تمام تر اُنھی پر آپڑی۔تاہم وہ اس فکر میں رہے کہ عراق سے ہوتے ہوئے براہ بیت المقدس مدینہ منورہ پہنچیں اور وہاں سے حج کے لیے مکہ معظمہ جائیں۔وہ

3

خود کو مصطفیٰ ﷺ تک پہنچاؤ کہ دین سب وہی ہیں
اگر اِن ﷺ تک نہ پہنچے تو باقی سب بولہبی ہے

نہیں رکھتا، یا کم از کم یہ بھی شدھی ہی کی ایک غیر محسوس صورت ہے۔ بہرحال جس جانفشانی سے آپ نے تبلیغ کا کام کیا ہے اس کا اجر حضور سرور کائنات [ﷺ] ہی دے سکتے ہیں۔ میں انشاء اللہ جہاں جہاں موقع ملے گا آپ کے ایجنٹ کے طور پر کہنے سننے کو حاضر ہوں، مگر آپ اور مولوی عبدالماجد بدایونی جنوبی ہند کے دورہ کے لیے تیار رہیں۔

مصری وفد

۱۹۳۶ء میں اچھوتوں میں اشاعت اسلام کا ایک خاص موقع پیدا ہوا۔ اچھوتوں کی ایک کانفرنس نے جس کے حاضرین کی تعداد دس ہزار نفوس بیان کی گئی تھی، ایک ریزولیشن [قرارداد] پاس کیا کہ اچھوتوں کو ہندو دھرم چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کرنا چاہیے۔ اس کانفرنس اور ریزولیشن کا غلغلہ تمام ہندوستان میں پھیل گیا۔ ایک جانب تو ہندوؤں نے خاص کوشش کی کہ اچھوتوں کو کسی طرح اس ارادے سے باز رکھا جائے، دوسری جانب مسلمان، عیسائی، سکھ اور بدھ دھرم والے اس کوشش میں مصروف ہو گئے کہ اچھوتوں کو اپنے مذہب کی دعوت دیں۔ اس سلسلہ میں ہماری جمعیتہ نے بھی ڈھائی سال تک بہت کچھ جدوجہد کی، مگر اس کی تفصیل یہاں بیان کرنا مقصود نہیں۔ یہاں صرف یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ اچھوتوں کے ریزولیشن دربارہ تبدیل مذہب کی اطلاع مصر میں بھی پہنچی۔ جامعہ الازہر قاہرہ نے فیصلہ کیا کہ اچھوتوں میں تبلیغ الاسلام کا کام کرنے کے لیے الازہر کے علماء کا ایک وفد ہندوستان بھیجا جائے۔ چونکہ اقبال کے علم و فضل کا شہرہ تمام ممالک اسلامی میں عرصۂ دراز سے پہنچا ہوا تھا، اس لیے الازہر کے شیخ الجامعہ شیخ مصطفیٰ مراغی نے اقبال کو خط لکھ کر ان کو وفد بھیجنے کے ارادہ سے مطلع بھی کیا اور ان کی رائے بھی دریافت کی کہ آیا ایسے وفد کا بھیجنا مناسب اور مفید ہوگا اور اگر اقبال کا جواب اثبات میں ہو تو ارکان وفد کن کن صفات کے

آدمی ہوں۔ یہ بھی دریافت کی کہ آیا علمائے ازہر کی تقریروں کی ترجمانی کے لیے ہندوستان میں آدمی مل جائیں گے، یا وفد اپنے ترجمان ہمراہ لائے۔ اقبال نے شیخ مصطفیٰ مراغی کے اس خط کو اخبار احسان لاہور میں شائع کر دیا اور مجھ کو اپنے خط مورخہ یکم جولائی ۱۹۳۶ء میں لکھا:

> مجھ سے شیخ صاحب نے مشورہ طلب کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس وفد کے متعلق آپ ضروری ہدایات دیں۔ مہربانی کر کے آپ لکھیں کہ ان کو کیا مشورہ دیا جائے۔ بعض باتیں میرے خیال میں ہیں، مگر میں آپ کی رائے بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اس وفد کے ہمراہ ملک کا دورہ بطور پروپیگنڈا سیکرٹری [معتمد تشہیر] کے کریں۔ اس سے بہت اچھے نتائج نکلیں گے اور وفد کو آپ کے معلومات اور مشوروں کے امیال و عواطف [میلانات و جذبات] سے بے حد فائدہ پہنچے گا۔

لیکن اس خط کا جواب نہ لکھنے پایا تھا کہ اقبال نے ۴ جنوری کو اسی موضوع پر مجھ کو دوسرا خط لکھا اور اس میں مجھ سے چند باتیں کرنے کے بعد لکھا۔ ''مصری وفد کی ہر طرح حوصلہ افزائی کرنا چاہیے۔ اس کے نتائج نہایت دور رس ہوں گے، آپ ضرور ان کے ساتھ دورہ کریں۔ یہ واقعہ ہندوستان بلکہ اسلام کی تاریخ میں یادگار ہوگا۔ آپ کا جواب آنے پر شیخ جامعہ ازہر کا اصل خط ارسال کروں گا، تاکہ آپ بھی ان کو ایک علیحدہ خط لکھ سکیں۔ میں اپنے خط میں ان کو لکھ دوں گا کہ وہ آپ کے خط کا انتظار کریں۔''

ان کو تبلیغ اسلام سے اور مسلمانوں کے بین الممالک اشتراک عمل سے اس قدر گہری دلچسپی تھی کہ جب میرا جواب ان کو پہنچ گیا تو انھوں نے ۹ جولائی کو پھر ایک خط لکھا، ان کا اقتباس درج کرتا ہوں:

> آپ کا خط عین انتظار میں ملا۔ یہ تمام مشکلات میرے ذہن میں تھیں جو آپ نے خط میں لکھی ہیں۔ باوجود ان کے میرا خیال تھا کہ ان کا ہندوستان آنا عام طور پر اعلیٰ ذات کے ہندوؤں پر اور نیز خود مسلمانوں پر اچھا اثر

ڈالے گا۔ ان کے آنے سے مسلمانوں کے تبلیغی جوش میں اضافہ ہونا بہت ممکن ہے۔ اس واسطے میرا خیال ہے کہ ان کو تمام مشکلات سے آگاہ کر دیا جائے اورجو فوائد ان کے وفد سے ممکن ہیں، ان کا بھی ذکر کر دیا جائے اور فیصلہ ان پر چھوڑ دیا جائے۔

اس کے بعد مجھ کو اقبال کا کوئی اور خط اس سلسلہ میں نہ آیا، مگر یہ قرار پا چکا تھا کہ اقبال شیخ جامعہ الازہر کو میرے بارے میں لکھ دیں گے۔ انھوں نے ضرور لکھا ہوگا۔ مَیں نے اقبال کو اطمینان دلایا کہ میں وفد کو ہر امکانی امداد دوں گا۔ مَیں نے شیخ جامعہ الازہر کو تار دے کر دریافت کیا کہ وفد کب ہندوستان پہنچے گا۔ ابھی مجھ کو اس تار کا کوئی جواب نہ ملا تھا کہ اخبار ایسٹرن ٹائمز لاہور مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۳۶ء میں قاہرہ کا ایک پیغام جس کی نسبت لکھا تھا کہ ہوائی ڈاک سے آیا ہے، شایع ہوا۔ اس میں درج تھا کہ علمائے ازہر کا وفد اطالوی جہاز کانٹی راس میں روانہ ہو کر ۱۲ نومبر کو بمبئی پہنچے گا۔ بمبئی میں جو ہمارے تبلیغی دوست تھے، ان سے دربارہ وفد مذکور میری مراسلت ہو چکی تھی۔ اخبار میں یہ خبر پڑھتے ہی میں نے بمبئی تار دیا اور خود بمبئی پہنچ گیا۔ جہاز کانٹی راس ۱۷ نومبر ہی کو آیا۔ ہم نے تمام سواروں کو اُترتے دیکھا اور بندرگاہ پر دریافت بھی کیا۔ مصری وفد اُس میں نہ تھا۔ آخر کار یہ وفد ۱۱ دسمبر ۱۹۳۶ء کو بمبئی جہاز سے اُترا۔ احباب بمبئی نے ۹ دسمبر کو مجھ کو تار دیا تھا، وہ ۱۰ دسمبر کو ملا تھا، میں نے بذریعہ تار احباب بمبئی کو مطلع کر دیا تھا کہ میرا پہنچنا ممکن نہیں، آپ وفد کا استقبال کریں۔ ان کا پروگرام [پیش نامہ] معلوم کر کے بذریعہ تار اطلاع دیں۔

۱۲ دسمبر کو رئیس وفد نے مجھ کو خط لکھا۔ ۱۲ نومبر کو وفد کے نہ پہنچنے کے وجوہ لکھتے ہوئے میری تکلیف کا شکریہ لکھا ور یہ لکھا کہ وفد مجھے انبالے میں ملنا چاہتا ہے۔ شیخ ازہر کے نام جو تار مَیں نے بھیجا تھا، اس کا

جواب نہ دے سکنے کے لیے معذرت بھی لکھی۔ مَیں نے جواب میں وفد کا خیر مقدم کیا اور لکھا کہ انبالے کی بجائے دہلی میں ملنا زیادہ مناسب ہوگا۔ آخر کار وفد نے بذریعہ تار اطلاع دی کہ وہ ۳۰ دسمبر کو دہلی پہنچ گئے ہیں اور سیسل ہوٹل میں مقیم ہیں۔ میں ۳۱ دسمبر کی شام کو دہلی پہنچا اور یکم جنوری ۱۹۳۷ء کو سیسل ہوٹل میں وفد سے ملا۔ اخباروں سے معلوم ہو چکا تھا کہ اس وفد نے اپنا مقصد ہندوستان کے مسلم ادارات تعلیم کا معائنہ اور مطالعہ اور مسلمانان ہند سے ثقافتی تعلقات قائم کرنا بیان کیا ہے۔

دہلی میں ملاقات ہونے پر معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنے تبلیغی مقصد کو سب سے راز میں رکھا ہے اور اس بارے میں صرف مجھے اور اقبال سے بصیغہ راز مبادلہ خیالات اور اخذ معلومات کریں گے۔ مَیں سیسل ہوٹل میں چار روز تک ارکان وفد سے گفتگو کرتا رہا۔ وفد کے سیکرٹری [معتمد] شیخ محمد حبیب احمد آفندی اور اسسٹنٹ سیکرٹری شیخ صلاح الدین التجار انگریزی دان تھے، رئیس وفد اور باقی دو ارکان وفد عربی میں سوالات کرتے تھے اور جو معلومات ان کو حاصل ہو چکے تھے، ان کو بیان کرتے تھے۔ شیخ حبیب ان کی اور میرے جوابات کی ترجمانی کرتے تھے۔ چار روز کے مسلسل مکالمات کے بعد رئیس وفد نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں وہ تمام واقعات و خیالات جو میں بیان اور ظاہر کر چکا ہوں، انگریزی میں لکھ کر دے دوں۔ چنانچہ میں نے بائیس صفحہ کی ایک ٹائپ شدہ یادداشت مرتب کرکے وفد کو دے دی۔ اندریں اثنا ایک صاحب نے ناگپور سے وفد کو ایک چٹھی لکھی تھی۔ وفد نے چاہا کہ میں اس چھٹی پر بھی ایک تبصرہ لکھ دوں۔ چنانچہ پانچ صفحہ کا ٹائپ شدہ تبصرہ لکھ کر ان کے حوالے کیا گیا۔

دہلی میں مجھے ملنے سے پیشتر یہ وفد بمبئی بھوپال اور آگرہ کا دورہ کر چکا تھا، اس کے بعد علی گڑھ، رام پور، دیوبند اور پشاور کا دورہ کیا۔ میں علی

گڑھ میں ان کے ہمراہ تھا۔ پشاور کے بعد وہ لاہور گئے اور میں بھی وہاں پہنچا۔ اقبال نے ۲۷ جنوری ۱۹۳۷ء کو وفد کے اعزاز میں ایک لنچ دیا۔ اس وقت اقبال کی صحت کچھ عرصہ سے خراب تھی، لنچ ایک ہوٹل میں دیا گیا تھا، میزبان کی حیثیت سے اقبال کا موجود ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ وہ شریک ہوئے۔ اس وقت انھوں نے کہا کہ میں چھ مہینے بعد گھر سے نکلا ہوں، جاوید بھی موجود تھے، لنچ کے بعد ایک گروپ فوٹو [گروھی عکسی تصویر] لیا گیا۔ جاوید اس فوٹو میں بھی ہیں۔ یہ گروپ ایک نہایت یادگار ہے۔

وفد کے مقصد سے متعلق وفد کی اقبال سے باتیں ہوئیں۔ مَیں جو کچھ کر چکا تھا، وہ مَیں نے بیان کیا۔ اقبال نے میرے خیالات سے اتفاق کیا۔ اقبال سے جو خاص مشورہ ہوا۔ اس کی ایک ٹائپ شدہ یاد داشت مرتب کر کے میں نے وفد کو دے دی۔

وفد کے نقل و حرکت اور واپسی سے متعلق ابھی بھی بہت سے واقعات باقی ہیں اور میرے فائل [مسل] میں ان سے متعلق بہت سا مواد ہے۔ مگر یہاں اسی حد تک ان واقعات کا بیان کرنا مقصود تھا، جہاں تک اقبال کا تعلق تھا، وہ واقعات آ چکے اور اقبال نے علالت کے باوجود اس اہم اسلامی کام میں جو دلچسپی لی، وہ ظاہر ہو چکی۔ یہ وفد وسط مارچ ۱۹۳۷ء میں ہندوستان سے واپس ہوا۔ عرصۂ دراز کے بعد جب میں نے ایک شکایتی خط لکھ کر دریافت کیا، تو جون ۱۹۳۸ء میں شیخ حبیب آفندی نے وفد کی عربی رپورٹ کی ایک کاپی مجھ کو بھیجی۔ اس میں میری تجاویز سے وفد نے اتفاق رآئے کیا تھا، مگر اس وقت ازہر کی انتظامی کونسل نے اندریں باب کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد کوئی خبر نہیں آئی۔

تمنائے مدینہ

دنیا میں کون مسلمان ایسا ہوگا جس کو حج بیت اللہ کی آرزو نہ ہو جس کے دل کو مدینہ منورہ کی حاضری کی تمنا بے تاب نہ رکھتی ہو!اور پھر اقبال کے لیے تو یہ بات تصور میں بھی نہیں آ سکتی کہ اس کا دل حضور رسالت مآب ﷺ کے دربار میں حاضر ہونے کے لیے دن رات نہ تڑپتا ہو۔ان کے کلام میں جا بجا اس کے شواہد موجود ہیں۔مثال کے طور پر صرف دو شعر دیکھ لیجیے۔حضور رسالت مآب ﷺ کو وہ کیا سمجھتے تھے۔ملاحظہ کیجیے:

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است[3]

مدینہ منورہ ان کے نزدیک کیا تھا، ملاحظہ ہو:

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

(اسرار خودی)

چنانچہ اپنی زندگی کے آخری تین چار سال میں وہ حج بیت اللہ اور زیارت رسول اللہ [ﷺ] کی تجویزیں سوچتے رہے۔سوء اتفاق سے یہی زمانہ اُن کی صحت کی خرابی اور جسمانی کمزوری کا تھا۔اسی عرصہ میں اُن کی اہلیہ محترمہ کا بھی انتقال ہو گیا اور بچوں کی نگہداشت اور تربیت کی ذمہ داری تمام تر اُنھی پر آپڑی۔تاہم وہ اس فکر میں رہے کہ عراق سے ہوتے ہوئے .براہ بیت المقدس مدینہ منورہ پہنچیں اور وہاں سے حج کے لیے مکہ معظمہ جائیں۔وہ

3

خود کو مصطفیٰ ﷺ تک پہنچاؤ کہ دین سب وہی ہیں
اگر ان ﷺ تک نہ پہنچے تو باقی سب بولہبی ہے

عراق کی زیارت کو بھی بہت اہمیت دیتے تھے، نجف اشرف میں اُن کے لیے بڑی کشش تھی۔ اس کا اندازہ اسرارِ خودی کے ان اشعار سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے 'در شرح اسمائے علی مرتضیٰؓ' کے عنوان سے لکھے ہیں۔ ان کا یہ شعر ظاہر کرتا ہے کہ جناب شیر خدا سے اُن کو خاص طور پر کس قدر عقیدت تھی:

خیرہ نہ کر سکی مجھے تابشِ* دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

انھوں نے مجھے لکھا کہ عراق کے راستہ سے سفر مدینۂ منورہ کے بارے میں معلومات فراہم کروں۔ چنانچہ میں نے بغداد خطوط لکھے اور مولانا سید حسن دین خاموش کو جو اسی زمانہ میں عرب سے براہ عراق واپس آئے تھے، خط لکھا اور جو اطلاعات ہو سکیں، اقبال کو بھیجیں۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ سب لوگ لاری کے سفر کو دشوار بیان کرتے تھے اور اقبال بہت کمزور تھے۔ ۱۹۳۷ء کے موسم سرما میں ایک روز جاوید منزل میں اُن سے ملاقات ہوئی۔ دیر تک صحبت رہی۔ وہ اس وقت بہت کمزور تھے۔ سفر مدینہ کا ذکر بھی رہا۔ کہنے لگے کہ جس قدر تھوڑی سی طاقت مجھ میں باقی رہ گئی ہے مَیں اس کو مدینے کے سفر کے لیے بچا بچا کر رکھ رہا ہوں۔ افسوس کہ ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی اور وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اقبال کا قلبی تعلق حضور سرور کائنات [صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم] کی ذات قدسی صفات سے اس قدر نازک تھا کہ حضورؐ کا ذکر آتے ہی اُن کی حالت دگرگوں ہو جاتی تھی، اگرچہ وہ فوراً ضبط کر لیتے تھے۔ چونکہ میں بارہا اُن کی یہ کیفیت دیکھ

* بالِ جبریل کے مطبوعہ نسخے میں "تابش" کی بجائے جلوۂ دانش "ہے

چکا تھا، اس لیے میں نے ان کے سامنے تو نہیں کہا، مگر خاص خاص لوگوں سے بطور راز ضرور کہا کہ یہ اگر حضور [ﷺ] کے مرقد پاک پر حاضر ہوں گے تو زندہ واپس نہیں آئیں گے، وہیں جاں بحق ہو جائیں گے۔ میرا اندازہ یہی تھا۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔

۲۵

چودھری محمد حسین مرحوم کی ڈائری کے چند اوراق*

[علامہ اقبال سے ملاقاتوں کی تفصیل]

ڈاکٹر ثاقف نفیس[1] (مرتب)

۲۳ر فروری ۱۹۲۴ء

صبح گیارہ بجے کے قریب حاضر ہوا۔ ایک مولوی صاحب ہمہ تن گوش بیٹھے تھے۔ علمائے وقت کی خصوصیات زیرِ بحث تھیں۔ میں بھی چپ چاپ سنتا رہا۔ وہ اٹھ کر روانہ ہو گئے تو فرمایا: معلوم ہے مولوی صاحب سے یہ باتیں شروع کیوں کر ہوئیں؟ میں نے کہا کس طرح؟ کہا: یہ آگے بھی ایک آدھ دفعہ آئے ہیں۔ شرقپور والے مولوی شیر محمد صاحب کے مرید ہیں۔ اب نئی حیثیت میں جلوہ گر ہوئے۔ آکر بیٹھے، پہلے حسبِ معمول مولوی شیر محمد صاحب کی کرامتوں کا ذکر کرتے ہیں اور کرامتیں ہمارے زمانے کے صوفیا و مشائخ کی وہی عام جو ہیں، وہ سب کو معلوم ہیں۔ مرید کہتا ہے کہ میں گیا، سامنے جا کر بیٹھا ہی تھا کہ میرے دل کی سب باتیں تاڑ گئے اور مجھ کو

---

* سہ ماہی اقبال، جلد ۵۶ شمارہ ۴-۱، لاہور، بزمِ اقبال، جنوری-دسمبر ۲۰۰۹ء

[1] مجلّہ اقبال کے گذشتہ شمارے [اپریل تا اکتوبر ۲۰۰۸ء] میں ۱۹ر فروری، ۲۲ر فروری، ۲۵ر فروری، ۲۹ فروری، یکم مارچ اور ۵ مارچ ۱۹۳۴ء کی ملاقاتوں کی تفاصیل درج تھیں۔ اس شمارے میں خان بہادر چودھری محمد حسین کی علامہ اقبال سے ۲۳ر فروری ۱۹۲۴ء اور ۲۴ر فروری ۱۹۲۴ء کی ملاقاتوں کا ذکر ہے۔ آئندہ ممکن ہوا تو اُس ترتیب کو جو چودھری صاحب کی ڈائری میں ہے، مدِنظر رکھا جائے گا۔ [ڈاکٹر ثاقف نفیس]

سنا دیں یا پیر صاحب کو خواب میں یہ کچھ دکھائی دیا یا پیر صاحب نے بددعا کی کہ فلاں شخص اس مرض میں مبتلا ہو گیا یا مر گیا۔ بس کرامتوں کا سرمایہ ہمارے مشائخ کے پاس یہی ہے۔ مولوی صاحب بھی جو جی میں آتا گیا کہتے گئے۔

پھر کہنے لگے کہ چند روز ہوئے شرقپور میں عجیب بات مشہور ہے۔ میں نے کہا: کیا ایک رات کوئی دو بجے کے قریب پاس رہنے والے خدّام بیان کرتے ہیں [کہ] سائیں شیر محمد صاحب کے پاس کوئی بوٹ سوٹ والا نئ وضع کا جینٹلمین [صاحب بہادر] دروازے پر آکر کھڑا ہوا۔ دروازہ اس نے کھٹکھٹایا۔ مولوی صاحب یا سائیں صاحب نے اندر سے کہا: دروازہ اس وقت نہیں کھل سکتا۔ اس شخص نے کہا میں تو فلاں فلاں ہوں، مجھ سے آپ کو کوئی حجاب نہیں ہوسکتا۔ میرے لیے آپ کا دروازہ کیوں بند ہو؟ سائیں صاحب نے نام سن کر جھٹ دروازہ کھول دیا۔ وہ شخص پاس بیٹھ گیا۔ خوب کھل کھل کر باتیں ہوئیں۔ خدام کہتے ہیں [کہ] اس نے بتایا [کہ] میں ملازم ہوں سرکار کا، کہیں خدا جانے کسی نہر کے محکمے میں اور اڑھائی ہزار روپیہ تنخواہ لیتا ہوں۔ خیر کچھ عرصے کے بعد وہ اٹھ کر چلا گیا۔ خدّام نے یہ باتیں صبح لوگوں کو بتائیں اب وہاں چہ مگوئیاں [ہو رہی] ہیں کہ سائیں صاحب کے پاس ایسی بے تکلفی کے ساتھ انگریزی وضع کا کون شخص ایسے وقت میں آیا اور ملا۔ اکثر لوگوں کا وہاں خیال ہے کہ وہ شخص آپ ہیں۔ فرمایا: یہ قصہ سن کر میں خاموش رہا۔ صرف اتنا کہا کہ میں تو وہاں نہیں گیا۔

مولانا نے کہا [کہ] کسی وقت آپ فرصت نکالیں تو شرقپور چلیں۔ میں چپ رہا۔ پھر دور چار باتیں کرنے کے بعد [کہا]: "آپ ارادہ کریں کسی روز، میں آپ کے ہمراہ ہوں، شرقپور چلیں" میں نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔ تین چار دفعہ جو وہ مختلف پیرائے میں تقاضا کر چکا تو میں نے ایک کتاب ہاتھ میں لے لی اور چپ چاپ پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر وہ کہنے لگا: کیوں

ڈاکٹر صاحب پھر آپ نے بتایا نہ، شرقپور آپ کو ضرور تشریف لے جانا چاہیے۔آپ چلنے کو تیار ہیں یا نہیں؟ آخر مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے کہا ''نہیں''۔ یہ ''نہیں'' سن کر وہ کچھ چپ سا رہ گیا۔ میں نے کہا: افسوس ہے کہ آپ نے مجھ کو صاف صاف جواب دینے پر مجبور کردیا ہے۔آپ کے تقاضوں سے گھبرا کر میں نے کتاب پڑھنا شروع کر دی تھی۔اس خیال سے کہ آپ سمجھ جائیں گے۔ میں ان باتوں سے گریز کرتاہوں اوران کا کوئی جواب نہیں دینا چاہتا[تھا]مگر آخر آپ نے مجھے باتوں پرمجبور کر ہی دیا۔ موجودہ علماء و مشائخ کو میں بُرا نہیں کہتا، ممکن ہے ان میں بعض دیانت دار بھی ہوں۔نیک نیتی سے عوام کی رہنمائی پر آمادہ ہوں۔ محض دکان داری نہ کرتے ہوں۔یہی جو [وجہ ہے؟]کہ میں تمام مشائخ کی بلا امتیاز قدرو منزلت کرتاہوں مگر آپ معاف فرمایئے گا۔ان میں کیسے ہی جوہر کیوں نہ ہوں کم از کم ہندوستان میں اس وقت جتنے اس روش کے بزرگ ہیں، ان میں ایک بھی وہ چیز اپنے اندر نہیں رکھتے، جس کی اس وقت کے مسلمانوں کو ضرورت ہے۔ مسلمانوں کے موجودہ امراض کی ان میں سے کسی کے پاس دوا نہیں۔صاحب کرامت ہوں گے، ذکر و شغل میں مستغرق ہوں گے، خوابیں سچی [خواب سچے؟]دیکھتے ہوں گے۔مکاشفات کے مالک ہوں گے، مگرا ن میں ایک چیز وہ نہیں جو موجودہ زمانے میں اسلام [کے لیے؟]کارآمد ہو۔ صحیح اسلام کو سمجھنے، اس کو مسلمانوں تک پہنچانے اور غیر مسلموں کو سمجھانے سے جب یہ لوگ قاصر ہیں تو ہوا کریں ان کی کرامتیں، دیکھا کریں جو خواب یہ دیکھتے ہیں! ہمیں اس سے کیا سرورکار، حالاتِ حاضرہ سے یہ ناآشنا ، موجودہ منازلِ تعلیم و ترقی سے یہ بیگانہ، مسلمانوں کے زوال و انحطاط سے یہ بے پروا، نہ انھیں ماضی کی خبر، نہ حال سے واسطہ، نہ مستقبل کی فکر۔ عرفان میں غرق ہوں، حقیقت میں فنا ہوں کچھ ہوں.... کبھی عوام کے لیے تھا، اب ان کے

لیے بھی ہے جو اپنے [آپ] کو خواص میں شمار کرنے کے مدعی ہیں۔

کہا: یہ باتیں سن کر وہ سرد ہو گیا۔ اب میں نے ذرا اس کو مستی فی [متعجب] کرنا چاہا۔ میں نے کہا: میں اس سے پیشتر مولوی شیر محمد صاحب کو جانتا ہوں۔ وہ جگہ بھی شرقپور میں جانتا ہوں جہاں وہ اقامت گزیں ہیں۔ پھر میں خود شرقپور گیا بھی ایک دفعہ مگر میں ان سے بالکل نہیں اور دانستہ نہیں ملا۔ آخر کچھ بات ہے تو نہیں ملا۔ کہنے لگا: جی ہاں ضرور کوئی نہ کوئی بات ہو گی، میں نے کہا بس پھر اسی سے سمجھ جایئے

سکھوں (اکالیوں) کے متعلق میں نے بتایا کہ ... میں گولی چل گئی۔ سرکاری بیان ہے کہ چودہ مرے، چونتیس زخمی ہوئے۔ یہ سن کر بہت متعجب ہوئے۔ کہا: میں نے ابھی نہ سنا تھا۔ بہت افسوس ہے کہیں پھر مارشل لا کا زمانہ نہ عود کر آئے۔ ہندوستان کو ابھی خدا جانے کن مراحل سے گزرنا ہے۔ پھر کہیں امن کی زندگی نصیب ہو۔

اردو نظمیں کچھ سنائیں۔ اصلاح و تنظیم کا کچھ کام ہوا۔ اردو کلام میں ایک نظم شروع زمانے کی ہے جس کا عنوان "تنہائی" ہے۔ اس عنوان کی ایک فارسی نظم پیام مشرق کے دوسرے ایڈیشن میں شایع ہو رہی ہے۔

به بحر رفتم و گفتم به موج بیتابے۔۔۔الخ[2]، [3]

---

2 نظم کا آخری بند ہے:

شدم بحضرت یزداں، گذشتم از مہ و
مہر
کہ در جہانِ تو یک ذرہ آشنایم نیست
جہاں تہی ز دل و مشتِ خاکِ من ہمہ

[کلیات فارسی: ص 272]

اردو والی نظم (افسوس کہ اس وقت میرے سامنے نہیں، شعر بھول گیا ہوں)[4] کے اخیر میں تھا کہ اگرچہ دنیا میں کوئی مرا ہمزادولی نہیں تاہم بزم کائنات مجھے تسکین دیتی ہے اور میرے دل کو اس سے سکون میسر ہے۔ فارسی نظم کے متعلق خود ہی بتا چکے تھے کہ اس میں اصل خیال یہ ہے جس کو ورک آؤٹ [پھیلا کر بیان] کیا گیا ہے:

There is no respone to the human mind in the whole universe. Human mind is unique or… in this respect God respects it the degree of a smile.[5]

دل

چمن خوش است ولے درخورِ نوایم نیست
تبسمے بہ لب او رسید و ہیچ نگفت

[کلیات فارسی، ص ۲۷۳]

مہر و مہ سے میں گزر کر گیا یزداں کے حضور
کہا میرا کوئی ہمراز نہیں دنیا میں
ہے جہاں دل سے تہی، خاک مری ہے ہمہ دل
اجنبی میری نوا ہے چمن زیبا میں
اک ذرا اس نے تبسم کیا اور کچھ نہ کہا

[صدیقی، ص ۶۴۵]

3 . موج بیتاب سے میں نے کہا قلزم کے پاس

[صدیقی، ص ۶۴۴]

4 اُردو نظم "تنہائی" کا آخری شعر:

کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل!
قدرت تری ہم نفس ہے اے دل!

(کلیاتِ اقبال اُردو، ص ۱۵۵)

5 ساری کائنات سے ذہنِ انسانی کو کوئی جواب نہیں ملتا۔ انسانی ذہن منفرد چیز ہے یا۔۔۔اس لحاظ سے خدا بھی اسے

میں نے کہا کہ کبھی وہ وقت آپ کی زندگی میں تھا جب ''بزم کائنات'' ویسا کر سکتی تھی۔ آپ کے دل کے لیے اس کے پاس کوئی رس پونس [جواب] [تھا؟]۔ اب آج وقت بھی کہ خود خدا بھی کما حقہ، رس پونس نہیں کرتا۔ کہا: نہیں تبسم کی حد تک تو کرتا ہی ہے اور خدا سے مراد یہاں حقیقتِ فطرت یا روح بزم کائنات ہی ہے۔ مادی نقطہ نظر سے تو کوئی رس پونس نہیں، فارسی کی نظم میں پہلے یہی بات ثابت کی گئی ہے کہ مادی مظاہرِ کائنات ہم سخن ہونے سے عاجز ہیں مگر روح حیاتِ عالمگیر انسانی روح سے رابطہ رکھتی ہے، اگرچہ وہ رابطہ تبسم ہی کی حد تک ہے اب تک۔ اپنے بیرون پر نظر ڈالو تو کوئی چیز دنیا کی تمھارے دل کی ہمزاد نہیں۔ اپنے اندروں نگہ کرو تو کوئی ہستی محرم ہوتی نظر آتی ہے۔ یہی فرق ہے سائنس اور فلسفے یا مذہب میں:

To seek reality in external thing in science is to seek it from with in the human mind is philosophy or religion.[6]

میں نے کہا: میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس وقت جب اردو میں یہ نظم ''تنہائی'' لکھی تھی تو آپ کے قلب کا ارتقا اس درجہ پر تھا کہ بزم کائنات آپ کو ہمزاد محرم نظر آتی تھی۔ اب آپ کے قلبی ارتقا کی یہ حالت ہے کہ (یہاں تک ہی کہنے پایا تھا کہ مشفقانہ جھڑکی کے لہجے میں کہا: بس آگے چلو، پڑھو اب، پھر یہ منازل اور ارتقا دیکھ لینا)۔

''فریاد امت'' کو کتاب میں درج کرنے پر کئی دفعہ زور دے چکا تھا۔

ایک گریزاں مسکراہٹ سے نوازتا ہے۔ [مترجم: محمد سہیل عمر]

تلاش حقیقت اگر خارجی اشیاء میں ہو تو سائنس اور اگر ذہن انسانی کے اندر تلاش کی جائے تو اسے فلسفہ، مذہب کہیں گے۔

[مترجم: محمد سہیل عمر]

کہا: اس میں ہے کچھ نہیں ، محض سن ٹی مینٹل [جذباتی] ہے، شعریت نہیں۔ کوئی مضمون نہیں کہ ان اشعار کو اس انتخاب میں داخل کیا جائے۔ اچھا لاؤ میں دیکھتا ہوں۔ بس کہا کہ یہ ایک بند ہے ''قصہ دارو رسن بازی نہ دل۔۔۔الخ۔'' اس کو چاہو تو ''دل'' کا عنوان دے کر درج کرلو پھر اس میں سے بھی دو شعر کاٹ دیے۔ اگلے ایک بند میں، میں نے یہ شعر ''یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے — لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا'' پڑھ کر میں نے کہا [کہ] شوکت علی تو سنا ہے کہتے ہیں [کہ] یہ شعر پڑھ کر مسلمان ہوا اور آپ اسے کاٹ رہے ہیں۔ فرمایا: یہ شعر اچھا ہے اور ایک دو ہوں گے۔ باقی کچھ نہیں۔

۲۳؍فروری ۱۹۲۴ء [شام]

شام کو پہنچا استاذی مولوی محمد شفیع صاحب، ایم۔ اے یونیورسٹی پروفیسر تشریف رکھتے تھے۔ ٹیکسٹ بک کمپنی کے جلسے سے آئے تھے...[؟] کو مولوی صاحب ساتھ آتے ہوں گے۔ ایم۔اے فارسی امتحان کے دو امید وار بھی آ بیٹھے۔ مولوی صاحب سے اویس قرنی کے متعلق گفتگو رہی۔ وہ بتاتے رہے کہ فلاں کتاب میں اس کے متعلق یوں لکھا ہے فلاں میں یوں۔ ان سے کہا کہ آپ یہ تمام حوالے جمع کریں اور میرا خیال ہے کہ ایک مستقل مضمون اس پر لکھ کر شائع کریں۔ انھوں نے [کہا :] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام [دائرہ معارف اسلام] والے غالباً اس پر مفصل لکھیں گے۔ ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔ مولوی صاحب تشریف لے گئے۔ وہ لڑکے بیٹھے متمنی ہوئے کہ آپ ہمیں غالب وغیرہ پر کچھ لیکچر [درس] دیں اور سنا ہے کہ آپ آگے بھی امیدواروں کو لیکچر دیا کرتے ہیں۔ فرمایا: یہ خبر غلط ہے آپ کو اپنے پروفیسر سے لیکچروں کے لیے کہنا چاہیے تھا۔ میرے پاس کوئی وقت نہیں۔ پھر باتوں

میں کہا:

Should I get time I would write a book on Ghalib as philosopher and religious teacher.[7]

پھر کہا ریلیجیئس ٹیچر [مذہبی استاد] تو وہ مقابلتاً کم تھا۔ اس کی فلاسفی [فلسفہ] پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ لڑکے بولے کہ فارسی دیوان غالب پر آج تک بہت کم کام ہوا ہے۔ میم و نون دو ردیفوں کی غزلیں ہمارے کورس میں ہیں، وہ تو کوئی ایسی غزلیں نہیں کہ ان سے غالب کے متعلق ایسی اہم باتیں معلوم ہوں۔ میں بولا کہ میم اور نون کی ردیفوں میں تو بعض بڑی اہم غزلیں ہیں غالب کی۔ فرمانے لگے: ہاں! یہ ردیفیں میں نے ہی کورس میں رکھی تھیں اور اس لیے کہ ان میں بعض غزلیں خاص طور پر اہم ہیں۔ سلسلہ کلام یہیں تک [پہنچا] تھا کہ لڑکے رخصت طلب ہوئے اور چلتے بنے۔ مجھے کہا کہ تم نے غالب پر کچھ لکھنا شروع کیا تھا، کہاں تک ہوا میں نے کہا دیکھیے کچھ کر ہی رہا ہوں۔ اٹھ کر اندر آئے۔ آتے ہی کہا: مولوی محمد شفیع [نے] منوہر لعل کے لیکچر کے متعلق بڑی دلچسپ بات سنائی ہے۔ میں نے کہا تو فرمایا: لیکچر تو وہ بتاتے ہیں یونہی سا تھا انگریزی ''اسرارِ خودی '' کے انٹروڈکشن [تعارف] ہی سے باتیں ہوئی تھیں، بعض اقتباسات تھے کہیں کہیں کوئی شعر بھی نقل کر دیا ہوا تھا۔ جو دلچسپ بات تھی وہ اس لیکچر کے بعد مسٹر بوس (پرنسپل مشن کالج) کے ریمارک [آراء] تھے۔ اس نے کہا کہ اسرارِ خودی (انگریزی ترجمہ) میں نے بھی پڑھی ہے۔ اس کے مطالعے کے بعد میرا تو یہ خیال ہوا کہ اس کا مصنف خدا پر ایمان نہیں رکھتا۔ یہ کہ کر بہت ہنسے، کہا' لوگ کب اس کتاب کو سمجھیں گے۔ اس غریب کو میں نے یہ لکھا ہے کہ

7- مجھے وقت مل جائے تو غالب بطور فلسفی اور معلم دین کے موضوع پر کتاب لکھوں۔ [مترجم: محمد سہیل عمر]

[انسان صفات خداوندی کا تخلق کر سکتا ہے] Man can assimilate God پڑھ کر دھوکا ہوا ہوگا۔ یہ تخلقوا بہ اخلاق اللہ کا ترجمہ ہے اور اسی مضمون کی تشریح کے ساتھ میں نے مثنوی میں ڈویلپ [پھیلا کر بیان] کیا ہے مگر یہ آئیڈیل آسیملیشن[آدرشی خیال] کی اسیملیشن [مشابہت] ہے۔ انسان خدائی صفات کو اپنے اندر جذب کرے اور اپنی شخصیت کو محکم کرے۔ ھائیسٹ ان ڈی وی یولز:[اعلیٰ ترین فرد] کے ایٹری بیوٹز [صفات] عام انڈی وی یولز [افراد] کو اپنے اندر جذب کرنے چاہئیں اور خدا کے متعلق میرا یہ عقیدہ اسلام کا آرتھوڈکس [مستند] عقیدہ ہے۔ معتزلہ میرے خیالات کو سن کر میرے مخالف ہوں گے اور مجھے اشعری کہیں گے۔ میرا عقیدہ بالکل امام حنبلؒ کا عقیدہ ہے۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہا: اچھا پھر کچھ نظمیں پڑھ لو۔ ''فلسفہ غم '' پر آئے تو کہا: موجودہ نظام دکن کو یہ نظم زبانی یاد ہے، اس کو عام پڑھتے ہیں۔

''ایک حاجی مدینے کے راستے میں'' جب یہ نظم پڑھتے ہوئے اس مصرعے پر آیا

''ہائے یثرب'' دل میں لب پر نعرہ توحید تھا

فرمایا: یہ ہے (نا) خاص پچ [ہنر] شعر کے اندر جسے بہت کم لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ دل کے اندر تو ''ہائے یثرب'' اور لب پر کلمہ توحید۔ حالت قلب کی یہ ہونی چاہیے۔ اصل اسلام یہی ہے۔ عشق دل کی گہرائیوں میں موجزن ہو مگر لب سے جو کچھ نکلے وہ لا الہ الا اللہ ہی ہو۔

"فلسفہ غم" پڑھتے آخری بند سے پہلے بند جہاں فلسفہ موت بیان کیا ہے کہ زندگی میں انڈی ویزلیولیٹیز [کثرت افراد] کے قائم ہونے کا مسئلہ اس ندی کی مثال سے خوب واضح ہوگیا ہے۔ یونٹی [وحدت] سے انڈی ویزلیولیٹیز کس طرح بنتی ہیں اور پھر یونٹی کس طرح ہوجاتی ہے۔ ندی کے آبشار بن کر پھر ندی بن جانے سے اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا ہے۔

کہا: پیام مشرق میں نظم "پیام" میں بھی اس مضمون کو ادا کیا گیا ہے۔ میں نے کہا: ہاں غالباً "والدہ مرحومہ کی یاد میں" بھی۔ فرمایا: غالباً وہاں بھی ہوگا، پھر کہا: تمھیں بتاؤں عام طور پر انسانی مائینڈ کی ڈویلپمنٹ [ترقی] چالیس سال تک ہوتی ہے پھر میچور [بالغ] ہو جاتا ہے۔

But my mind is still developing. I don't know what new stage it will arrive and what new ideas it will originate and reveal.[8]

(اقبال کی عمر غالباً پچاس سال سے اس وقت ایک دو سال اوپر ہی ہوگی)

پڑھتے پڑھتے آج پھر یار لوگوں کا منہ سے "زُبان" (بہ ضمہ ز) ہی نکلا، کہا: خدا کے لیے زبان کہو۔ میں نے کہا: لغت میں زُبان ہے زُبان۔ کہا: لغت میں زُبان بھی ٹھیک ہوگا۔ مگر مجھے زُبان کہنا اچھا نہیں لگتا۔ میرا کان نہیں چاہتا کہ زبان ضمّہ سے ہو تم زبان کہا کرو۔ آمنا و صدقنا!

۲۴ ؍فروری ۱۹۲۴ء

نظموں کا پڑھنا ختم کر چکے تو کتاب کی فروخت (اُردو کلام) کے متعلق ذکر ہوا۔ میں نے کہا ایک اور صاحب بھی آپ سے اُردو کلام خریدنا چاہتے

---

[8] مگر میرا ذہن تو ہنوز نشوونما میں ہے۔ مجھے نہیں پتا کہ اس کی ترقی کا اگلا مرحلہ کیا ہو گا اور اس میں کون سے نئے تصورات ابھریں گے، اور کون سے نئے خیالات ظاہر ہوں گے۔ [مترجم: محمد سہیل عمر]

ہیں۔ فرمایا: کون؟ پہلے تو میں نے ٹالنا چاہا۔ آخر یہ سمجھ کر ان کی کیورسٹی [تجسّس] زیادہ نہ ہو۔ نام بتا دیامالہ اور ما علیہ پر بہت باتیں ہوئیں۔ کہنے لگے: میں تو یہ چاہتا ہوں کہ مجھ سے یک مشت کتابیں خرید لی جائیں، روپیہ پیشگی دے دیا جائے، کمیشن [حقِ خدمت] معقول دینے کو تیار ہوں۔ میں حسابات نہیں رکھ سکتا نہ اقساط کا جھگڑا کر سکتاہوں، یہ درست ہے کہ تجارت، تجارت ہے۔ اس میں انسان کو صاف گو ہونا چاہیے مگر یہ جولوگ کہتے ہیں کہ ، بزنس از بزنس [کاروبار کاروبار ہے] میں اس کا مفہوم یہ سمجھتا ہوں کہ انسان خود غرضی کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے بے باکی سے لحاظ اور حیا کو خیر باد کہہ دے۔ حسابات کے جھگڑے سے مجھے وحشت ہے۔ ادھر دوستانہ تعلقات سے مجبوری ہوتی ہے۔ ادھر ضروریات ہوتی ہیں کہ روپے سے انسان کو بے نیاز نہیں ہونے دیتیں۔ سو میں توے صورتیں ایسی ہوں گی جن میں مَیں ہاتھ سے دے کر مانگنے سے عاجز ہوتا ہوں۔ اوّل تو میں نے اصول یہ ٹھہرا رکھا ہے کہ نہ قرض دوں اور نہ لوں مگر آخر دنیاوی تعلقات مجبور کر دیتے ہیں۔ نہ دینا بھی خطرناک ہے۔ بارہا اس نہ میں جو خطرہ ہے میرے دل کو دکھ پہنچاتا ہے "نہ دینے" پہ جب میں اپنی طبیعت کولگاتا ہوں تو سوچتاہوں کہ کہیں میں "بندہ زر" تو نہیں ہو رہا۔ سلیو ٹو منی [دولت کا غلام] بن جانا فطرت کو تباہ کر سکتا ہے۔ ہونا تو منی [دولت] کا لارڈ [آقا] چاہیے۔ بس دینے لینے کے جھگڑے میں میری طبیعت کو اس قسم کے خیالات بہت ستاتے ہیں۔ اتنی بھی توفیق نہیں کہ اچھی خاصی رقوم ہاتھ سے دے کر آدمی بالکل ہی بھول جائے۔ دو ایک واقعات سنائے، جن سے اس قسم کا تلخ تجربہ ہواتھا۔ افسوس کہ یہاں بیان نہیں ہو سکتا۔ میں نے عرض کی یہ باتیں میں خوب سمجھ رہا ہوں۔ اس امر میں مَیں بہت مظلوم ہوں۔ فرمایا: ہاں یہ سچ ہوگا۔ بس اس بنا پر میں کہتاہوں کہ جو شخص بھی مجھ سے کتاب خریدے، یک

مشت مجھے رقم دے دے اور حساب وغیرہ نہ رکھے، میں کروں گا بھی اسی طرح ورنہ کمیشن پر بیچنے کو دے دوں گا۔

۲۶

اشاریہ

آ

ب

پ

ج

ت

ث

ح

چ

ع

غ

ق

ک

ف

گ

ل

م

ی

تحریک اور تاریخ پاکستان ، بین الاقوامی تعلقات اور سیاسیاتِ پاکستان پر ڈاکٹر ندیم شفیق ملک کے 70 سے زیادہ تحقیقی مقالات طبع ہو چکے ہیں۔ ان کی کتب اقبال اینڈ دی انگلش پریس آف پاکستان ، دی پالیٹکس آف اپوزیشن ان پاکستان، ریسرچ پیپرز اون پاکستان، دی پولیٹکل سیگیسٹی آف اقبال ، دی آل انڈیا مسلم لیگ : ۱۹۰۶۔۱۹۴۷، علامہ اقبال کا خطبہ الہ آباد، ۱۹۳۰ء : ایک مطالعہ، دی فارمیٹور ئیرز آف آل انڈیا مسلم لیگ ۱۹۰۶۔۱۹۱۹ء، آل انڈیا مسلم لیگ اینڈ علامہ اقبال الہ آباد ایڈریس: ۱۹۳۰، علامہ اقبال کا خطبہ الہٰ آباد: ۱۹۳۰ء ، صدائے بام دنیا: وخی زبان' ادب و معاشرت پر ایک نظر، اے سوشولینگوسٹک اسٹڈی آف وخی لینگویج آف نادرن پاکستان اور علامہ اقبال اینڈ انگلش نیوز پیپرز آف پاکستان: ۱۹۴۷۔۱۹۵۸ شائع ہو کر قارئین سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔



حال ہی میں ایک تقریب کے دوران مجھ سے سوال کیا گیا تھا کہ اقبال کے افکار پر تو بے شمار کتابیں آ چکی ہیں مگر آپ نے ان کی نجی زندگی اور دوسرے بہت سے اہم واقعات کو کتابی شکل میں شائع کروانے کی طرف توجہ نہیں دی جب کہ لوگ ان واقعات سے بھی بھرپور استفادہ کر سکتے تھے کہ نجی محافل میں ہونے والی علامہ صاحب کی گفتگو میں بھی یقیناً علم و دانش کے بے شمار موتی پنہاں ہوں گے۔

میں نے جواب دیا تھا کہ میری خواہش تھی کہ علامہ صاحب کی یادداشتوں کے حوالے سے کوئی ایسی کتاب ضرور چھپنی چاہیے۔

مجھے خوشی ہے کہ میری اس خواہش کے احترام میں ڈاکٹر ندیم شفیق نے ایک ایسی کتاب مرتب کر دی ہے جس میں نامور اہلِ قلم کی علامہ اقبالؒ سے مختلف ملاقاتوں کے دوران ہونے والی گفتگو، اہم واقعات اور یادداشتوں کو ضبطِ تحریر میں لا کر زینتِ قرطاس کیا گیا ہے۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن اور اس کے ایم ڈی ڈاکٹر انعام الحق جاوید بھی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ یہ کتاب شائع کر رہے ہیں۔ اقبال شناسوں اور علامہ اقبال پر تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ دستاویز یقیناً خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال

Price: Rs. 220/-